سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا

(اقبال علیہ الرحمہ)

ہندنامہ
نواب لطف الدولہ اورینٹل ریسرچ انسٹیٹیوٹ
میں مرتب ہوا

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا

(اقبال علیہ الرحمہ)

ہندنامہ
نواب لطف الدولہ اورینٹل ریسرچ انسٹیٹیوٹ
میں مرتب ہوا

پیش کنندگان

سوامی رامانند تیرتھ — بی رام کشن راؤ — پنڈت جی راماچاری

نواب ہوش یار جنگ — ابو الحسن سید علی — نواب محمود یار جنگ

شریمتی پریم لتا گپتا — شریمتی. ڈی برکت رائے — بیگم امیر حسن

جناردہن راؤ دیسائی — میر اکبر علیخاں بیرسٹر — ڈاکٹر جی یس ملکوٹے

کاشی ناتھ راؤ ویدیہ — یم. نرسنگ راؤ — منظور احمد خاں

سید دلدار حسین — سید احمد اللہ قادری
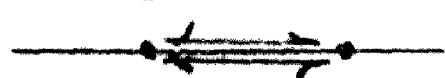
(۱) شری، سی، راجگوپال آچاری۔ گورنر جنرل ہند

(۲) پنڈت جواہر لال نہرو۔ وزیر اعظم ہند

(۳) سردار ولبھ بھائی پٹیل۔ نائب وزیر اعظم ہند

(۴) مولانا ابو الکلام آزاد۔ وزیر تعلیم حکومت ہند

(۵) ڈاکٹر راجندر پرشاد۔ صدر مجلس دستور ساز

پیشِ نامہ

خدا کی راہ میں ملک عرب کی اسمٰعیلی قربانی، عجم کا نوروزی جشن، دنیائے عیسائیت میں کرسمس کی آدھی راتیں، اور بھارت ورش میں رام لیلا یہ ممتاز قوموں کی ایسی یادگاریں ہیں اور اپنے خصوصیات کے لحاظ سے تاریخ کے ایسے ناقابل فراموش واقعات ہیں جن کے جشن مختلف طریقوں سے اور اپنے اپنے وقتوں پر منائے جاتے ہیں، کوئی یادگار غم والم کے جذبات اُبھارتی ہے اور کوئی عیش وطرب کی نوید لاتی ہے۔

ویسے تو رام لیلا میں راون کو جلتا ہوا دیکھکر سب خوشیاں مناتے ہیں مگر سری رامچندر جی کی بن باسی زحمتوں سے دھرم کے ایسے سبق ملتے ہیں اور کردار پر ایسی جلا ہوتی ہے اور کرشن کنھیا کی جنم اشٹمی میں مہا بھارت کے معرکہ کارزار کی اس طرح تصویر آنکھوں میں پھر جاتی ہے کہ جیسے یہ تاریخی حقیقتیں مجسم ہو کر سامنے آگئی ہیں، کلائیوں میں راکھیاں بندھوا کر بہنوں کی محبت کو اُجاگر کیا جاتا ہے اور ماضی کے واقعات کو تازہ کر کے اپنی قومی زندگی کا ثبوت دیا جاتا ہے۔

ایک ہزار سال کے بعد ہندوستانیوں کی قسمت جاگتی ہے اور اُنکو ماضی کی یادگاروں کے علاوہ ایک ایسی یادگار بھی ہاتھ آجاتی ہے جو ہندیوں کو نئی زندگی عطا کر دیتی ہے اور اُس آزادی سے بغلگیر ہونے کا وقت آجاتا ہے جس کو شری گنگا دھر تلک کی زحمتوں نے روشناس کرایا، مسٹر گوکھلے کی سیاسی کاوشوں نے نمایاں کیا اور باپو جی

کی عملی سیاست نے تو اس پر اپنی زندگی تک قربان کر دی۔

۱۵۔اگسٹ ۱۹۴۷ء کی تاریخ وہ تاریخ ہے اور اس کی آدھی رات وہ کیف آور رات ہے جس نے ہند کو غیروں کے پنجوں سے چھڑایا، جس نے ہندیوں کو غلامی کی ذلت سے بچایا اور جس نے لیڈروں کو قید فرنگ سے نکلوایا، جس کی مسرت میں دُنیائے ہندستان مختلف طریقوں سے خوشیوں کا اظہار کرتی رہیگی مگر حیدرآبادی ایک ایسا قلمی تحفہ پیش کر رہے ہیں جس کے آئینہ میں ہند کے اصلی خط و خال نظر آئیں گے، جس کے چہرے مہرے میں ہند کے ایسے خصوصیات دکھائی دینگے جس کو آزادی کے علمبردار شوق کی نگاہوں سے دیکھیں گے اور اپنے کتب خانوں میں محفوظ رکھیں گے۔

اس دماغی تحفہ کو اُن کے سامنے پیش کرنیکی مسرت حاصل کی جارہی ہے جن کی کوششوں نے ہندستان کو اِس مرتبہ پر پہنچایا، اب دعا ہے تو یہ ہے کہ ہندستان کے یہ پانچ سپوت (۱) مسٹر سی راجگوپال آچاری گورنر جنرل ہند

(۲) پنڈت جواہرلال نہرو وزیر اعظم ہند

(۳) سردار ولبھ بھائی پٹیل نائب وزیر اعظم ہند

(۴) مولانا ابوالکلام آزاد وزیر تعلیم حکومت ہند

(۵) ڈاکٹر راجندر پرشاد صدر مجلس دستور ساز

تادیر سلامت رہیں اور ہندستان کی آزادی کو پروان چڑھائیں، اُس کی عمر دراز کریں اور اُس کی بنیادوں کو اپنی سیاست سے ایسا مضبوط بنادیں جن کو ارضی و سماوی حوادث کے جھوکے کسی وقت بھی جنبش نہ دے سکیں۔

جے ہند

مرتب ہند نامہ سید احمد اللہ قادری کے نام

راشٹرپتی ڈاکٹر پٹا بھی سیتارامیا، پریزیڈنٹ آل انڈیا کانگریس کمیٹی

آزادی کی سالگرہیں سال بہ سال شان و شوکت اور کر و فر کے ساتھ منائی جائیں گی۔ ظاہر ہے کہ فطری طور پر ہر یادگار کتاب میں سوراج کے مسائل سے متعلق علمی بحثیں اور مقالے ہوں گے۔ مجھے یقین کامل ہے کہ اس موقع پر شائع ہونیوالی تمام کتابوں میں آپ کی کتاب اپنے اعلیٰ مقصد کو پورا کرنے میں کامیاب ہوگی۔

کیمپ مدراس

۶/جولائی ۱۹۴۹ء

B. Pattabhi Sitaramayya

ہز اکسلنسی مسٹر آصف علی، گورنر اڑیسہ

آزادی کا حاصل کرنا مشکل تھا لیکن اندرونی بے اعتنائی یا تخریبی رجحانات اور بیرونی حالات کے پیش نظر اس کو برقرار رکھنا مشکل تر ہے۔ گزشتہ دو برسوں میں گویا صدیاں ہوگئیں۔ لیکن صدیوں خطرہ ہی رہے گا اگر ہم خطرات سے فوراً آگاہ ہو کر متصادم عناصر کو متحد کر کے ایک پائدار معاشی تعمیر کے لئے تخلیقی اور انفرادی طور پر کوشش نہ کریں۔

A. Asaf Ali

۱۱/ جولائی سنہ ۱۹۴۹ء

ہز اکسلنسی مسٹر شری پرکاشا، گورنر آسام

مجھے یہ معلوم کر کے مسرت ہوئی کہ محبان حیدرآباد ہماری آزادی کی دوسری سالگرہ کی یادگار میں "ہندنامہ" شائع کر رہے ہیں۔ میں اس کوشش کی ہر کامیابی کا متمنی ہوں میری دعا ہے کہ اس کے ذریعہ ہماری سوسائٹی کے تمام عناصر سچی برادری کے بندھنوں میں بندھ جائیں۔ تاکہ ذات پات، مذہب، نسل یا صوبہ کے تمام اختلافات مٹ جائیں اور ملک اور دنیا کی خدمت کیلئے ہم ایک قوم کی حیثیت سے کھڑے ہو جائیں۔

۱۶/ جولائی سنہ ۱۹۴۹ء

Sri Prakasa

آنریبل مسٹر بی۔ جی۔ کھیر، وزیر اعظم بمبئی

ہندوستان کی آزادی کی دوسری سالگرہ منانے کے لئے حیدرآباد میں ہندنامہ کی تیاری کا خیال حقیقت میں بہت مسرت آمیز ہے۔ ہندوستان نے جو آزادی حاصل کی ہے اس کا پہلا اور غالباً سب سے اہم نتیجہ یہ ہوا کہ سارا ہندوستانی علاقہ ایک ہوگیا اور سارے ملک میں ایک ہی قسم کی جمہوری اور باضابطہ حکومت قائم ہوگئی۔ بدقسمتی سے ایسے لوگ موجود تھے جن کا یہ خیال تھا کہ حیدرآباد کے باشندے اس بڑے قومی نصب العین کے ارتقاء میں حصہ لینے کیلئے تیار نہیں ہیں۔ یہ نظریہ اب غلط ثابت ہو چکا ہے۔ ہندنامہ کی طرح کی کوششیں ہندوستان کی از سر نو وحدت کے ارتقاء پر توثیق کی مہر لگادیتی ہیں حیدرآباد کی حب وطن کے از خود اظہار کی حیثیت سے میں اس کا خیر مقدم کرتا ہوں۔

بمبئی

۴؍جولائی ۱۹۴۹ء

B G Kher

شری بی۔ رام کشن راو

سوامی راما نند تیرتھ
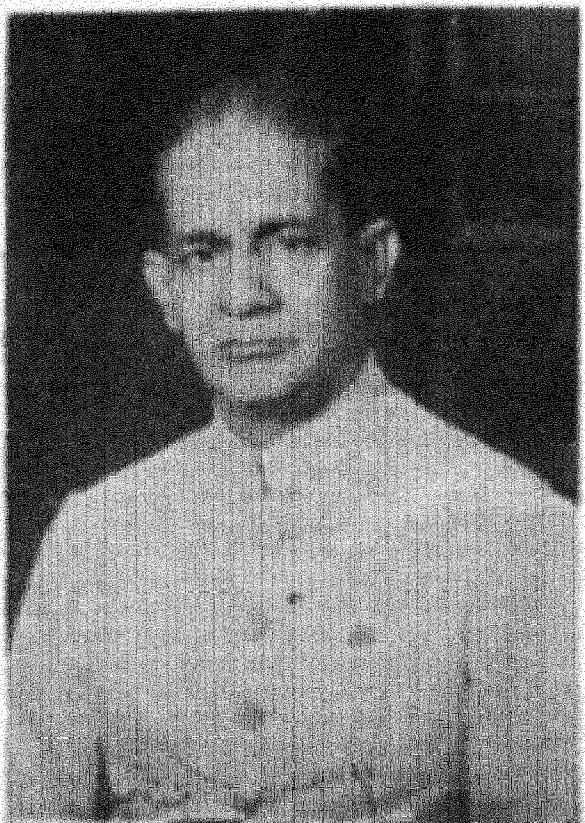
نواب میر اکبر علی خاں

مولوی ابوالحسن سید علی
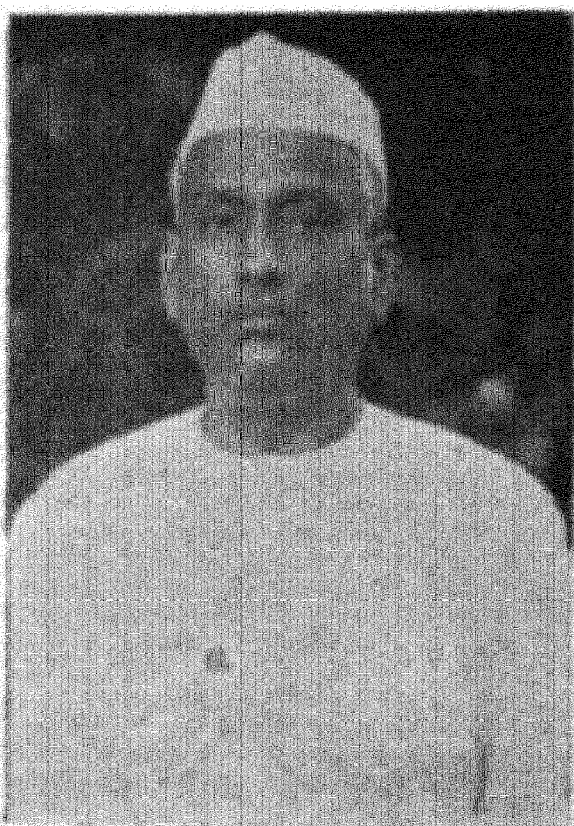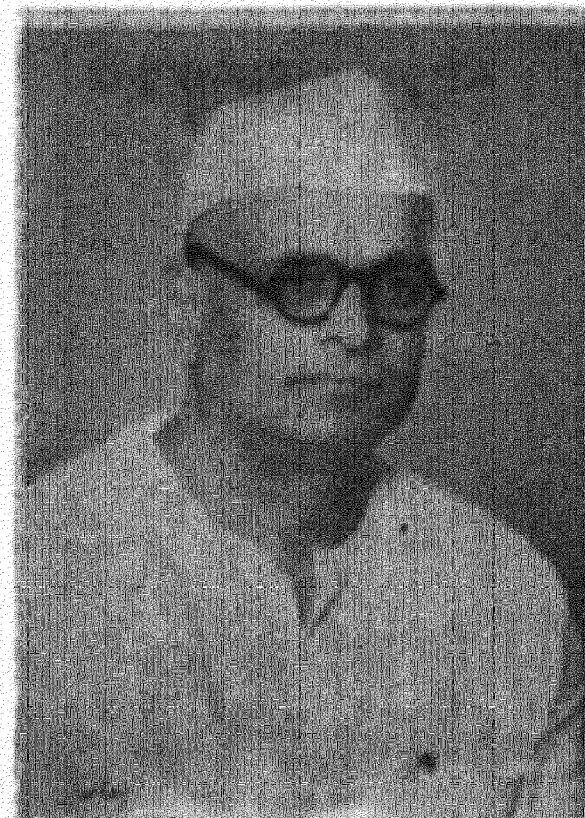
نواب ہوش یار جنگ

پنڈت جی۔ راماچاری

شری جناردھن راو دیسائی

ڈاکٹر میلکوٹے

شریمتی کے ی. بولب رائے

شریمتی پریم لتا گپتا

شری سید داد ار حسن
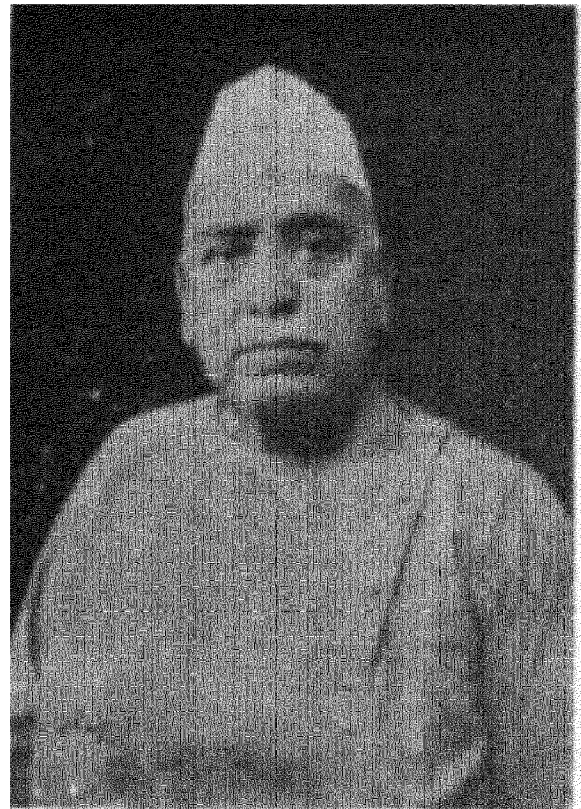
شری منظور احمد خاں
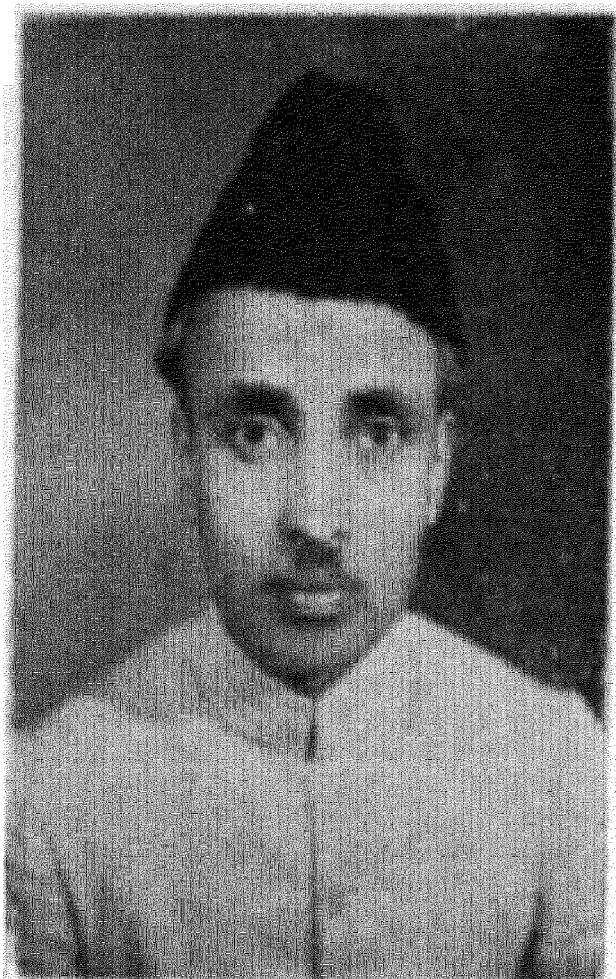
سید احمد اللہ قادری

نواب محمود یار جنگ

ہز ایکسلنسی مسٹر ایم۔ ایس۔ اینے، گورنر بہار

۱۵/ اگست ۱۹۴۹ء کو ہماری آزادی کا دوسرا سال ختم ہو رہا ہے۔ آزادی کی دوسری سالگرہ کی حیثیت سے یہ موقع ہم سب کے لئے خوشی اور مسرت کا ہے۔ لیکن ان دو برسوں میں ہم مشکلات سے دوچار رہے ہیں۔ اگرچہ ہم یہ دعویٰ کر سکتے ہیں کہ حالات ہمارے قابو میں ہیں تاہم ہماری مشکلات ابھی ختم نہیں ہوئیں۔ ہمارے رہنماؤں کے ہاتھوں میں قوم کی قسمت کی باگ ہے۔ اُن کے سامنے دو کام ہیں۔ جو خطرات پہلے سے موجود ہیں اُن کا مقابلہ کرنا اور تمام باشندوں کی معاشی اور اخلاقی بہتری کی کوشش کرنا۔ یہ دونوں مقاصد عوام ہی کے تعاون سے حاصل ہو سکتے ہیں۔ حکومت اُسی وقت ترقی کر سکتی ہے جب پُر امن حالات برقرار رہیں اور حکومت کے ساتھ کامل تعاون کیا جائے۔ مجھے امید ہے کہ آزادی کے تیسرے سال ہماری توانائیاں ہم آہنگی کی تخلیق میں صرف ہوں گی جو قوم کی ہمہ جہتی ترقی کے لئے شرطِ اولین ہے۔

۲۰/ جولائی ۱۹۴۹ء

M. S. Aney.

ہز ایکسیلنسی مسٹر منگل داس پکواسا گورنر صوبہ متوسط و برار

ہندوستان کے یوم آزادی کی یادگار مناتے وقت ہم کو خدا کا شکر ادا کرنا چاہئے کہ بغیر کسی خونریزی یا خونی انقلاب کے اس نے ہم کو آزادی حاصل کرنے کی توفیق عطا فرمائی۔ ہم کو اس کی بھی دعا کرنی چاہئے کہ خدا ہم کو اتنی عقل، ایسا کردار اور اتنی اخلاقی طاقت عطا فرمائے کہ ہم اس آزادی کو برقرار رکھ سکیں اور درجہ بہ درجہ ترقی کرتے کرتے ایسی بلندی پر پہنچ جائیں کہ ماضی کی طرح پھر ایک مرتبہ دنیا کے سامنے اخلاقی اور روحانی عظمت و شان کا نمونہ پیش کر سکیں۔ اس کا حصول اسی وقت ممکن ہے جب عوام میں اتحاد ہو۔ ملک میں امن ہو اور آبادی کے تمام طبقے ایک دوسرے سے تعاون کریں۔ پس عظیم تر اور متحدہ ہندوستان کی خاطر ہم کو اُن اخلاقی اور روحانی صفات کے حصول کی کوشش کرنی چاہئے جن سے ہمارے خوابوں کی تعبیر پوری ہو سکے۔

۲۰/ جولائی ۱۹۴۹ء

Mangaldas Pakvasa

ہز اکسلنسی ہیرچ' پی' موڈی' گورنر صوبہ متحدہ

مجھے یہ معلوم کرکے مسرت ہوئی کہ حیدرآباد کے ممتاز حضرات ہندوستان کی آزادی کی دوسری سالگرہ پر ایک یادگار کتاب شائع کر رہے ہیں۔ ۱۵/اگسٹ کا دن وہ دن ہے جس میں ہماری تاریخ میں اور جو لوگ اس ملک میں رہتے ہیں اُن سب کے لئے ہمیشہ وہ خوشی کا دن رہے گا۔ بلکہ اس سے بھی زیادہ وہ موقع اس کا ہے کہ ہر شخص خواہ زندگی میں اس کی حیثیت کچھ ہی کیوں نہ ہو' اس بات کا عہد کرے کہ وہ خود کو اس آزادی کا اہل ثابت کرے گا۔ جو بنیادیں ڈال دی گئی ہیں اُن پر تعمیر کی بھاری ذمہ داری ہمارے ہی کندھوں پر ہے اور مجھے امید ہے کہ ہم ناکام نہ ہوں گے۔

۲۸/جولائی ۱۹۴۹ء

H. Mody

آنریبل مسٹر ہری کرشنا مہتاب' وزیر اعظم اڑیسہ

ایک یادگار کتاب شائع کرکے ہندوستان کی آزادی کی دوسری سالگرہ منانے کا خیال نہایت ہی قابل تعریف ہے۔ میں اس کوشش کی ہر کامیابی کا متمنی ہوں۔

۲/جولائی ۱۹۴۹ء

Harekrushna Mahtab

سر محمد عثمان کے۔سی،ایس،آئی۔کے،سی،آئی،ای سابق گورنر مدراس

مجھے بڑی مسرت ہے کہ ہندوستان کی آزادی کی دوسری سالگرہ کی یادگار میں "ہندنامہ" شائع کیا جارہا ہے۔میں اس کی ہر کامیابی کا متمنی ہوں۔

مدراس

۲/اگست ۱۹۴۹ء

M. Usman

امین الملک سر مرزا اسمٰعیل، کے،سی۔آئی،ای

میری بہترین تمنائیں ہندنامہ کی کامیابی کے لئے ہیں جو مسٹر سید احمداللہ قادری ہندوستان کی آزادی کی دوسری سالگرہ کی یادگار میں مرتب کررہے ہیں۔ مسٹر قادری نے اس اہم موقع کے شایان شان کتاب کو دلچسپ بنانے میں غیر معمولی محنت برداشت کی ہے۔

بنگلور

۱۹/جولائی ۱۹۴۹ء

Mirza M. Ismail

گورنرکیمپ
بہار
۹/جون ۱۹۴۹ء

ڈیئر مسٹر قادری۔

آپ کے مکتوب مورخہ ۵/جون ۱۹۴۹ء کیلئے بیحد ممنون ہوں۔

مجھے مسرت ہے کہ آپ ہندوستان کی آزادی کی دوسری سالگرہ کے موقعہ پر ایک مصور یادگار کتاب شائع فرمارہے ہیں۔ آپ کی تمنا کے مطابق یہ کتاب اعلیٰ معیار کی حامل رہی تو مجھے یقین ہے کہ اس کی بے حد قدر ہوگی اور وسیع پیمانہ پر مطالعہ میں رہے گی میں آپ کی اس حب وطنی اور ادبی کاوش کی کامیابی کا متمنی ہوں۔ میں نے آپ کا مکتوب حکومت بہار کے چیف سکرٹری کے پاس بھیج دیا ہے تمام مسائل پر جن کی آپ ضرورت محسوس فرمائیں اُن سے راست خط و کتابت فرما سکتے ہیں۔

آپ کا مخلص

M. S. Aney.

مسٹر سید احمد اللہ قادری
دفتر روزنامہ انصاف
حیدرآباد دکن

ہز اکسلنسی شری سی راجگوپال آچاری گورنر جنرل ہند

ہز اکسلنسی راج گوپالہ چاریہ ۱۸۷۹ء میں صوبہ مدراس کے ضلع سیلم کے ایک موضع ہوسور میں پیدا ہوئے۔ آپ کی تعلیم سنٹرل کالج بنگلور۔ اور پریذیڈنسی کالج و لاکالج مدراس میں ہوئی۔ ۱۹۰۰ء میں آپ نے ضلع سیلم میں وکالت شروع کی۔ وکالت میں آپ کو کافی کامیابی نصیب ہوئی اور خوب آمدنی ہونے لگی تھی کہ آپ ۱۹۱۹ء میں سیاسی تحریک ستیہ گرہ اور ۱۹۲۰ء میں ترک موالات کی مہم میں عملی حصہ لیا۔ اور اس عملی اقدام کی وجہ سے آپ کی وکالت متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکی۔ جب مہاتما گاندھی کو قید کر لیا گیا تو ان کے غیاب میں ان کا رسالہ ینگ انڈیا آپ کی ادارت میں شائع ہوتے رہا۔ ۱۹۲۱-۲۲ء میں آپ انڈین نیشنل کانگریس کے معتمد عمومی رہے۔ اور تحریک ترک موالات کے دوران میں اور اس کے بعد ۱۹۴۲ء تک ورکنگ کمیٹی کے رکن رہے صرف چار سال کی غیر حاضری کے بعد ۱۹۴۶ء سے حال حال تک آپ کانگریس ورکنگ کمیٹی کے رکن رہیں۔ ۱۹۳۷ء سے ۱۹۳۹ء تک آپ صوبہ مدراس کی کانگریسی وزارت میں وزیر اعظم رہے۔ جب کانگریس کے اعلیٰ کمان کے حکم کی تعمیل میں ملک بھر میں یہ وزارتیں تحلیل ہو گئیں تو آپ بھی دیگر وزراء کے ساتھ مستعفی ہو گئے سیاسی اعتقادات میں دوسرے سے اختلاف کی بناء پر آپ کو ۱۹۴۲ء میں کانگریس

سے اس کے واردھا کے اجلاس کے بعد علیحدگی اختیار کرنی پڑی۔ ۲۸/ جولائی ۱۹۴۰ء کو کانگریس ورکنگ کمیٹی کا جو اجلاس پونہ میں ہوا تھا اس میں آپ کو بڑی کامیابی ہوئی یعنی آپ نے کانگریس کو اس بات پر راضی کرلیا کہ جنگ عظیم میں ہندوستان کو برطانیہ اور اس کے ساتھیوں کی ضرور مدد کرنی چاہیئے بشرطیکہ عارضی قومی حکومت ملک میں فوراً قائم ہو جائے۔ لیکن ۴/ ڈسمبر ۱۹۴۰ء کو قانون تحفظ ہند کے تحت آپ کو گرفتار کرلیا گیا اور ایک سال کی سزا سنائی گئی گاندھی جناح گفت و شنید جو ۱۹۴۴ء میں ہوئی اس میں راجہ جی نے مہا تما گاندھی کے سرگرم رفیق کی حیثیت سے نمایاں حصہ لیا۔ اگر یہ گفت و شنید کامیابی کے ساتھ پایۂ تکمیل کو نہیں پہونچی تو اس کی ذمہ داری راجہ جی پر نہیں ہے۔ اگر آپ کی حقیقت شناسی اور پُرخلوص مساعی کو صحیح طور پر اہمیت دی جاتی تو شائد ملک کی تاریخ کا رخ پلٹ جاتا۔ درمیانی حکومت میں ستمبر ۱۹۴۶ء سے لیکر ۱۵/ اگسٹ ۱۹۴۷ء تک راجہ جی صنعت و حرفت اور دیگر سررشتوں کی وزارت پر فائز رہے۔ اور اگسٹ ۱۹۴۷ء سے جنوری ۱۹۴۸ء تک صوبہ بنگال کی گورنری کو مستحسن طریقہ سے سنبھالا۔ اس وقت آپ ہندوستان کے گورنر جنرل ہیں اور اس حیثیت سے نہایت ہر دلعزیز ہیں آپ کو یہ فخر حاصل ہے کہ آپ پہلے ہندوستانی ہیں جنہیں آزاد ہندوستان کی گورنر جنرلی کا اعزاز حاصل ہوا۔ آپ کی سادہ زندگی دوسروں کے لئے سبق ہونی چاہیئے۔ مہاتما گاندھی کے اہنسا کے اصول کے صحیح معنوں میں آپ قائل ہیں۔ تامل زبان اور انگریزی میں آپکے کئی تصانیف ہیں۔

ظہیرالدین احمد ام، اے ایچ، سی، یس

آنریبل پنڈت جواہر لال نہرو وزیر اعظم ہند

آپ کا تعلق شمالی ہندوستان کے ایک مشہور و معروف گھرانے سے ہے۔ جو کشمیر سے توطن پذیر ہو کر الہ آباد میں قیام فرما ہوا۔ آپ کے والد موتی لال نہرو ایک نہایت متمول بیرسٹر تھے۔ جو بعد میں سیاسی حالات سے متاثر ہو کر انڈین نیشنل کانگریس کے ممتاز اور سرگرم کارکن بن گئے تھے۔ اور اس سلسلہ میں بڑی بیش بہا قربانی اور ایثار کا ثبوت دیا تھا۔ اس گھرانے کا بچہ بچہ کیا عورت کیا مرد مشرق اور مغرب کے تمدنوں کے امتزاج کا بہترین نمونہ ہے۔ اور ملک کی آزادی کی جنگ میں بڑی بڑی قربانیاں دی ہیں۔ پنڈت نہرو ۱۴/ نومبر ۱۸۸۹ء کو پیدا ہوئے۔ شہرہ آفاق پبلک اسکول ہارو اور ٹرنیٹی کالج۔ کیمبرج۔ میں آپ کی تعلیم ہوئی۔ انر ٹمپل سے آپ نے بیرسٹری کی سند حاصل کی۔ اور الہ آباد ہائیکورٹ کے ایڈوکیٹ بن گئے۔ ۱۹۱۶ء میں آپ کی شادی ہوئی ۱۹۱۸ء سے آپ مسلسل ابتک کانگریس کمیٹی کے رکن ہیں ۱۹۲۱ء میں آپ کو جیل جانا پڑا۔ اور اس کے دوسرے سال آپ کو رہائی ملی لیکن بہت جلد پھر گرفتار کر لیا گیا ۱۹۲۹ء میں آپ کانگریس کے معتمد عمومی مقرر ہوئے اور اسی سال صدر بھی منتخب ہوئے۔ قانون نمک کی خلاف ورزی کے سلسلہ میں ستیا گرہ میں حصہ لیا اور اپریل ۱۹۳۰ء میں پکڑ لئے گئے۔ جنوری ۱۹۳۱ء میں چھٹکارا ملا۔ لیکن ۱۹۳۲ء ۱۹۳۴ء میں دوبارہ جیل جانا پڑا۔ ۱۹۳۵ء میں رہائی

ملی ۱۹۳۶ء اور ۱۹۳۷ء میں کانگریس کے صدر منتخب ہوئے ۱۹۴۶ء میں آپ چوتھی بار کانگریس کے صدر مقرر ہوئے ۱۹۴۰ء میں آپ آٹھویں بار جیل بھیجے گئے اور بہانہ یہ کیا گیا کہ قانون تحفظ ہند کے تحت آپ کا آزاد رہنا ملک کے امن وامان کے لئے خطرہ کا باعث ہے - اسی قانون کے تحت آپ نویں مرتبہ ۱۹۴۲ء میں گرفتار کرلئے گئے اور جون ۱۹۴۵ء تک آپ کو خلاصی نہیں ملی - ہند کی آزادی کی جنگ میں مبارزین کے صف اول میں پنڈت نہرو کو جو مقام حاصل ہے وہ سوائے مہاتما گاندھی کے کسی اور کو نصیب نہیں ہوسکتا - اس وقت آپ حکومت ہند کے وزیر اعظم کی حیثیت سے کارفرما ہیں اور امور خارجہ اور امور متعلق بہ تعلقات دولت عامہ کے قلمدان وزارت بھی آپ کے تفویض ہیں -

ہندوستان کے کئی جامعات بشمول جامعہ عثمانیہ نے آپ کو اعزازی طیلسان دئے ہیں اور یہ اس وجہ سے نہیں کہ سیاسیات کے میدان میں آپ کو بلند مرتبہ نصیب ہے بلکہ اس وجہ سے کہ علوم و فنون کے میدان میں بھی آپ کو نہایت درجہ نمایاں مقام حاصل ہے - اس علمی شغف کے نتیجہ کے طور پر آپ کی تصانیف موجود ہیں جو ساری دنیا میں بڑی دلچسپی سے پڑھی جاتی ہیں -

ظہیرالدین احمد ام، اے، یچ، سی، یس

سردار ولبھ بھائی پٹیل نائب وزیر اعظم ہند
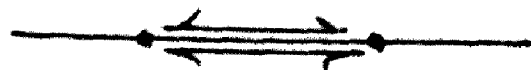
آپ بمقام کرم سد، ناڈیاڈ کے قریب ۳۱ اکتوبر ۱۸۷۵ء کو پیدا ہوئے ناڈیاڈ ہائی اسکول سے میٹرک کامیاب کرنے کے بعد ڈسٹرکٹ پلیڈرز کے امتحان میں کامیابی حاصل کی اور ضلع گودھرا کی عدالتوں میں فوجداری مقدمات کی وکالت کرنے لگے۔ کچھ عرصہ اس طرح گذرا اور آپ بیارسٹری کی تعلیم کے لئے راہی انگلستان ہوئے۔ مڈل ٹمپل سے سند حاصل کرنے کے بعد جب ہندوستان واپس ہوئے تو احمد آباد میں قانونی پیشہ انجام دینا شروع کیا۔

آپ کی قومی زندگی کا آغاز ۱۹۱۶ء سے ہوا۔ آپ مہاتما گاندھی کے احمد آباد ستیہ گرہ آشرم کے سرگرم کارکن رہ چکے ہیں۔ لیکن آپ کو جو نمایاں شہرت بحیثیت ستیاگرہ لیڈر حاصل ہوئی وہ کیرہ کی ستیہ گرہ، ناگپور میں قومی جھنڈے کی مہم اور بردولی کی مہم عدم ادائی محاصل کے سلسلہ میں حاصل ہوئی۔ ۱۹۲۴ء سے ۱۹۲۸ء تک احمد آباد کی مجلس بلدیہ کی صدارت پر فائز رہے ۱۹۲۸ء میں احمد آباد کو خیرباد کہا اور بردولی چلے گئے۔ بلند کردار اور اعلیٰ کارکردگی کے سلسلے میں آپ کے سیاسی گرو مہاتما گاندھی نے آپ کو "سردار" کے خطاب سے سرفراز فرمایا۔

۱۹۳۱ء میں انڈین نیشنل کانگریس کے کراچی کے اجلاس میں صدر منتخب ہوئے۔ ترک موالات، عدم ادائی محاصل کی سیاسی تحریکات کے سلسلہ میں آپکو

کئی مرتبہ جیل جانا پڑا۔ ۱۹۳۵ء میں جب کانگریس نے وزارتیں اور عہدے قبول کرنے کا تصفیہ کیا تو پارلیمنٹری سب کمیٹی قائم ہوئی اور اس کی صدارت سردار پٹیل کے تفویض ہوئی۔ اس حیثیت سے آپ ۱۹۴۲ء تک گیارہ صوبہ جات کے منجملہ سات صوبوں کے وزارتی کاروبار کی نگرانی نہایت قابلیت کے ساتھ کرتے رہے ریاست راجکوٹ کے ٹھاکر صاحب سے جب اصلاحات کا قضیہ کھڑا رہا تو بات چیت کرنے کے لئے کانگریس کی جانب سے سردار پٹیل ہی کو مقرر کیا گیا۔ یہ کام انھوں نے خوش اسلوبی ۱۹۳۸۔۳۹ء میں پایہ تکمیل کو پہونچایا۔

اکتوبر ۱۹۴۰ء میں قانون تحفظ ہند کے حوالہ سے آپ کو گرفتار کر لیا گیا اور کم و بیش ایک سال قید رکھا گیا۔ دوبارہ ۱۹۴۲ء میں گرفتار کر لیا گیا اور اس دفعہ مسلسل ۱۵/ جون ۱۹۴۵ء تک آپ کو جیل میں رہنا پڑا۔

یہ مختصر سوانح حیات اس شخص کی ہیں جس نے اپنی سیاست اور تدبر کا سکہ بٹھا دیا ہے اور اپنے اعلیٰ کردار، صاف گوئی اور عزم صمیم کی وجہ سے دنیا کے مدبرین کے صف اول میں جگہ پانے کا مستحق قرار پایا ہے۔ یہ ہندوستان کا "بسمارک" ۱۵/ اگسٹ ۱۹۴۷ء سے آزاد ہندوستان کا نائب وزیر اعظم ہے جس نے ریاستوں کی گتھی سلجھانے میں جس خاص کامیابی حاصل کی ہے۔

ظہیر الدین احمد ام اے۔ ایچ سی ایس

مولانا ابو الکلام آزاد وزیر تعلیم حکومت ہند

آپ کے والد بزرگوار ایک مشہور عالم تھے جو ۱۸۵۷ء میں ہجرت کر کے مکہ معظمہ چلے گئے تھے۔ آپ کی پیدائش اسی مقدس مقام میں ۱۸۸۹ء میں ہوئی۔ آپ کا سن کوئی دس سال ہوگا کہ آپ کے والد مع اپنے خاندان کے ۱۸۹۸ء میں ہندوستان واپس ہو کر کلکتہ میں سکونت پذیر ہوئے۔ چودہ سال کی عمر میں آپ کو زبان عربی اور علوم مشرقیہ میں ید طولیٰ حاصل ہو گیا تھا اور آپ کے علم و فضل کی یہ حالت تھی کہ لوگ آپ سے علم حاصل کرنے آنے لگے۔ مولانا آزاد نے تحصیل و تکمیل علم کے لئے اسلامی ممالک عراق۔ مصر۔ ترکی کے علاوہ فرانس کا سفر کیا اور یوروپی السنہ اور ادب سے بھی واقفیت حاصل کی ۱۹۱۲ء میں جب کہ ہندوستان کے مسلمان انڈین نیشنل کانگریس کی تائید میں نہیں تھے اور اپنے آپ کو سیاسی تحریکوں سے دور رکھتے تھے مولانا نے مشہور جریدہ "الہلال" شائع کرنا شروع کیا۔ اس جریدہ کو ملک میں غیر معمولی مقبولیت حاصل ہوئی۔ ہندوستانی مسلمانوں میں سیاسی بیداری اور ان میں سے اکثر کی کانگریس میں شرکت کا سہرہ اسی رسالہ "الہلال" کے سر ہے۔ حکومت نے ۱۹۱۴ء میں "الہلال" کو حکماً بند کر دیا اور مولانا آزاد کو رانچی کے جیل خانہ میں قید کر دیا گیا۔ ۱۹۲۰ء میں رہائی نصیب ہوئی۔ مہاتما گاندھی کی قیادت میں مولانا نے ترک موالات کی تحریک میں نمایاں حصہ لیا نتیجتاً ۱۹۲۰ء ہی

میں پھر گرفتار کر لیے گئے اور دو سال کے لیے آپ کو جیل خانہ میں بند کر دیا گیا۔ اس کے علاوہ کئی اور موقعوں پر بھی اپنے سیاسی اعتقادات کی بناء پر آپ کو قید کی صعوبتیں برداشت کرنی پڑیں۔ اور یہ سلسلہ سنہ ۱۹۴۲ء تک جاری رہا۔ انڈین نیشنل کانگریس کی صدارت پر فائز رہے۔ سنہ ۱۹۴۲ء میں سر اسٹیفورڈ کرپس سے آپ نے کانگریس کی جانب سے گفت وشنید کی اور سنہ ۱۹۴۵ء میں جب لارڈ ویول نے شملہ کانفرنس طلب کی تو مولانا ہی کانگریس کے واحد نمائندہ کی حیثیت سے اس کانفرنس کے مباحث میں حصہ لیا۔ و نیز کانگریس کی طرف سے سنہ ۱۹۴۶ء میں بھی کابنٹ مشن سے گفت وشنید بھی آپ ہی نے کی۔ جنوری سنہ ۱۹۴۷ء میں جب عارضی حکومت قائم ہوئی تو حکومت ہند کے سررشتہ تعلیم کا قلمدان وزارت آپ کے تفویض ہوا۔ اور اگست سنہ ۱۹۴۷ء سے حکومت ہند کے وزیر تعلیمات ہیں۔

مولانا آزاد کی علمی زندگی۔ ان کی سیاسی زندگی سے کسی طرح کم شاندار نہیں ہے۔ علوم مشرقیہ میں آپ کو جو تبحر حاصل ہے اس کی وجہ سے آپ بین الاقوامی شہرت کے حامل ہیں۔ فلسفہ اور ادبیات پر آپ کی تصانیف کو ایک خاص مقام حاصل ہے۔ علم تفسیر میں آپ کی تصنیف ترجمان القرآن کو استناد کا درجہ دیا جاتا ہے۔

ظہیر الدین احمد ام اے ایچ سی ایس

ڈاکٹر راجندر پرشاد صدر مجلس دستور ساز

آپ ۳/دسمبر ۱۸۸۴ء کو پیدا ہوئے۔ پریسیڈنسی کالج کلکتہ سے ایم اے، ایم ایل اور ایل ایل ڈی کی ڈگریاں حاصل کیں۔ ۱۹۰۸ء میں جی۔ بی۔ بی کالج میں انگریزی کے پروفیسر بن گئے۔ مگر ۱۹۱۱ء میں کلکتہ ہائیکورٹ میں وکالت شروع کردی کلکتہ میں جی نہیں لگا تو پٹنہ آگئے، جہاں ۱۹۱۶ء سے ۱۹۲۰ء تک وکالت کرتے رہے۔ اسی سال چمپارن کی زرعی جدوجہد میں مہاتما گاندھی کے ساتھ حصہ لیا۔ ترک موالات کی مہم میں پیشہ وکالت کو ترک کردیا۔ آپ کئی سال سے کانگریس کی مجلس عاملہ کے رکن ہیں۔ اور معتمد بھی رہ چکے ہیں۔ ۱۹۳۲ء ۱۹۳۴ء اور ۱۹۳۹ء میں کانگریس کے صدر تھے۔ سول نافرمانی کی تحریکوں میں حصہ لینے کے باعث کئی مرتبہ جیل یاترا کرنی پڑی۔ اگست ۱۹۴۲ء کو آخری مرتبہ گرفتار ہوئے اور ۱۹۴۵ء کو رہائی پائی۔ عارضی حکومت کے رکن اغذیہ و زراعت کے سوا آزاد ہند کی پہلی کابینہ کے وزیر اغذیہ و زراعت بھی رہ چکے ہیں۔ ۱۸/نومبر ۱۹۴۷ء کو کانگریس کے پھر صدر منتخب ہوئے اس نئے عہدہ کا جائزہ لینے کے لئے آپ ۱۵/جنوری ۱۹۴۸ء کو نہرو کابینہ سے سبکدوشی حاصل کی۔

آپ کانگریس کے صف اول کے قائدین میں ممتاز ہیں۔ دسمبر ۱۹۴۶ء سے دستور ساز اسمبلی کے صدر ہیں۔ آپ کو صحافت سے اُنس ہے۔

مقالات

اِفتتاحیہ

۱۵/اگست ۱۹۴۷ء ایشیائی سیاست کا سب سے اہم واقعہ ہے۔ اس دن کو ہندوستان میں جو اہمیت حاصل ہے کسی اور دن کو نہیں۔ کیونکہ اسی دن ہندوستان نے صدیوں کی غلامی سے نجات حاصل کی تھی!

آزادی ایک ایسی متاعِ بے بہا ہے جس کا متلاشی ہر ملک اور جس کی جویا ہر قوم رہی ہے۔ ہندوستان کی آزادی دراصل ایک ملک کی آزادی نہیں۔ ایک متمدن مہذب اور طاقتور قوم کی آزادی ہے جو تعداد میں ہزار نہیں، لاکھ نہیں، کروڑوں پر مشتمل ہے اور جو دنیا کی آبادی کا ⅕ ہے۔

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ جمہوریت کی باگ ڈور انہیں اربابِ بصیرت کے ہاتھوں میں رہتی ہے جو غور و فکر کا صحیح مادّہ اور اعلیٰ دماغی صلاحیت رکھتے ہیں۔ اس کلیہ کے مدنظر ہندوستانی حکومت کی زمام ایسے ہی دانشمندوں کے ہاتھوں میں ہے جن کو ملک اور قوم کا سچا درد ہے۔

ہندوستان اگر فوجی قوت کے زور پر آزاد ہوتا تو لاکھوں آدمی جنگِ آزادی میں مارے جاتے اور نتیجہ کے طور پر مدمقابل سے ہمیشہ کے لئے رقابت رہتی مگر ناخدایانِ ہند نے انتہائی تدبر سے کام لیکر ہند کو اس طرح آزاد کرایا کہ مشرق و مغرب کی دوستی اب بھی سلامت و برقرار ہے۔

ہندوستان کے آزاد ہونے کے بعد اس میں شک نہیں کہ ملک کے کچھ حصہ میں تنگ نظری، تعصب، اور فرقہ واریت کا بھی دور دورہ رہا جس نے انسانیت و جمہوریت کے خلاف علم بغاوت بلند کر رکھا تھا - اس علم کو مہاتما گاندھی نے اپنی جان کی قربانی دیکر سرنگوں کر دیا - انسانیت کے پجاری اور آزادی کے علمبردار تعصب و فرقہ واریت کی خلیج کو پاٹنے اور اس کی بنیاد کو ڈہانے میں مصروف ہیں یہ کوئی معمولی کام نہیں ہے جو کسی قریہ - کسی گاؤں - کسی تعلقہ، کسی ضلع اور کسی شہر کی حد تک محدود ہو - بلکہ یہ بہت وسیع کام ہے جو عظیم تر مملکت کے طول و عرض پر مشتمل ہے - جس میں لاکھوں گاؤں ہزاروں اضلاع اور سیکڑوں شہر واقع ہیں اور کروڑوں انسان بستے ہیں - اتنی بڑی مملکت کے نظم و نسق کو مستحکم کرنا اور اُسے سیاسی چپقلشوں کی زد سے بچانا سیاسی بصیرت کا منت کش ہے - دور حاضر میں اس میدان کے شہسوار یقیناً مسٹر سی راجگوپال اچاری، پنڈت جواہر لال نہرو، سردار ولبھ بھائی پٹیل، مولانا ابوالکلام آزاد اور ڈاکٹر راجندر پرشاد ہیں - اور اسی بنا پر حیدرآباد کے ممتاز شہریوں نے "ہندنامہ" کو ان پانچ ممتاز قائدین و ارباب حکومت کے نام نامی سے منسوب کیا ہے!

ہر مخلص کو اخلاص سے پرکھا جاتا ہے - در اصل مخلص وہی ہے جو شمع آزادی کا پرستار ہو - ہر مخلص ہندوستانی کے دل میں صرف اُسی کے لئے جگہ نکل سکتی ہے جو آزادی کا علمبردار - امن کا حامی - غیر فرقہ وار مملکت کا مدعی - انسانیت کا پرستار اور تعصب و تنگ نظری کا سخت ترین دشمن ہو - ان

اور اس سلسلے میں وہ بہت پیش پیش رہے۔ اس پیشکش کی اہمیت اور قدر و قیمت کا مسٹر راؤ کو یقیناً احساس ہے کیونکہ وہ خود ایک ممتاز اور سنجیدہ صحیفہ نگار ہیں۔ انھوں نے اپنی اعلیٰ مذاقی اور قدردانی کا اس طرح ثبوت بہم پہنچایا کہ اس والیوم کے (۵۰۰) نسخوں کی خریدی کے لئے نہایت پرزور طریقہ پر حکومت میں سفارش کی۔ نواب مہدی نواز جنگ بہادر۔ مسٹر جانکی پرشاد نائب ناظم اطلاعات اور مسٹر حامد علی نائب معتمد صنعت و حرفت کا بھی ممنون ہوں انھوں نے مشورے دئے۔ پروفیسر نصیر احمد عثمانی اور پروفیسر سید فضل حق کا بھی شکریہ ادا کرنا ضروری ہے انھوں نے تراجم میں مدد دی۔

میں نے اس والیوم کی اشاعت پر ہزاروں روپیہ صرف کئے ہیں۔ قلمی تصاویر کی تیاری اور اس کے بعد اُن کی بلاک سازی پر میرا بے دریغ روپیہ صرف ہوا۔ اس سلسلے میں، میں ڈان کمپنی سکندرآباد کا ممنون ہوں کہ اس نے عمدگی کے ساتھ اس کے بلاک بنائے۔ اور مالک اعظم اسٹیم پریس مسٹر سید عبدالوہاب اور مینجنگ ڈائرکٹر مسٹر وینو گوپال پلّے کا بھی بے حد شکر گزار ہوں کہ ایک ہفتہ میں اتنی ضخیم کتاب اپنے مطبع میں چھپوا دی خاصکر مسٹر عبدالوہاب کتاب کی طباعت کے موقع پر خود موجود رہتے اور ہدایات دیتے تھے۔ مسٹر خورشید حسن مینجنگ ڈائرکٹر پریس آرٹس کا بھی ممنون ہوں انھوں نے سرورق، اور انگریزی حصہ کی طباعت کا کام اپنے مطبع میں انجام دلایا اور ماڈرن پرنٹنگ ہوس نے فوٹو بلاکس طبع کئے۔ اس والیوم کو میں عثمانیہ یونیورسٹی پریس یا گورنمنٹ سنٹرل پریس میں طبع کرانا چاہتا تھا۔ گورنمنٹ سنٹرل پریس

اس کام کو بہ عمدگی انجام دے سکتا تھا۔ مگر افسوس کہ وہاں اس کی طباعت کا انتظام نہ ہو سکا۔

آخر میں بڑے فخر کے ساتھ اس حقیقت کا اظہار ضروری خیال کرتا ہوں کہ ہز مجسٹی ملک معظم نے بھی اس تجویز کو پسند فرمایا۔ اور لارڈ چمبرلین کو جو خط بھیجا گیا تھا اس کا جواب ملک معظم کی جانب سے حوصلہ افزا الفاظ میں قصر بکنگھم سے وصول ہوا۔

ہندنامہ کی اشاعت کا تقریباً آدھی دنیا کو علم ہے۔ مسٹر ٹرومن، جوزف اسٹالین، مسٹر اٹیلی، ارل مونٹ بیٹن، سر اسٹیفورڈ کرپس۔ مسٹر چرچل اور نھاکن نو وغیرہ بھی اس والیوم سے واقف ہیں۔ پھر ایک مرتبہ میں اپنے قدیم عنایت فرما مسٹر بی۔ رام کشن راؤ کا تذکرہ ضروری تصور کرتا ہوں کہ یہ سارا کام اُنہی کی مخلصانہ رہنمائی میں انجام پایا۔

پنڈت جی راماچاری کا شکریہ ادا کئے بغیر اگر ہندنامہ شائع کر دیا جاتا تو احسان فراموشی ہوتی کیونکہ اس کی اشاعت میں ان کی ہمدردیوں کو بڑا دخل رہا ہے۔

۱۵۔ اگسٹ ۱۹۴۹ء

سید احمد اللہ قادری

مُرتّبِ ہندنامہ

مہمانانِ ہند

آزادیٔ ہند کی دوسری سالگرہ کا علمی پیش کش

احادیثِ نبوی اور ہند کی فضیلت

(از)

ادیبِ عصر نواب ہوش یار جنگ بہادر

۱۵ اگست ۱۹۴۹ء

جناب حکیم قادری نے "ہندنامہ" کے لئے مجھ سے اُس وقت مقالہ مانگا جب کہ میری تمام تر توجہ "سرگزشت" (آٹو بیاگرفی) کی تکمیل پر لگی ہوئی ہے، قادری صاحب سے چہل سالہ تعلقات کوئی عذر بھی تراش نہ سکتے تھے، اس پر نظر کرکے "ہندنامہ" کیلئے کسی ایسے موضوع کی تلاش میں دماغ فکر کرنے لگا جو اس کیلئے موزوں ہو، حُسن اتفاق کہ کتب خانہ میں حسان الہند علامہ آزاد بلگرامی کی کتاب "شمامتہ العنبر" پر نظر پڑ گئی جو ۱۱۶۳ھ (دو صدی قبل) میں بزبان عربی لکھی گئی تھی اور جس کو جنوبی ہند کے قیام (ارکاٹ) کے دوران میں علامۂ مغفور نے مرتب کیا تھا، اس میں ہند کے فضائل سے متعلق جو باب ہے اُس کو احادیث نبوی سے چار چاند لگائے گئے ہیں، مختلف احادیث کے معتبر راویوں نے یہ ثابت کیا ہے کہ ابوالبشر (حضرت آدم علیہ السلام) جنت سماوی سے سرزمین ہند کے پہاڑ (ہوزان) پر گرے، اس صورت سے ان کی پیدائش گاہ ہند ہوئی یہی اُن کا مرتے دم تک وطن رہا، یہیں اُن کی اولاد پیدا ہوئی، یہیں ہابیل کی موت پر آدمؑ نے آنسو بہائے، یہیں اُن کے جانشین اور وصی (حضرت شیث علیہ السلام) پیدا ہوئے اور جب اولاد آناً فاناً بڑھنے لگی تو کائنات کی ساتوں اقلیموں میں منتشر ہوتی رہی، اصلی وطن (ہند) سے اطراف عالم میں منتشر ہونیکے باوجود سراندیپ (سنگلدیپ - لنکا) ہی آدمؑ کی بکھری

ہوئی اولاد کا اصلی مرز بوم رہا، خواہ کسی نے مغرب میں بود و باش اختیار کرلی ہو یا مشرق میں، شمال میں بس گیا ہو۔ یا جنوب میں، بارگاہ احدیت سے باوا آدم کی "جنم بھومی" ہونے کا جو امتیاز سرزمین ہند کے قابل رشک مقدر میں تھا وہ مل گیا اور یہ امتیاز کسی دوسری سرزمین کو حاصل نہ ہو سکا۔ اور کیونکر حاصل ہوتا جبکہ دُنیا میں سب سے پہلے انسان کا وجود اسی سرزمین پر ظاہر ہوا، اسی سرزمین پر سب سے پہلے وحی خداوندی جبریل لیکر آئے اور حضرت آدم پر پچاس صحیفے اسی سرزمین پر نازل ہوئے۔

خوش قسمت ہے دجنی پہاڑ کی خاک جس نے آدم کے پتلے کو پہلا پیغمبر بنایا اور جس نے ابوالبشر کو اپنی ہندی گود میں کھلایا، ابوالبشر، ہند کے پہاڑ بوذ یا دجنی یا ہوزآن پر گرائے گئے تھے، گو یہ نام اب زمانہ موجودہ کے جغرافیوں میں نظر نہیں آتے مگر احادیث نبوی میں اس پہاڑ کے یہی نام آئے ہیں، جو ہزاروں برس پہلے انہیں ناموں سے مشہور ہوگا، بعض تاریخوں میں اس پہاڑ کا نام جبل بھی نظر سے گذرا ہے۔

حضرت حوا کو جدہ کی سرزمین نصیب ہوئی اور وہیں "خلد بریں" سے پھینکی گئیں، آدم و حوا کے رشتۂ زوجیت نے جدہ کو ہند کا سمدھیانہ بنا دیا اور ایک عرب کیا تمام دنیا کے انسانوں سے برادری قائم کرادی۔

جس سرزمین (ہند) کی فضیلت احادیث نبویؐ سے ثابت ہوتی ہو اور جس کو نانا کی پیغمبری زبان سے سُن سُن کر جناب امام حسین علیہ السلام نے یزیدیوں سے فرمایا ہو کہ "مجھے ہند چلے جانے دو" تو اسی سرزمین پر مسلمانوں کی کروڑوں آبادی کیوں نہ ہو جاتی، جب حسینؑ ایسے امام کو یقین تھا کہ ہند کی

سرزمین میں اُن کو پناہ مل سکیگی تو محمدؐ بن قاسم کا سندھ میں آنا، ہندیوں سے میل جول بڑھانا اور آدم کے مرز بوم سے وطن کی خوشبوؤں کا محسوس کرنا ایک فطری کشش تھی۔
عرب کے جس رسولؐ نے ہند کی فضیلت کو ظاہر فرمایا ہو، جس کے نواسے کو عالم اضطراب میں ہند یاد آیا ہو اور جس رسولؐ کے بھائی اور داماد نے ہند کے متعلق پیغمبرؐ کا یہ ارشاد سنایا ہو کہ:-

"ہوا سے زیادہ تر خوشبودار ہند کی سرزمین ہے جہاں آدم گرائے گئے پس وہاں کے درخت بہشت کی ہوا سے بس گئے۔"

ابن ابی حاتم نے ایک دوسری حدیث بھی جناب امیرؑ سے روایت کی ہے کہ:

"میدانوں میں سب سے بہتر انسان کے نزدیک مکہ کا میدان ہے اور ہند کی سرزمین کا وہ میدان جہاں آدمؑ نے نزول فرمایا۔"

صاحب "مواہب لدنیہ" نے لکھا ہے کہ:-

"نور محمدیؐ کا مطلع اور اُس فیض سرمدی کا مبدا، بالتحقیق ہندستان ہے جو نہایت معزز اور مظہر وجود عنصری و محل جلوۂ محمدی ہے اور یہ بزرگی و فضیلت ہندستان کے لئے کافی ہے۔"

حضرت زبیر نے فرمایا کہ:-

رسول خداؐ اُس نور سے پیدا ہوئے جس سے تیغ ہندی، جو خدا کی برہنہ تلواروں میں سے ایک ہے، روشنی حاصل کرتی ہے۔"

ایک حدیث یہ بھی ہے کہ:-

"جس طرح مکہ کو بزرگی بخشی گئی ہے اُسی طرح ایک پارۂ خاص ہندستان

کو بھی حاصل ہے"۔

ابن عباس کی روایت کو شیخ علی رومی نے اپنی کتاب "محاضرۃ الاوائل" اور "مسامرۃ الاواخر" میں نقل کیا ہے کہ :۔

"پہلے جس میں حکمت کے چشمے جاری ہوئے وہ ہند کی زمین ہے بعدہٗ حرم مکہ"۔

اس کی تفسیر میں شیخ نے یہ بھی بیان کیا ہے کہ :۔

"اول وہ جگہ جس میں کتابیں لکھی گئیں وہ ہند کی زمین ہے"۔

حضرت آدم نے سینکڑوں سفر مکہ کے پا پیادہ بھی کئے اور ہند کے جبیل پہ بیٹھکر سینکڑوں حج کئے، ہند سے مکہ جاتے تھے اور مکہ سے ہند واپس آتے تھے، جن کی ہند سے محبت اس سے ظاہر ہوتی ہے کہ گو انھوں نے ہند سے مکہ کو "گھر آنگن" بنالیا تھا اور سفر پر سفر معراج کی پلک جھپکانے والی مسافت کی طرح کرتے رہتے تھے مگر اُنھوں نے مکہ کو اپنا وطن ثانی بنانے کا کبھی تصور بھی نہ کیا بلکہ ہند ہی کی سرزمین کو اپنے وجود سے مفتخر فرماتے رہے اور یہ عمل اسلئے بھی کرتے رہے کہ اُنکی یہ پیدائش گاہ تھی، اُن کی اولاد کی ولادت گاہ تھی اور اُن کی نسل کے پھیلنے کا مقام تھا اور ان کے خالق نے بھی تو ہند ہی کی سرزمین کو آدم کیلئے پسند کیا تھا، جس سرزمین سے ہماری (انسان) تخلیق ہوئی ہو، جس سرزمین پر ہماری نشو و نما ہوئی ہو اور جس سرزمین نے ہمارے بے روح جسد کو اپنی آغوش میں لیا ہو، وہی سرزمین آدم کی اولاد کا اولین مرکز ہوسکتی ہے اور اس مرکزیت پر عالم کے انسان جتنا بھی فخر نہ کریں کم ہے جبھی تو پاکستانی اقبال کہہ گئے کہ :۔

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا

حضرت آدم نے اپنے عمل سے اپنی نسل کو "حُبّ الوطنی" کا سبق دیا اور "مستقل ہجرت" سے باز رہنے کی تلقین کی "گدائے مدینہ" ایسے مہاجر اس سے سبق لیں اور اپنی "رجعت قہقہری" سے اپنے پیدائشی وطن کو مزید رسوائیوں کا موجب نہ بنائیں جب کہ یہ ایک مسلّمہ حقیقت ہے کہ سرزمین حجاز "وطن فروشوں" کو پناہ نہیں دیا کرتی ہے۔

حدیثوں میں آیا ہے کہ آدم کا قد اسقدر لمبا تھا کہ جب وہ کھڑے ہوتے تھے تو اُن کا سر آسمان سے لگ جاتا تھا، جس سے وہ گنجے ہو گئے تھے، یہ حدیث معتبر ہو یا نہ ہو مگر آدم کی گنجی اُمت دنیا میں کافی پھیلی ہوئی ہے اور ایسے بھی گنجے موجود ہیں جن کے سر ہی گنجے نہیں ہیں بلکہ "عقل بھی گنجی" ہے اور یہ وہ فوقیت ہے جو باوا آدم کے حصہ میں نہ تھی۔

سیوطی نے اپنی کتاب "احسن الوسائل الی معرفۃ الاوائل" اور "ابن سنی" نے بھی ابن عباسؓ سے روایت کی ہے اور اپنی طب کی کتاب میں بھی لکھا ہے کہ:۔

حضرت آدم نے زمین پر گر کر جو سب سے پہلا ہندی پھل کھایا اُس کا نام حدیثوں میں "نبق" (نبقہ ایک بیر) آیا ہے اور اَمرود کا بھی ذکر کیا گیا ہے معلوم ہوتا ہے کہ الہ آبادی امرود کی لذت اُس سنگلدیپی درخت کی نسل کی وجہ سے ہے، جس کا بیج آدم کی اولاد نے الہ اباد تک پہنچا دیا تھا، حدیثوں میں بیر کو سدرہ کا میوہ کہا گیا ہے اور اسی وجہ سے "کلمہ طیبہ" کو "جوزالہند" سے تشبیہ دی گئی ہے میّت کو غسل دینے کے پانی میں بیری کے پتے ڈالے جاتے ہیں اور شمالی ہند میں تو

بیری ہی کے برگ سے قبروں کو بند کرتے ہیں۔

جب آدم دنیا میں آئے تو اُن کے بدن پر جنت کے پتوں کا ایک پیرہن بھی تھا، ہند کی ہوا اور تمازت آفتاب سے جب وہ پتے مرجھا مرجھا کر گرنے لگے اور چاروں طرف منتشر ہوئے تو خزاں رسیدہ پتوں کی خوشبوئیں اطراف میں پھیلنے لگیں اور جن سے خوشبودار چیزیں (عود۔ زنجبیل وغیرہ) پیدا ہونے لگیں اور جن جانوروں کو ان پیدا ہونے والے درختوں کے خوشبودار پتے چرنے کو مل گئے اُن کی نافوں سے مشک پیدا ہونے لگا اور جس پہاڑ پر "آس" (آس کو فارسی میں "مورد" کہتے ہیں، اسی کا پھل "حب الآس" ہے) کا درخت حضرت آدم نے نصب کیا تھا اُس کی ایک شاخ سے حضرت موسیٰؑ کا وہ عصا بنا جس کی معجز نمائی گوسالہ پرستوں نے دیکھی۔

آدم ہی کے آنسوؤں سے ہند میں چشمے بہے اور سمندر اُبلے، حضرت آدم کے ستر بالشت کے قدم کا نشان اب تک سنگلدیپ میں زیارت گاہ خاص و عام بنا ہوا ہے، یہی وہ سرزمین ہے جہاں حضرت آدم ہزاروں برس تک زندہ رہ کر پیوند خاک ہوئے اور یہیں سے اپنی نسل کو بڑھایا اور پھیلایا۔

حضرت نوحؑ کا ہند میں رہنا بھی احادیث سے ثابت ہے اور "کوہ بوذ" ہی پر نوحؑ نے اپنی کشتی درست کی تھی، ان کا تنور (جس سے طوفان اُٹھا تھا) ہند ہی کے آہن سے بنا تھا اور جب اس سے ہلاکت آفریں طوفان کوہ آتش فشاں کی طرح پھوٹا تھا تو اُس نے دوسری اقلیموں کو تو لپیٹ لیا اور اُس سیلاب میں بہا دیا مگر "ہندیوں" کو "ہندی لوہے" کی برکت نے محفوظ رکھا، جس سرزمین کا

وہاں اپنوں کی لاج رکھہ سکتا ہو تو کیا وہاں کے انسان اپنے ایسے انسانوں کی بربادیوں کا تماشا دیکھ سکتے ہیں اور اُن کے خون سے ہولی کھیل سکتے ہیں اور "مہندّی تلوار" جو ہند ہی کے لوہے سے بنتی ہے اُس کے آہن سے اپنے بھائیوں کے گلے کاٹ سکتے ہیں، ہند کے انسان اگر کسی انسانی سُنّت پر عمل نہیں کرسکتے تو نوحؑ کے تنور کی "فلزاتی" خاصیت پر کم از کم عمل کریں، اُس نے تو عالمگیر طوفان سے ہندیوں کو بچایا تھا، کیا وہ مقامی ہنگامہ خیزیوں کا اپنی خوش تدبیریوں سے سدباب نہیں کرسکتے؟

جس نبیؐ نے ہند کی فضیلت کو ظاہر کرکے اولادِ آدم کی سعادت مندیوں کا ثبوت دیا، اُسی نبیؐ نے یہ بھی فرمایا تھا کہ "علم اگر چین میں ملے تو وہاں سے اُس کو حاصل کرو" پیغمبرِ عربی کا مقصد یہ تھا کہ حرکت میں برکت کے علاوہ اس ربط ضبط سے انسانی برادری کا رشتہ مضبوط ہوتا رہے، وہ توحید کا پیام لیکر تو ضرور آئے تھے مگر انسانی تفریقوں میں پیغمبرانہ دماغ اُلجھا ہوا نہ تھا، وہ چینیوں کو بھی آدم کی اولاد جانتے تھے اور ہندیوں کو تو بدرجۂ اولیٰ آدم کی اولاد سمجھتے تھے اور ہند کو اپنے "ابوالاباء" (حضرت آدم) کا وطن جانکر اپنا بھی وطن سمجھتے تھے اور اپنے نور کو ہند ہی کا مبداء جانتے تھے، جبھی تو گیتا کے بہت کچھ مطالب کلام مجید سے ملتے جلتے ہیں اور کیوں نہ ملتے جلتے ہوں جب کہ عرب کے پیغمبرؑ ہوں یا ہند کے اوتار، دونوں کا مقصد تھا تو یہ کہ آدم کے صُلب سے پیدا ہونیوالے انسان سب انسان ہیں اور سب کا کُرۂ ارضی ہی وطن ہے مگر ابتدائی اور پیدائشی وطن تمام بنی آدم کا اپنے باپ (آدم) کے ہندی ہونیکے سبب سے ہند ہے، اسلئے دُنیا کے انسانوں کا "وطنی نعرہ" یہ ہونا چاہئے کہ؟

آدم کا جو وطن ہے، وہ ہے وطن ہمارا

جے ہند

آزادیٔ ہند کی دوسری سالگرہ کا علمی پیشکش

حیدرآباد میں فن کاری کے خزانے

(از)

مسٹر ایل، این گپتا، ایچ، سی، ایس، معتمد فینانس حکومت حیدرآباد

پریسیڈنٹ حیدرآباد آرٹ سوسائٹی

۱۵- اگسٹ سنہ ۱۹۴۹ء

فنکاری حسن کا مظہر ہے اور جیسا کہ شاعر کہتا ہے "حسین شے ہمیشہ کے لئے ایک مسرت ہے"۔ فنکاری مکان اور زمان کی قید قبول نہیں کرتی۔ عناصر کی چیرہ دستیاں یا خود انسان کی دراز دستیاں اُن خزانوں کو برباد کرنے میں کامیاب نہیں ہوئی ہیں جن کو انسان نے اپنے لطیف جذبات کے اظہار کے لئے مٹی، پتھر، یا پردے پر آئندہ نسلوں کے لئے بطور یادگار چھوڑا ہے۔ انسان اور انسان کے درمیان چاہے صدیاں گزر گئی ہوں یا زبردست فاصلے حائل ہوں یا نسل، رنگ اور مذہب کے کتنے ہی اختلافات کیوں نہ ہوں انسان کو انسان سے ملانے والی قوتوں میں فنکاری کا درجہ بہت بڑھا ہوا ہے۔ خواہ بابل کی قدیم یادگاریں ہوں، مصر کے اہرام ہوں، یونان اور روما کے مجسمے ہوں یا روما، پیرس اور لندن کے بڑے گرجے ہوں، ان سب میں وہی کشش ہے جو موہن جیوداڑو کی یادگاروں، اڑیسہ کے مندروں کی خوبصورت سنگتراشیوں یا مغلوں کے محلوں اور مقبروں کی نفیس تعمیروں میں ہے دیکھنے والوں پر وجیانگر اور ہامپیائی کے کھنڈروں کا ایک سا ہی اثر پیدا ہوتا ہے اگرچہ دونوں میں صدیوں کا فرق ہے۔ اجنٹا کے غاروں میں جو نقش و نگار ہیں وہ فن کاری کے دلدادوں کو اتنا ہی متاثر کرتے ہیں جتنا کہ روما کے بڑے گرجاؤں میں

مائکل انجلو اور ریفل کے کارنامے اگرچہ دونوں مقاموں کے درمیان ہزاروں میل کا فرق ہے۔

یہ افسوس کا مقام ہے کہ ریاست حیدرآباد میں جو مقامات دلچسپی کے ہیں ان کو کافی شہرت نہیں دی گئی۔ ورنہ شائد حسن اور فن کے تلاش کرنے والوں کو یہاں جنت نظر آتی۔ ریاست بھر میں جو بہت سی یادگاریں، مندر، مجسمے اور نقش و نگار بکھرے ہوئے ہیں اور نقاشی اور فنکاری کے جو مرقعے یہاں جمع ہیں اُن میں ہر زمانے کی ہندوستانی فنکاری کے بہترین نمونے موجود ہیں گوداوری ندی کے کناروں سے قریب ضلع ورنگل کے گھنے جنگلوں میں بمقام جانم پیٹ جو کھدائیاں ہوئی ہیں اُن میں تاریخی زمانے سے قبل کی چیزیں برآمد ہوئی ہیں جن سے قدیم انسان کی فنکاری کا پتہ چلتا ہے۔ اسی طرح کرکنڈہ میں جو کوئلہ کی کانوں کے مشہور ریلوے اسٹیشن کوتہ گوڑم سے تین میل دور ہے، اور کسی حد تک ریاست کی جنوب مغربی سرحد پر رائچور کے ضلع میں ماسکی کی کھدائیوں میں، اور حیدرآباد سے شولاپور جانے والی سڑک کے چالیسویں میل سے کوئی تین میل ہٹ کر کنداپور میں بھی ایسے ہی آثار پائے جاتے ہیں ان مقامات پر قبل تاریخی زمانے کی مٹی، پتھر اور تانبے کی جو چیزیں خوبصورت نقش و نگار کے ساتھ ملی ہیں اُن کو جمع کرنے اور محفوظ رکھنے میں حکومت حیدرآباد کے محکمۂ آثار قدیمہ نے بہت مفید کام کیا ہے۔ یہ سب چیزیں آثار قدیمہ کے طالب کے لئے بڑی قدر و قیمت رکھتی ہیں۔ اسی طرح فنکاری کے شائقین کے لئے بھی ان میں خوشی اور الہام کے خزانے ہیں۔ جو لوگ ان مقامات تک خود نہیں جا سکتے

وہ حیدرآباد کے عجائب خانے میں ان کے نمونے دیکھ سکتے ہیں۔ ماسکی کی کھدائیوں میں جہاں قبل تاریخ کے آثار ملے ہیں وہاں بدھوں کے زمانے کے اور آندھرا اور دیگر قدیم آثار بھی بکثرت ہیں۔ اس سلسلے میں خواجہ محمد احمد صاحب نے جو کام کیا ہے وہ قابل ستائش ہے۔

ایک زمانہ تھا کہ بدھ مت تقریباً اس پورے ذیلی براعظم کو اپنے روحانی اور اخلاقی اثر میں لئے ہوئے تھا جبکہ اس کے بانی اعظم کے نروان کو چند صدیاں ہی گزری تھیں۔ بعد کی صدیوں میں یہ مت ایسا غائب ہوا کہ گویا تھا ہی نہیں اس کے باوجود اس نے اپنے مہاتما کی یاد میں مقبروں کی صورت میں بہت سی یادگاریں چھوڑی ہیں۔ ایلورا اور اجنٹا میں بدھوں کے جو غار ہیں وہ اس کا زندہ ثبوت ہیں۔ ان غاروں میں نقاشی اور سنگتراشی کے جو شاہکار ہیں وہ دنیا بھر میں مشہور ہیں۔ ان غاروں کے چاروں طرف بہترین قدرتی منظر ہیں۔ اجنٹا کے جو غار ہیں وہ کہنا چاہئے کہ پہاڑیوں کے ایک جھنڈ کی گود میں واقع ہیں۔ ان ہی پہاڑیوں سے ایک خوبصورت جھرنے کی شکل میں اجنٹا ندی نکلتی ہے یہ غار اورنگ آباد کے مشہور شہر سے کوئی ۶۰ میل دور ہیں۔ بارش کے موسم کے بعد کوئی اگر ان کو دیکھنے جائے تو ایسا معلوم ہوگا کہ قدرت اور انسان دونوں نے ملکر ایک حسن کی دنیا پیدا کردی ہے جو ایسے شخص کی یادگار میں ہے جس کی زندگی دوسروں کے لئے تھی۔ ان غاروں میں جن سنگتراشوں اور نقاشوں نے کام کیا اُن کے پیش نظر انعام یا شہرت نہیں تھی بلکہ فن کی محبت اور گرو کی عقیدت نے ان کو اس پر آمادہ کیا۔ ان شاہکاروں کے جو فنکار تھے اُن کے

ناموں سے بھی کوئی واقف نہیں ہے۔ لیکن ان کو تسلی شاید اس بات سے ہوتی ہوگی کہ ان کے کارناموں سے ہزاروں ہزار دیکھنے والوں کے دلوں میں خوشی اور شادمانی پیدا ہوتی ہے چاہے دیکھنے والا کوئی بڑا گیانی ہو یا سیدھا سادھا دیہاتی جس کو رنگوں اور لکیروں کے اس خوشنما ملاپ میں مذہبی عقیدت اور اپنے دل کے دیوتا کی پرستش نظر آتی ہے۔ ان غاروں میں ۲۰۰ برس قبل مسیح سے لیکر آٹھویں صدی عیسوی میں ہرش کے زمانے تک کی ہزار برس کی کہانی آگئی ہے۔

ایلورا کے غار اورنگ آباد سے کوئی ۱۵ میل دور ہیں۔ ان غاروں میں ہندوستانی سنگتراشی کے تین دھارے نظر آتے ہیں یعنی بدھ مت، شیو اور وشنو مت اور جین مت۔ ان میں کیلاش مندر خاص ہے جس کو آٹھویں صدی میں راشٹر کٹ راجہ کرشن نے بنوایا تھا۔ یہ ایک ہی پتھر کا بنا ہوا زبردست مندر ہے۔ اسکا تصور ہمالیائی ہے جیسا کہ اس کے نام کیلاش سے ظاہر ہوتا ہے۔ اس میں ناچ اور راگ کو گویا پتھر پر کندہ کر دیا ہے۔ اس کی تمام تفصیلات کا مطالعہ ہمیشہ کے لئے ایک مسرت ہے۔

ریاست حیدرآباد میں جین مت کی سنگتراشی اور نقاشی کے نمونے کثرت سے پائے جاتے ہیں۔ پٹن چیرو حیدرآباد شہر سے کوئی ۲۰ میل دور ہے۔ یہ جینیوں کی پرستش کا بڑا مرکز تھا۔ حیدرآباد کے عجائب خانے میں یہاں کی بہت سی چیزیں رکھی گئی ہیں۔ ان میں ایک زبردست مجسمہ کوئی ۱۴ فٹ اونچا پرسوناتھ کا ہے جو جینیوں کا تر تھنکر ہے۔ اس کے علاوہ اور بھی کئی اہم جین مرکز تھے مثلاً ملکھیڑ، کپل ضلع رائچور اور ماہور ضلع عادل آباد۔ ان میں پتھر اور کانسے کی بہت سی جین

مورتیاں ہیں۔

گیارھویں، بارھویں اور تیرھویں صدی میں دکن میں ایک طرف ورنگل میں کاکیتوں کا راج تھا تو اورنگ آباد میں دیوگیری کے یادو خاندان کا۔ اور بیدر میں کلیانی کے چالوکیا راجدھانی کرتے تھے تو اناگوندی میں وجیانگر کے راجہ براجمان تھے۔ ان سب نے مندروں اور دوسری عمارتوں کی صورت میں یادگاریں چھوڑی ہیں جن میں سنگتراشی اور کندہ کاری کے بڑے عمدہ نمونے ہیں۔ ورنگل کا دیول ہزار ستون، دیول رامپا جو بہت خوشنما جنگل میں واقع ہے، قلعہ دیوگڑھ (دیوگیری) جواب دولت آباد کا قلعہ کہلاتا ہے، بیٹر کے دروازوں کے باہر درگاہ یہ سب ایسے مقامات ہیں کہ کوئی سیاح یا فن کاری کا کوئی دلدادہ ان کو دیکھے بغیر نہیں رہ سکتا بیٹر سے کوئی ۴۰ میل دور ماںجرانڈری نکلتی ہے۔ وہاں ایک دیول ہے چھوٹا سا جس کے تاریک گوشوں میں ایک بڑی قدیم مورتی ہے جو بہت خوبصورت ہے اور فن کی حیثیت سے بڑی قیمتی ہے۔ اس طرح ساری ریاست بھر میں چھوٹے چھوٹے دیول اور سنگتراشی کے ٹکڑے بکھرے ہوئے ہیں جو فنکاری کا بڑا عمدہ نمونہ ہیں۔

دکن کے مسلمان حکمرانوں نے بھی اپنی تہذیب کی یادگاریں قلعوں، مقبروں وغیرہ کی شکل میں چھوڑی ہیں۔ گلبرگہ، بیدر، اور گولکنڈہ میں جو مقبرے یا گنبد ہیں وہ بہمنی، بریدشاہی اور قطب شاہی بادشاہوں کی فن پرستی کی یاد دلاتے ہیں۔ اورنگ آباد میں بی بی کا مقبرہ گو آگرہ کے تاج محل کی ایک نقل ہے پھر بھی خاص چیز ہے

جدید زمانہ بھی اپنا حصہ ادا کرنے میں پیچھے نہیں رہا ہے۔ اس نے فنکاری کے خزانوں میں جو اضافہ کیا ہے وہ بجا طور پر اس پر فخر کر سکتا ہے۔ چنانچہ جامعہ عثمانیہ

(عثمانیہ یونیورسٹی) میں ریاست کے پرانے اور نئے طریقۂ تعمیر کو بڑی عمدگی سے سمو یا گیا ہے۔ اس کا سہرا نواب زین یار جنگ بہادر کے سر ہے۔

حیدرآباد نے آرائشی نقاشی اور رنگ کاری میں بھی بہت کچھ کیا ہے۔ "دکن اسکول آف آرٹ" کا زمانہ سولھویں سے انیسویں صدی تک سمجھا جاتا ہے۔ فنکاری کے بعض بہت اعلیٰ نمونے اس زمانے میں دنیا کے سامنے پیش کئے گئے۔ حیدرآباد کے عجائب خانے میں اور بعض خانگی ذخیروں میں یہ نمونے موجود ہیں۔ فن کاری کے طالبوں اور شائقوں کے لئے ان کی بڑی قدر و قیمت ہے۔

حیدرآباد کی دستکاری کے عمدہ نمونوں میں بیدر کا کام، کریمنگر کا چاندی کا کام اور نرمل کا لاکھ کا کام بہت نفیس ہیں۔

حیدرآباد نے جدید فنکار بھی پیدا کئے ہیں جن سے ہم یہ پوری امید کر سکتے ہیں کہ وہ جدید ہندوستان کے نقشۂ فن کاری میں حیدرآباد کو بھی ایک مقام دلائیں گے یہاں خان بہادر سید احمد صاحب کا ذکر کیا جا سکتا ہے جنھوں نے اجنٹا کے نقش و نگار کے چربے کچھ اس طرح اتارے ہیں کہ وہ خود فنکاری کا ایک حیرت انگیز نمونہ ہیں۔ نوجوان فنکاروں میں دوسکر، بھوشن اور دوسروں کے نام لئے جا سکتے ہیں جن سے بہت کچھ توقعات وابستہ ہیں۔

حیدرآباد کے محکمۂ آثار قدیمہ نے فن کی بڑی خدمت کی کہ اس نے تین نفیس جلدیں شائع کی ہیں جن میں اجنٹا کے نقش و نگار کے فوٹو ہیں۔ اسی طرح بیدر کی یادگاروں پر بھی ایک کتاب ہے۔ اور متعدد رسالے شائع کئے جن میں قبل تاریخی اور دوسری کھدائیوں کا اور قدیم آثار کا ذکر ہے۔ فاضل مشہور اور ماہر آثار قدیمہ

مسٹر غلام یزدانی کے ہم ممنون ہیں کہ انھوں نے ایسی کتابیں شائع کیں۔

حیدرآباد آہستہ آہستہ لیکن استقلال کے ساتھ بڑھتا چلا جا رہا ہے۔ اور یہاں فن کارانہ سرگرمیوں کو دوبارہ زندہ کرنے کی ایک تحریک جاری ہے تاکہ نوجوان اور ہونہار فنکاروں کی امداد اور ہمت افزائی ہو سکے۔

انجمن فنکاری حیدرآباد (حیدرآباد آرٹ سوسائٹی) کل ہند انجمن فنون لطیفہ و دستکاری کی علاقہ واری کمیٹی و جنرل کمیٹی آل انڈیا فائن آرٹ اینڈ کرافٹس سوسائٹی) گروہ تہذیبی (کلچرل گروپ) یہ سب کے سب اس تحریک کو پروان چڑھانے میں مصروف ہیں۔ تاکہ فنکاروں کے کام اور دوسری تہذیبی سرگرمیوں کے لئے ایک مرکز قائم ہو سکے۔ ایک خاص کام یہ ہو رہا ہے کہ حیدرآباد میں فنکاری کے جتنے بڑے بڑے نمونے ہیں ان سب کے فوٹو لئے جا رہے ہیں اور توقع ہے کہ یہ مجموعہ بہت قابل قدر ہو گا۔

مترجمہ:- محمد نصیر احمد عثمانی

شریمتی اروناچودھری
ملٹری گورنر ہز اکسلنسی جے۔ این چودھری کی شریک حیات

نیا ہند

آزادیٔ ہند کی دوسری سالگرہ کا علمی پیشکش

رام راج

(از)

پنڈت سُندر لال جی

۱۵۔ اگست سنہ ۱۹۴۹ء

۵۶
دیکھو صفحہ ؟؟

اس ملک میں اسلام اور ہندو دھرم کا ایک دوسرے سے ملن ہوئے بارہ سو برس سے اوپر بیت چکے۔ یہ خیال غلط ہے کہ اسلام مذہب یہاں اُتر پچھم کے خشکی کے راستے سے آیا۔ اسلام یہاں دکھن میں سمندر کے راستے آیا اور دکھن سے اُتر کی طرف بڑھا۔ یہاں تک کہ ہندوستان سے اسلام کے پرچارکوں نے افغانستان پہنچکر وہاں اسلام پھیلایا اور وہاں کے بدھ مذہب اور شیو مذہب کے ماننے والوں کو اسلام کی دیکشا دی۔

یہ عام خیال بھی غلط ہے کہ اس ملک میں اسلام مسلم حکومتوں کے سہارے پھیلا مسلمان بادشاہوں اور حملہ آوروں کے آنے سے صدیوں پہلے اسلام عرب سوداگروں اور مسلم فقیروں اور درویشوں کے ساتھ اس ملک میں آچکا تھا اور دکھن سے اُتر تک پھیل چکا تھا اور پھیلتا جا رہا تھا۔ اتہاس کے پڑھنے والوں کا خیال ہے کہ مسلم حکومتوں کے اس ملک میں قائم ہونے سے اسلام کے پھیلنے میں مدد ملنے کی جگہ اور دھکا پہنچا۔

اسلام اس ملک میں کیوں پھیلا؟ سچ یہ ہے کہ دنیا میں کوئی مذہب نیا مذہب نہیں ہوتا۔ مذہبی سچائیاں وہی بنیادی سچائیاں ہیں جو دنیا کے شروع سے چلی آ رہی ہیں۔ الگ الگ مہاپرشوں، اوتاروں، تیرتھنکروں اور پیغمبروں نے ان ہی سچائیوں کو اپنی اپنی زبان میں، اپنے اپنے ڈھنگ سے ظاہر کیا ہے۔ زمانے کا

آنریبل شری موہن لال سکسینہ وزیر امداد و بحالی حکومت ہند

آنریبل راجکماری امرت کور وزیر صحت عامہ حکومت ہند

آنریبل شری جگجیون رام وزیر عمال حکومت ہند

آنریبل شری کے۔ سی۔ نیوگی وزیر تجارت حکومت ہند

آنریبل شری کے۔سی نیوگی وزیر تجارت حکومت ہند

آنریبل حافظ محمد ابراہیم۔ وزیر تعمیرات عامہ

ہز ایکسلنسی ہومی پی مودی۔ گورنر (صوبجات متحدہ)

آنریبل شری لال بہادر شاستری، وزیر پولیس و ٹرانسپورٹ

آنریبل شری سمپورنانند۔ وزیر تعلیم و فنانس

آنریبل پی. یس. کمارسوامی راجہ وزیراعظم مدراس

آنریبل کے. مادھو مینن وزیر قانون و تعلیم مدراس

آنریبل بی گوپال ریڈی وزیر فینانس مدراس

آنریبل ڈاکٹر ٹی. یس. یس. راجن وزیر صحت عامہ مدراس

ہز ایکسلنسی شری منگل داس پکواسا
گورنر سی - پی و برار

آنریبل پرشوتم کاشی راو وزیر تعلیم

آنریبل سمبھا جی راو گوکھلے وزیر فینانس

آنریبل پنڈت روی شنکر شکلا وزیر اعظم سی۔پی و برار
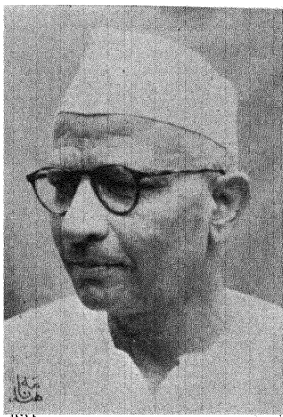
آنریبل ڈی۔کے۔مہتا وزیر صنعت و حرفت
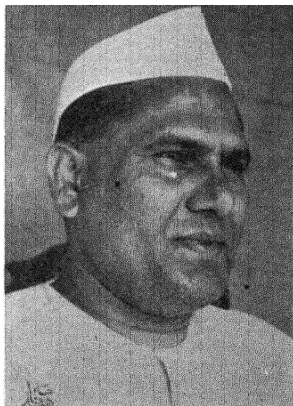
آنریبل رامیشور اگنی بھوج وزیر تعمیرات عامہ
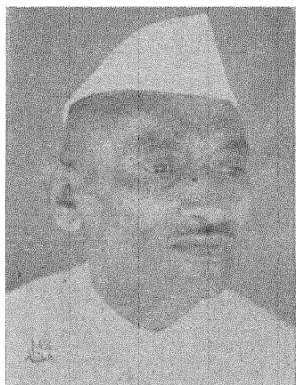
وزیر داخلہ

آنریبل آر مالکو ماکر ے
وزیر آبکاری

آنریبل ڈاکٹر وامن دار لاگے
وزیر صحت عامہ

هز اکسلنسی آصف علی
گورنر اڑیسہ

آنریبل ہری کرشن مہتاب
وزیر اعظم اڑیسہ

آنریبل وزیر اڑیسہ
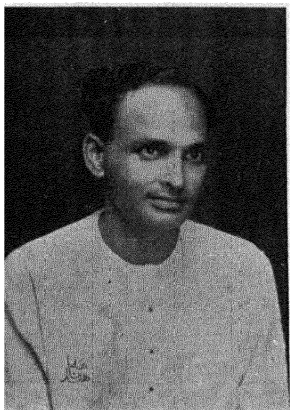
آنریبل وزیر اڑیسہ
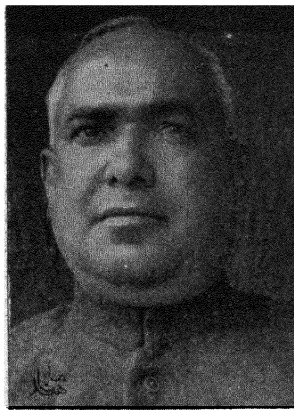
ھزاکسلنسی یم - یس - اینے گورنر بہار

آنریبل بی - جی - کھیر وزیراعظم بمبئی

آنریبل وزیر آڑیسہ
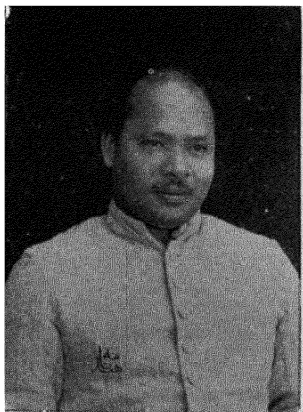
آنریبل ویرز آڑیسہ
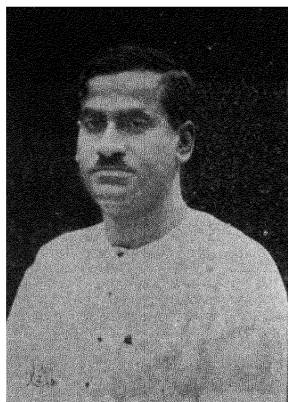
سر محمد عثمان سابق گورنر مدراس

سر مرزا اسمعیل سابق وزیر اعظم حیدرآباد

آنریبل وزیر اڑیسہ

مسٹر سید عبد القادر
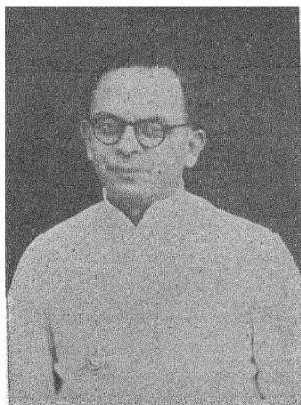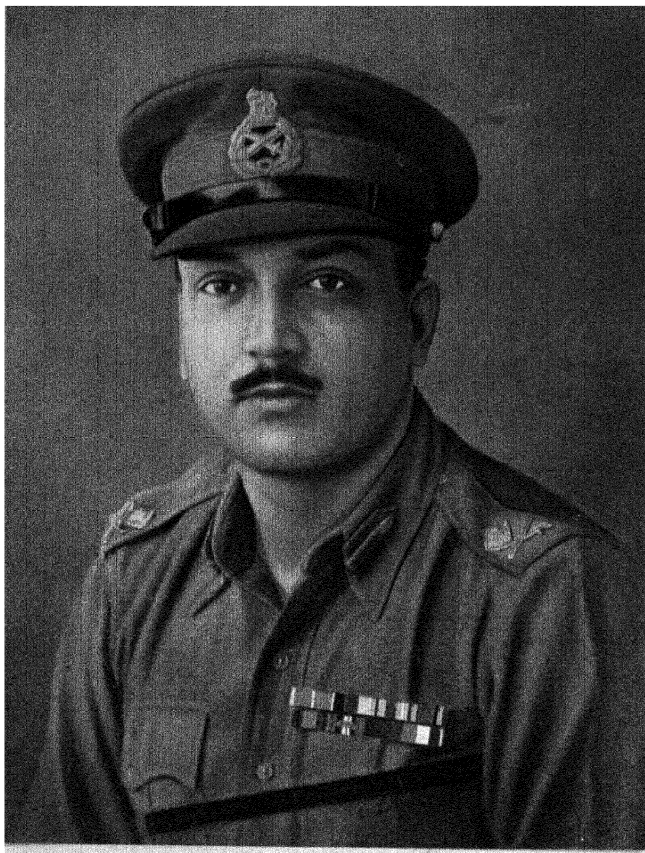
ہز اکسلنسی میجر جنرل جے۔ این۔ چودھری ملٹری گورنر (حیدرآباد)
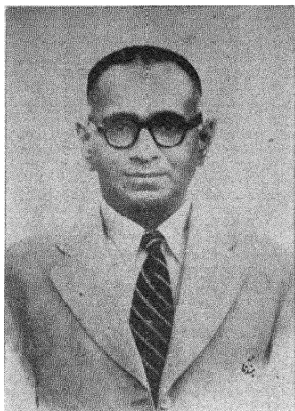
آنریبل ڈی - یس باکھلے
چیف سول ایڈمنسٹریٹر (حیدرآباد)

آنریبل راجہ ڈھونڈے راج بہادر (حیدرآباد)
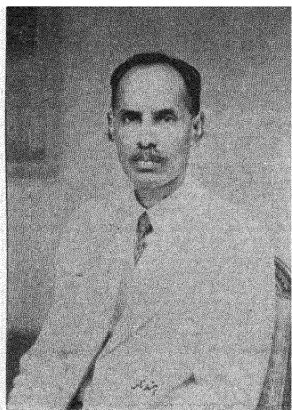
آنریبل سی - وی - یس راو (حیدرآباد)

آنریبل نواب زین یار جنگ بہادر (حیدرآباد)

م۔ شیشادری حیدرآباد

آنریبل کرشنا راو (حیدرآباد)

مسٹر یل - سی - جین آی . سی . یس
چیف سکریٹری حیدر آباد

مسٹر یل - ین - گپتا یم . سی . یس
فینانس سکریٹری حیدر آباد

مسٹر نقی بلگرامی
کامرس سکریٹری حیدر آباد

مسٹر شیوکمار لال یم . سی . یس
ہوم سکریٹری حیدر آباد

رائے برکت رائے
صدر المہام پائگاہ

مسٹر بی - بی - یس - جٹلے
انسپکٹر جنرل پولیس حیدرآباد

مسٹر ڈی - وی شری کھنڈے

مولوی علی اصغر بلگرامی

مسٹر را مچند ر نا یک
چیف جسٹس حید ر آبا ہا ئکورٹ

نواب مہدی نواز جنگ بہادر

معتمد مالگزاری حید ر آباد

را ئے د لسکھ رام
انکم ٹیکس کمیشنر حید ر آباد

مسٹر د ا مو د ھر ریڈی
ایڈیشنل سکریٹری فینانس
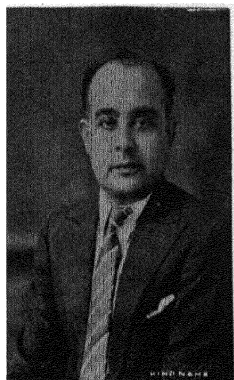
مسٹر یس - ین ریڈی
کمیشنر پولیس (حید ر آباد)

گرد و غبار جب جب اُن بنیادی سچائیوں کو ڈھک لیتا ہے اور پرانے مذہبوں کے ماننے والوں کے عمل اور ان کی مانتاؤں میں فرق پڑنے لگتا ہے تو دنیا کو کسی نہ کسی ایسے راہ دکھانے والے کی ضرورت ہوتی ہے جو پرانی شراب کو نئی بوتلوں میں بھر سکے۔ دلوں کی چنگاریوں پر سے جمی ہوئی راکھ کو ہٹا کر انہیں پھر سے روشن کر سکے۔ اسلام بھی اسی طرح کی ایک کوشش تھی۔ جس وقت اسلام اس ملک میں آیا ویدوں اور اُپنشدوں کے حقیقی پرانے دھرم کی شکل کافی بدل چکی تھی بلکہ بگڑ چکی تھی۔ کچھ اتہاس لکھنے والوں کی رائے میں تو وہ ہندو دھرم کا سب سے زیادہ گراوٹ کا وقت تھا۔ جات پات اور اونچ نیچ کے بھید حد کو پہنچے ہوئے تھے۔ مندروں کے کرم کانڈ اور پوجا پاٹھ بیحد پیچیدہ تھے۔ کسی شودر یا کسی اچھوت کا مرنا، جینا، شادی بیاہ یا کوئی اور رسم بنا اس براہمن پُروہت کے نہیں ہو سکتی تھی جو اُس شودر کے سائے تک سے پرہیز کرتا تھا۔ ملک کے کروڑوں انسانوں کے ساتھ لفظی معنوں میں جانوروں سے بدتر برتاؤ ہوتا تھا۔ اسلام نے آکر ایکبارگی ان سب بُرے رواجوں کو ختم کر دیا۔ سب انسان برابر۔ نہ کوئی جات اور نہ پات۔ نہ کوئی اونچ اور نہ کوئی نیچ۔ چھوٹے سے چھوٹا مہتر یا چمار بھی اسلام کے دائرے میں داخل ہوتے ہی بڑے سے بڑے عالم مسلمان کے ساتھ بیٹھ کر ایک دسترخوان پر کھانا کھا سکتا تھا۔ انسان اور اس کے اللہ کے بیچ میں کسی پنڈے یا پروہت کی ضرورت نہ تھی۔ ہر پڑھا لکھا شخص نکاح پڑھا سکتا تھا اور کوئی بھی مسلمان جو نماز کا طریقہ جانتا ہوا اپنے پیچھے دوسروں کو نماز پڑھا سکتا تھا۔ مندروں کے پیچیدہ کرم کانڈ اور پوجا پاٹھ ایک دم غیر ضروری ہو جاتے تھے۔ سیدھے سادے اصول۔ ایک نراکار ایشور اور اس کے پیغمبر کو ماننا

۷۷
دیکھو صفحہ ۱۵

اور نیک عمل کرنا۔ اسلام کا یہی سیدھا سادہ روپ اور اُس کا یہی انسانی بھائی چارہ تھا، جس کی وجہ سے دوسرے ملکوں کی طرح اس ملک کے بھی لاکھوں انسان اپنے اُن پرانے مذہبوں کو چھوڑ کر، جن کی شکلیں بگڑ چکی تھیں، اسلام کے دائرے میں داخل ہوتے چلے گئے۔ یہ ایک تاریخی سچائی ہے کہ سب سے پہلے بہت کر وہی لوگ اسلام کے دائرے میں داخل ہوئے جو ہندوؤں میں چھوٹی جاتوں کے لوگ سمجھے جاتے تھے۔ اور جن کے ساتھ ہر طرح کا بُرا برتاؤ جائز سمجھا جاتا تھا۔ ابھی تک اس ملک کے مسلمانوں میں سب سے بڑی تعداد کپڑا بننے والوں کی ہے جنہیں اس دن تک ہندوؤں میں اچھوت مانا جاتا ہے۔ ساتویں صدی عیسوی سے ہی سینکڑوں مسلمان فقیر اور درویش سمندر کے راستے سے آکر اس ملک کے الگ الگ حصوں میں بس گئے۔ یہ لوگ عام طور پر اپنی علمیت اور اپنے نیک چلن دونوں کے لئے مشہور ہوتے تھے۔ ہزاروں اور لاکھوں لوگ اُن کی نیکی، پاکی اور روحانیت سے کھچ کر اُن کے چاروں طرف جمع ہو جاتے تھے۔ اُن کے درباروں میں انسانی برابری کا برتاؤ لوگوں پر جادو کا کام کرتا تھا۔ تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ اکثر لوگ اُن سے درخواست کرتے تھے کہ ہمیں مسلمان کر لیجئے اور وہ یہ کہہ کر انکار کرتے تھے کہ ہمارا کام 'اسلام' کی تبلیغ کرنا نہیں ہے 'ایمان' کی تبلیغ کرنا ہے۔ اس ملک میں اسلام زیادہ تر انہیں فقیروں اور درویشوں کے اثر سے پھیلا۔ بادشاہوں یا کسی انجمن تبلیغ اسلام کے ممبروں کے اثر سے نہیں۔ تاریخ سے یہ بھی ظاہر ہے کہ ہندو راجاؤں کے بڑے دل اور اُنکی رواداری نے بھی اسلام کے پھیلنے میں بہت بڑی مدد دی۔ تفصیلی گھٹناؤں میں جانے کا یہ موقع نہیں ہے اسلام پھیلا۔ جہاں تک آپسی لڑائی کی بات ہے، جیسے ہندو ہندو لڑے،

مسلمان مسلمان لڑے، ویسے ہی کبھی کبھی ہندو مسلمان بھی لڑے۔ پر عام طور پر انگریزوں کے آنے تک اور اُس کے بہت دنوں بعد تک بھی اِس ملک کے ایک ایک شہر، ایک ایک گلی اور ایک ایک گاؤں میں ہندو اور مسلمان بھلے آدمیوں اور اچھے پڑوسیوں کی طرح رِل مِل کر محبت سے رہتے رہے۔ اس کی مثالیں دینا فضول ہے۔ ۱۹۳۱ء میں جب کانپور کا دنگا ہوا، جس میں قریب دو سو ہندو اور دو سو مسلمان مارے گئے اور اس سے قریب تگنے زخمی ہوئے، تو یہ سچائی کے ساتھ کہا گیا کہ اس ملک کے اندر ہندو مسلم سمبندھ کے قریب بارہ سو (۱۲۰۰) برس کے اتہاس میں وہ اپنی قسم کا پہلا واقعہ تھا۔ اُس کے ۱۶ برس بعد ۱۹۴۷ء میں جو کچھ ہوا وہ تو دنیا کی تاریخ میں اپنی قسم کا پہلا واقعہ ہے۔ یہ سب نتیجہ ہے یورپ کی سیاست اور خاص کر ہمارے پڑھے لکھے لوگوں کے کیرکٹر کی گراوٹ، اِن دونوں کے میل کا۔ ہماری غلامی کے جانے کے ساتھ ساتھ یہ ایک بُرا خواب تھا، جس سے ہم آہستہ آہستہ باہر نکل رہے ہیں۔ بھگوان کی دیا سے ہندو اور مسلمان دونوں کی آنکھیں کھلتی جا رہی ہیں۔ اور ہمیں پکا یقین ہے کہ یہ بُرا خواب بہت دیر تک نہیں رہ سکتا۔ مہاتما گاندھی کی قربانی اس معاملے میں ہماری سب سے بڑی مددگار ثابت ہو چکی ہے اور ہے۔ ظاہر ہے کہ کوئی ملک اُس وقت تک مہذب نہیں کہلا سکتا جب تک کہ اُس میں اپنے اپنے ریت رواج کو پالنے اور اپنے اپنے طریقے سے اپنے ایشور اللہ کو پوجنے کی سب کو پوری آزادی نہ ہو۔ یہی مہاتما گاندھی کی شہادت کا سب سے بڑا سبق ہے۔ اِس کے خلاف جتنے خیال، جتنی سبھا سوسائٹیاں، جتنی خواہشیں اور جتنی کوششیں ہیں وہ سب ادھرم، لامذہبی، بےدینی اور پاپ ہیں۔

مہاتما گاندھی رام راج قائم کرنا چاہتے تھے۔ رام راج کوئی بُری چیز نہیں گوسوامی تلسی داس جی نے اپنی رامائن میں رام راج کی جو تصویر کھینچی ہے، اس پر دنیا کے کسی بھی مذہب والے کو اعتراض نہیں ہو سکتا۔ گوسوامی جی کے بیان کا نچوڑ یہی ہے کہ جس راج میں کسی کو بھی کسی طرح کا دُکھ نہ ہو اور کسی کے ساتھ انیائے نہ ہو، وہی رام راج ہے۔ اُن کے رام راج میں کسی بھی ایک طرح کے ریت رواج یا پوجا بندگی کے ایک طریقے کو سب کے لئے ماننا نہیں بتایا گیا۔

اسی طرح سچی اسلامی حکومت بھی قرآن اور رسول کریم کے عمل کے مطابق وہی ہے جس میں مذہب کے معاملے میں کسی کے ساتھ کسی طرح کی زبردستی نہ ہو۔ مثالیں دے کر میں اِس مضمون کو لمبا نہیں کرنا چاہتا۔ محمد صاحب کے دوسرے مذہب والوں کے ساتھ عہد نامے ابھی تک موجود ہیں۔ جو چاہیں، اُنہیں پڑھ لیں۔ خلفاء راشدین کے زمانے کی اَن گنت مثالیں اس کی مل سکتی ہیں۔ میں صرف ایک مشہور مثال سے اس مضمون کو ختم کروں گا:۔

یہ واقعہ 'بُت کی ناک' کے واقعہ کے نام سے مشہور ہے۔ خلیفہ کے ماتحت ایک صوبے میں کسی مسلمان نے، کسی ایسے بُت کی، جسے وہاں کی رعایا کے کچھ لوگ پُوجتے تھے، چپکے سے ناک توڑ ڈالی۔ اُس بت کے پوجنے والوں نے وہاں کے عرب حاکم سے شکایت کی۔ حاکم نے خلیفہ سے پچھوایا کہ کیا کرنا چاہیئے؟ خلیفہ نے جواب دیا، اعلان کر دو کہ جس مسلمان نے بُت کی ناک کاٹی ہے وہ کھلے سامنے آکر اپنے گناہ کو قبول کرے اور اُس بت کے پوجنے والوں سے کہو کہ وہ سزا کے طور پر بُت کی ناک کے بدلے میں اُس مسلمان کی ناک کاٹ لیں۔ اِس کے بعد سرکاری خرچ پر بُت کی مرمت

کرادو۔ مسلمان حاکم نے اسی کے مطابق اعلان کرادیا۔ لیکن مجرم نے اپنے کو ظاہر نہ کیا۔ حاکم نے پھر خلیفہ سے پوچھا کہ کیا کرنا چاہئے؟ خلیفہ کا جواب آیا کہ اگر وہ آدمی اپنے کو ظاہر نہیں کرتا تو صوبے کے حاکم کو اُس آدمی کی جگہ اپنی ناک کٹوا دینی چاہئے، ورنہ خود خلیفہ کو ایک مسلمان کے اس گناہ کا کفارہ یعنی پرائشچت کرنا پڑے گا۔ حاکم نے اپنے صوبے میں اسی کے مطابق اعلان کرادیا۔ جب مسلمان حاکم اپنی ناک کٹوانے کو تیار ہوگیا تو اصلی مجرم گھبرا کر سامنے آگیا۔ بُت کے پوجنے والوں سے کہا گیا کہ اُس کی ناک کاٹ لیں۔ بُت کے اُن پوجنے والوں کی التجا پر اور ضد کرنے پر بڑی مشکل سے خلیفہ نے یہ منظور کیا کہ اِس مرتبہ مجرم کو معاف کردیا جائے۔ بُت کی مرمت سرکاری خزانے سے کرادی گئی۔

یہ تھی اسلام کی سچی اسپرٹ۔ یہی ہے سچے اسلامی راج کی تصویر۔ یہی رام راج ہے اور یہی ہے حکومت الٰہی۔ اِس کے خلاف جو حرکت بھی کسی مسلمان بادشاہ یا کسی دوسرے مسلمان نے کی ہو یا سوچی ہو وہ اسلام کی اسپرٹ کے خلاف، بے دینی اور گناہ ہے۔

اس وقت ہندو اور مسلمان دونوں غیروں کی چالوں اور اُن کے پڑھائے ہوئے پاٹھوں کے اثر میں بہت کرکے اِسی بے دینی اور ادھرم میں پھنسے ہوئے ہیں۔ اس گناہ، اِس پاپ اور اس بُرے خواب سے باہر نکل کر سچے ہندو، سچے مسلمان، سچے دھرمی اور سچے مومن بننے میں ہی ہماری اور ہمارے ملک کی نجات ہے۔ یہی 'سیکولر گورنمنٹ' کے اصلی معنی ہیں۔ ہمیں پورا بھروسہ ہے کہ ہماری اس وقت کی سب مصیبتیں موسمی بادلوں کی طرح چھٹ رہی ہیں اور چھٹیں گی اور

سچّے دین دھرم، سچّے اخلاق، سچّی انسانیت، سچّی محبت، سچّی رواداری اور سچّے میل ملاپ کا سورج پھر سے اِس ملک کے ایک ایک شہر، ایک ایک گلی، ایک ایک گاؤں اور ایک ایک جھونپڑے پر اپنے پورے تیج کے ساتھ چمکیگا۔ کبھی ہندوستان خود سیدھے راستے پر پڑ کر دنیا کی گمراہ قوموں کو انسانی بہبودی کی سچی راہ دکھا سکیگا

شریمتی لیلا وتی منشی
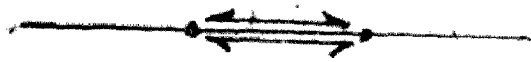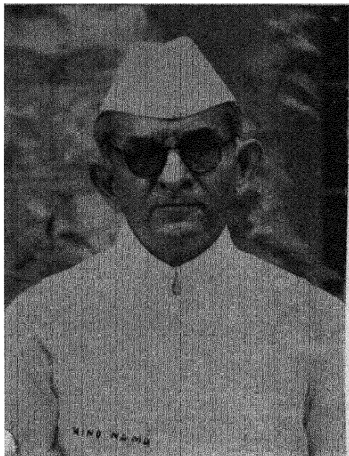
شری کے - یم منشی
سابق ایجنٹ جنرل حیدرآباد منجانب حکومت ہند

مطبوعہ ہما

آزادیٔ ہند کی دوسری سالگرہ کا علمی پیشکش

ہندوستان کے نام

(از)

علامہ حکیم سید شمس اللہ قادری ماہر علوم آثار قدیمہ

۱۵ اگست سنہ ۱۹۴۹ء

ہند اور ہندو کے الفاظ نہ تو ویدیں ملتے ہیں۔ نہ دھرم شاستر میں اور نہ سنسکرت کے کلاسیکل لٹریچر میں۔ اس سے ظاہر ہے کہ ہندو نہ تو اپنے مسکن کو ہند کہتے تھے اور نہ اپنے آپ کو ہندو۔ بلکہ ایرانیوں نے ان کے لئے یہ نام تجویز کئے تھے۔ جناب مسیح کی ولادت سے ہزار سال پہلے ایرانیوں میں ہندوستان کے لئے ہندو اور ہندوستانیوں کے لئے ہندوئی کے الفاظ رائج ہو چکے تھے۔ ساسانیوں کے عہد میں پہلوی میں باشندوں کے لئے ہندوک اور ملک کے لئے ہندوکان کے الفاظ استعمال ہوا کرتے تھے۔ اور پہلوی کے اس ہندوکان نے اسلامی فارسی میں ہندوستان کی موجودہ شکل اختیار کی ہے۔

اوستا میں چار مختلف مقامات پر ہندو کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ اور اس کو رو وارنگ اور فراخ کرت کے قرب وجوار کا ملک بتایا ہے۔ ارنگ اور فراخ کرت دونوں افسانوی دور سے تعلق رکھنے والے نام ہیں اور ان کے محل وقوع کے تعین کرنے میں مستشرقین نے اختلاف کیا ہے۔ تاہم بہت سے دلائل ایسے موجود ہیں جنکی بنا پر ان کو انڈس اور بحر ہند قرار دے سکتے ہیں۔

دار یوس اعظم نے جو جناب مسیح سے پہلے ۵۳۲ء سے ۴۸۶ء تک حکمران رہا ہے۔ نقش رستم کے کتبہ میں اپنے مقبوضات اور باجگزار ممالک کے تیس نام شمار کئے ہیں۔ اور اس سلسلہ میں بارہویں نمبر پہ ہندوستان کا نام درج ہے اور میخی حروف میں اس کا تلفظ

ہیدوش لکھا ہے اور اس کا محل وقوع گندھار کے متصل بتایا ہے جس کو آجکل قندہار کہتے ہیں۔ اور اس سے ثابت ہے کہ داریوس اعظم کے زمانہ میں ہندوستان اس خطہ کو کہتے تھے جو موجودہ عہد میں سندھ اور پنجاب کے نام سے موسوم ہے۔

داریوس اعظم کا فرزند خشیارشا جناب مسیح سے پہلے ۴۸۶ء اور ۴۶۶ء کے مابین برسر حکومت رہا ہے۔ اس کا نام ہیرو ڈوٹس نے زرکسیر بتایا ہے اور صحف انبیا میں اخسویرس لکھا ہے۔ آستھر کے صحیفہ میں اس کی وسعت سلطنت کا تذکرہ کرتے ہوئے مشرقی جانب ہندوستان کو بتایا ہے اور اس کے عبرانی متن میں اس کا نام ہیدو لکھا ہے جو بالکل داریوس اعظم کے کتبہ کے مطابق ہے۔ اور اس سے ظاہر ہے کہ جناب مسیح سے قریباً پانسو سال پہلے ایرانیوں کی طرح عبرانی بھی ہندوستان کو ہیدو کہا کرتے تھے۔

سکندر اعظم کے زمانہ میں چین میں ہان خاندان کی حکومت تھی۔ اس خاندان کا آخیر فرمانروا جناب مسیح سے دو سو سال پہلے گزرا ہے۔ اس کے بعض تحریری وثائق سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے زمانہ میں چینی ہندوستان کو ہنیٹو کہتے تھے۔ اور یہ بلا شبہ ایرانی لفظ ہندو کا چینی تلفظ ہے۔

عبرانیوں اور چینیوں کی طرح یونانیوں کو بھی ایرانیوں کے توسط سے ہندوستان کا علم ہوا ہے اور یونان کا سب سے پہلا مصنف جس نے ہندوستان کا تذکرہ کیا ہے وہ ہیکاٹاکوس (۴۷۶ء) ہے جو داریوس اعظم کا معاصر اور جناب مسیح سے قریباً پانسو سال پہلے گزرا ہے۔ اس کے بعد ہیرو ڈوٹس (۴۸۴ء ۴۳۱ء) نے ہندوستان کے حالات کسی قدر تفصیل سے بیان کئے ہیں۔ ان دونوں نے ہندوستان کیلئے انڈو کا لفظ استعمال کیا ہے جو حرف بحرف اوستا کے ہندو کی یونانی شکل ہے۔ اور انکے بعد

دوسرے یونانی مصنفین نے اس ایک لفظ اینڈو میں قدرے تصرف و ترمیم کرکے ہندوستان کے باشندوں کیلئے انڈوئی اور ملک کے لئے انڈیکے اور دریا کے لئے انڈس کے الفاظ وضع کئے ہیں۔ ٹالمی نے انڈیا سے ایشیا کا وہ تمام جنوب مغربی ملک مراد لیا ہے۔ جو کوہستان ہمالیہ کے نیچے واقع ہے اور جس کو آجکل ایسٹ انڈیز کہتے ہیں اور اس میں ہندوستان، برہما، کوچین، چینا، سیام، ملایا، اور زیرباد کے تمام جزیرے شامل ہیں۔

مغربی شام کے کلیسائی مصنف جو ظہور اسلام سے پہلے قرون وسطیٰ میں گزرے ہیں حبش اور جنوبی عرب کو ہند کہا کرتے تھے۔ یرمیا نبی کے صحیفہ میں ایک آیت ہے۔ "آیا حبشی جلد خود را و یا ببر بیسہ ہائش را تبدیل تواند کرد" اس میں حبشی کے لئے عبرانی متن میں کوش اور سپتواجنٹ میں اتھیوپی آیا ہے۔ اور سریانی زبان میں اس کا ترجمہ ہندی کیا گیا ہے ایک سریانی مصنف ایپی فانیوس نے جو ۳۶۷ء میں کونسٹنٹیا کا بشپ تھا۔ سنہ ۳۲۰ء میں ہندوستان کی نو سلطنتوں کا ذکر کرتے ہوئے ان میں سے ایک کا نام حمیر بتایا ہے جو یمن کا مشہور فرمانروا خاندان ہے۔

ماہنامہ

آزادیٔ ہند کی دوسری سالگرہ کا علمی پیشکش

مہاتما گاندھی

از

پروفیسر سی ہنمنت راؤ (ایم اے ۔ ایل ۔ ٹی)

۱۵ اگست سنہ ۱۹۴۹ء

جب ہمارے اس زمانے کی تاریخ لکھی جائے گی تو مہاتما گاندھی کو نہ صرف ہندوستان کا بلکہ نسل انسانی کا سب سے بڑا نجات دہندہ تسلیم کیا جائے گا۔ ساری دنیا نے ان کو خراج عقیدت پیش کیا اور ایسا خراج کہ ہماری یاد میں کسی کو نہیں پیش کیا گیا۔ ۱۵/اگست ۱۹۴۷ء کو ہندوستان بھر میں آزادی کے حاصل ہو جانے پر مثالی طور پر خوشیاں منائی گئیں۔ اس وقت کسی کو توقع نہ تھی کہ چھ مہینے کے اندر اس کارنامے کو انجام دینے والا ہم میں باقی نہ رہے گا۔ جب ہم ان کی زندگی اور اُن کی ناگہانی موت پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمارے سامنے سقراط اور یسوع مسیح کے نقشے پھر جاتے ہیں ہم نے اپنے زمانے میں ایک شخص کو اسی گوشت اور پوست کے ساتھ اٹھہتر برس تک رہتے دیکھا یہ عمر بہت کم لوگوں کو نصیب ہوتی ہے اور اس شخص کو کمال کی اس بلندی تک پہنچتے دیکھا جس نے اس کو لافانی کر دیا ہے۔ اسی کمال نے ان کو مہاتما کا خطاب دلوایا مہاتما سے مطلب روح کامل ہے۔ یہ کمال انھوں نے ایک طویل عرصہ تک جسم اور جان کو تربیت دیکر حاصل کیا۔ اپنے مشہور معاصر رابندرا ناتھ ٹیگور اور ہندوستان کے احیا کے پیشرو راجہ رام موہن رائے کی طرح مہاتما گاندھی نے انفرادی طور پر کمال حاصل کیا۔ اس کمال کی خصوصیت یہ ہے کہ ایک مرتبہ حاصل ہو جانیکے بعد اس کی بدولت انسانیت کے ایک ہونے کا دھیان اور گیان پیدا ہو جاتا ہے۔ اور انسانیت ہی کیا بلکہ ساری کائنات کا

ایک ہونا نظر آنے لگتا ہے۔ قدیم ہندوستان کے رشی اور منی اسی بات پر بہت زور دیتے رہے ہیں۔ رابندرا ناتھ ٹیگور کہتے ہیں کہ ہمارے مہاتما وہ لوگ ہیں جو انسانیت کی محبت میں اپنی ذات کو تج کر روح کی حقیقت کو ظاہر کرتے ہیں۔ پریم کی اس سیوا میں اُن کو تہمت، ایذارسانی، محتاجی حتیٰ کہ موت تک سے سابقہ پڑتا ہے۔ ان کی زندگی روح کی زندگی ہوتی ہے نہ کہ نفس کی۔ اس طرح انسانیت کی آخری سچائی کا وہ ثبوت بہم پہنچاتے ہیں۔

اپنشد کی کہاوتوں میں سے ایک کہاوت ایسا دسیا اپنشد کے پہلے گیت میں ہے۔ اس میں تمام خلقت کے ایک ہونے پر زور دیا گیا ہے۔ رابندرا ناتھ ٹیگور اور مہاتما گاندھی دونوں کی زندگیوں پر اس کہاوت کا بہت بڑا اثر پڑا ہے۔ اس میں یہ ہدایت کی گئی ہے کہ ہم کو اپنے نفس پر قابو حاصل کرنے کے لئے گھمنڈ، لالچ اور ڈر کو چھوڑ دینا چاہئیے۔ کیونکہ دنیا دی نقصان اور بدن کی موت سے سچائی اور آتما کی بڑائی میں کوئی کمی واقع نہیں ہوتی۔

جن کتابوں نے مہاتما گاندھی پر طالب علمی ہی کے زمانے سے زیادہ اثر ڈالا وہ یہ ہیں:-

آسمانی گیت The Song Celestial از ایڈون آرنلڈ

ایشیا پرکاش The light of Asia

عہد جدید The New Testament بالخصوص

پہاڑی وعظ The Sermon on the Mount

تلسی داس کی راماین

خدائی حکومت تمہارے اندر The Kingdom of God is within you از ٹالسٹائے

تادم آخر Unto this Last از رسکن

مشاہیر اور مشاہیر پرستی Heroes & Hero Worship از کارلائل

ایک گجراتی نظم میں ایک شعر ہے جس میں کہا گیا ہے کہ "اصلی شریف وہ ہیں جو سب انسانوں کو ایک جانتے ہیں اور جو خوشی کے ساتھ بدی کا بدلہ نیکی سے دیتے ہیں"۔ اس نے مہاتما گاندھی کے دل اور دماغ پر ایسا اثر کیا کہ وہ ان کی زندگی کا رہنما اصول بن گیا۔

ان کی زندگی کے بیس برس جنوبی افریقہ میں گزرے جہاں انھوں نے ہندوستانیوں کے حقوق کا جھنڈا بلند کیا۔ اس میں کسی مذہب و ملت کی خصوصیت نہ تھی۔ چنانچہ ہندو، مسلمان، پارسی، عیسائی سب کے سب بھارت ماتا کے سپوتوں کی طرح اُن کے جھنڈے کے نیچے جمع ہو گئے۔ پریٹوریا میں ان کی پہلی پبلک تقریر ہوئی۔ انھوں نے اپنے سننے والوں سے کہا کہ وہ ہندو، مسلمان، عیسائی، گجراتی، پنجابی اور مدراسی کے فرق کو بھول جائیں۔ اپنے عیسائی دوستوں کی وجہ سے انجیل اور مسلمان دوستوں کی وجہ سے وہ قرآن سے روشناس ہوئے۔ سادہ زندگی اور دوسروں کی خدمت ان کا اوڑھنا بچھونا ہو گیا۔ انھوں نے ایک آشرم قائم کیا جس کا نام فینکس سٹلمنٹ Phoenix Settlement وہ گویا ایک چھوٹا سا ہندوستان تھا جہاں نسل، مذہب یا طبقہ کا کوئی فرق نہ تھا۔ آج سے کوئی ۴۰ برس ادھر ۱۹۰۶ء اور ۱۹۱۴ء کے درمیان انھوں نے "اہمسا" کو پہلی مرتبہ چلایا۔ ان کی کامیابی کا بڑا سبب یہ تھا کہ ہندوستانی جماعت پوری طور پر اُن کے ساتھ تھی۔

ہندو، مسلمان اور عیسائی اپنے لیڈر کو نسل، مذہب یا درجہ کی تمام بندشوں سے بالاتر سمجھتے تھے۔

سنہ ۱۹۱۰ء میں روسی مفکر ٹالسٹائے نے مہاتما گاندھی کو لکھا "میں برادرانہ طور پر آپ کا خیر مقدم کرتا ہوں اور آپ سے خط و کتابت کرکے مجھے بہت خوشی ہوئی"۔ اس وقت ٹالسٹائے کی عمر ۸۲ برس کی تھی۔ اس نے مقاومت مجہول یا اہمسا کو پریم کی تعلیم قرار دیا جو یسوع مسیحؑ بہت صاف طور سے بیان کرگئے ہیں۔

جنوبی افریقہ میں ہندوستانی حقوق کی حمایت میں جو بے غرضانہ لڑائی مہاتما گاندھی نے لڑی اس نے دنیا میں انہیں ایسے مقام تک پہنچا دیا جہاں کوئی نہ پہنچا تھا۔ لطف یہ ہے کہ جنوبی افریقہ کے برطانوی پادری ریورنڈ ڈوک نے ہی سب سے پہلے دنیا کی توجہ اس طرف مبذول کرائی۔ چنانچہ انھوں نے کہا "میں سوال کرتا ہوں کہ کیا کوئی مذہب و ملت ایسا ہے جو اتنا بڑا جس میں یہ سما سکیں۔ یہودی، عیسائی، ہندو اور مسلمان، پارسی، بدھ اور چینی سب کے لئے اُن کے دل میں جگہ ہے۔ وہ سب کو ایک باپ کی اولاد سمجھتے ہیں۔ مشترک مصیبتوں نے ان کو ایک ایسی برادری بنا دیا ہے جس میں مذہب و ملت کے فرق سب بھول گئے ہیں"۔

رابندرا ناتھ ٹیگور کا بھی یہی خیال تھا جس کو انھوں نے اپنے بہترین ناول "گورا" میں پیش کیا ہے جس میں وہ کہتے ہیں: "مجھے اس معبود کا منتر بتاؤ جو ہندو، مسلمان، عیسائی اور برہمو سماج سب کے لئے ہو، جس کے مندر کے دروازے کسی شخص کے لئے بند نہ ہوں چاہے وہ کسی ذات کا ہو۔ اور جو نہ صرف ہندوؤں کا بھگوان ہے بلکہ سارے ہندوستان کا خدا ہے"۔

جب مہاتما گاندھی جنوبی افریقہ چھوڑ کر بالآخر ہندوستان آ گئے تو اس وقت گوپال کرشن گوکھلے کا طوطی بول رہا تھا۔ وہ ایک بے غرض وطن پرست تھے۔ وہ اعتدال پسند تھے۔ سب ان کی عزت کرتے تھے انھوں نے اس زمانے میں انجمن خادمان ہند Servant of India Society قائم کی تھی جس میں بے غرض کام کرنے والے جمع تھے۔ مہاتما گاندھی سیاست میں گوکھلے کو اپنا استاد مانتے تھے۔ پہلا سبق استاد نے شاگرد کو یہی پڑھایا کہ پہلے سال بھر تک ہندوستان کے حالات کا مطالعہ کرو۔ پھر اپنی رائے کا اظہار کرو۔ مہاتما گاندھی کو دیکھ کر گوکھلے پر اتنا اثر ہوا کہ انھوں نے کہا "میری ساری زندگی میں صرف دو ہی آدمی ایسے گزرے ہیں جنھوں نے گاندھی کی طرح مجھ پر روحانی اثر ڈالا ہے۔ ایک تو ہمارے بزرگ دادا بھائی نارو جی دوسرے میرے استاد مسٹر راناڈے۔ یہ لوگ ایسے تھے کہ ان کے سامنے کسی ناشائستہ بات کے کرنے پر ہم کو نہ صرف شرم آتی تھی بلکہ ان کی موجودگی میں ہم کسی ناشائستہ خیال کو اپنے دل میں جگہ بھی نہیں دے سکتے تھے۔"

۱۹۱۵ء سے پہلے مہاتما گاندھی کو کوئی نہیں جانتا تھا لیکن ہمارے ملک میں عام شعور اور بیداری پیدا کر کے انھوں نے ایک زبردست کارنامہ انجام دیا۔ یہ اُن کے سماجی، معاشی، اخلاقی اور سیاسی طریقوں کی وجہ سے ممکن ہو سکا۔ انھوں نے ایک نئے سماجی اور معاشی نظام کی داغ بیل ڈالی جس کی بنیاد محبت، مساوات اور برادری پر ہے۔ قدیم یونانی مصلح سولن کی طرح انھوں نے اندازہ لگا لیا کہ سماجی اور معاشی اصلاح کے بغیر سیاسی اصلاح کھوکھلی ہوتی ہے۔ ہندوستان بھر میں چھوت چھات کو دور کرنے یا پست اقوام کو بلند کرنے میں کسی نے اتنا کام نہیں کیا جتنا کہ مہاتما نے کیا۔ ٹراونکور میں

جو جھگڑا ہوا اور پھر مندروں کے دروازے ہریجنوں کے لئے جو کھولے گئے تو وہ اسی زبردست ڈرامہ کا ایک منظر ہے جو ہمارے ملک میں ایک نئے سماجی اور تہذیبی ماحول پیدا کرنے کے لئے مہاتما گاندھی نے کھیلا۔

راجہ رام موہن رائے اور ویریسالنگم پنتلو کی طرح مہاتما گاندھی نے ہندوستان میں عورتوں کا درجہ بلند کرنے میں کامیابی حاصل کی۔ شراب نوشی کی ممانعت کی جو مہم انھوں نے چلائی وہ ان کے اس منصوبے کا جز تھی جس کے تحت وہ ہمارے ملک میں فرد کی حیثیت کو بڑھنے سے روکنے والی تمام رکاوٹوں کو بے دردی سے دور کر دینا چاہتے تھے۔ سماجی اور معاشی انقلاب جو انھوں نے پیدا کیا اس سے بڑھکر شاید ان کی وہ حیثیت ہے جس کی بدولت وہ ملک کے سیاسی اختلافات میں سمجھوتہ کرانا چاہتے تھے۔ اس کوشش میں انھوں نے اپنی جان دی۔

ایک سربرآوردہ مسلم مدبر اور حاکم نے یہ کہا کہ "سب سے زیادہ مہاتما گاندھی ہی تنہا وہ شخص ہیں جو گتھیوں کو سلجھانے میں ہماری مدد کر سکتے ہیں اور جو ہمارے اندر وہ کردار پیدا کر سکتے ہیں جو حکومت خود اختیاری کی بنیاد ہے۔ اگر وہ اس وقت سیاسیات سے علحدہ ہو جائیں تو اس کا گمان ہے کہ میدان سیاست ایسے لوگوں کے ہاتھ میں آجائے گا جو ابھی خام ہیں اور خواب وخیال کی دنیا میں رہتے ہیں۔ وہ خود اپنے کو دھوکا دیتے ہیں اور بے معنی باتیں کر کے ملک کو دھوکا دیتے ہیں"۔ یہ بات کوئی دس برس ادھر کہی گئی تھی۔

مہاتما گاندھی کی نظر اس ملک تک محدود نہ تھی۔ وہ تو انسانیت کے پیغامبر تھے۔ ان کا پیام ہندوستان تک محدود نہ تھا۔ وہ ساری دنیا کے لئے تھا۔ میزینی کی طرح جو اطالوی اتحاد کا پیغامبر تھا گاندھی نے "ینگ انڈیا" میں ۲۴ برس اُدھر لکھا تھا کہ

"میں خدا کی کامل وحدانیت پر یقین رکھتا ہوں اور اس لئے انسانیت کو بھی ایک سمجھتا ہوں۔ کیا حرج ہے اگر جسم بہت سے ہوں۔ روح تو ایک ہے۔ سورج کی کرنیں منتشر ہو کر بہت سی ہو جاتی ہیں لیکن اُن سب کا ماخذ ایک ہے۔ اس لئے میں بدوں سے اپنے آپ کو جدا نہیں کر سکتا اور نہ نیکوں میں شامل ہونے سے مجھے کوئی چیز روک سکتی ہے۔ اور اب چاہے میں چاہوں یا نہ چاہوں مجھے پوری بنی نوع کے ساتھ تجربہ کرنا ہے۔ اور بغیر تجربہ چارہ نہیں۔ زندگی بھی تجربوں کے ایک نہ ختم ہونے والے تجربوں کا نام ہے۔"

رائٹ آنریبل وی ایس ایس شاستری، جو گوکھلے کے جانشین تھے، وہ سیاسیات میں مہاتما گاندھی سے اختلاف رکھتے تھے۔ انھوں نے ۱۹۲۸ء میں مہاتما گاندھی کو لکھا "خدا کی طرح آپ ہی نظر نہ آنے والے رہنما اور زندگی پیدا کرنے والے چراغ کی طرح سب کے دلوں میں روشن رہے ہیں اور آپ ہی نے سب کو سیدھے راستے پر رکھا ہے۔"

محبت، خیر خواہی اور بے آزاری کا جو اصول بدھ اور مہاویر نے پیش کیا تھا اس کو اجنٹا اور ایلورہ کے نقاشی اور سنگ تراشی کے نمونوں کی شکل میں جتنا ریاست حیدرآباد میں غیر فانی بنایا گیا ہے اتنا دنیا کے کسی حصے میں نہ بنایا گیا ہوگا۔

بدھا کی مورتی پریم اور دیا کی نشانی ہے اس لئے ہر دل کو بھاتی ہے۔ مہاتما گاندھی کی مسکراہٹ نے بہت سے دکھی مردوں، عورتوں اور بچوں کو سکھ پہنچایا ہے۔ اور ایسی مسکراہٹ کو اجنٹا کے نقاش نے بہت اچھے طریقے سے دکھلایا ہے۔

جب ہم لوگ نہ رہیں گے۔ ایک نئی نسل پیدا ہو جائے گی اور وہ اس زمانے کا ذکر کرے گی تو مہاتما گاندھی کی شخصیت سے متعلق افسانے تیار ہو جائیں گے۔ اور سب یہی کہیں گے کہ وہ ہمارے تھے۔ جیسا کہ چار سو برس ادھر مہاتما کبیر کی صورت میں ہوا۔
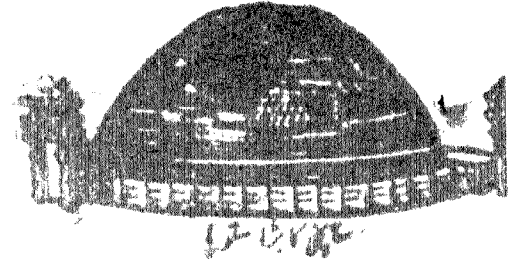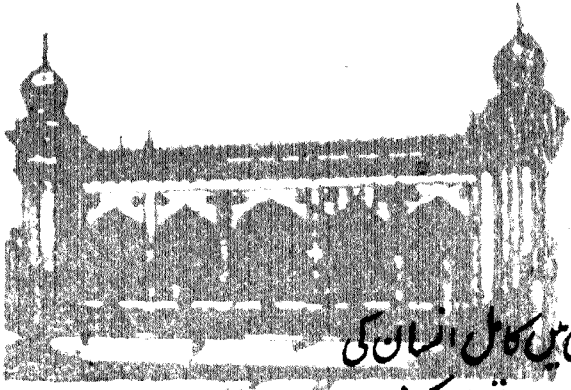
بھگوت گیتا ہندوؤں کی مقدس کتاب ہے۔ اس میں کامل انسان کی چند شرائط پیش کی گئی ہیں۔ مہاتما گاندھی ان لوگوں میں سے تھے جن کی ذات میں ایسی شرطیں پوری ہوا کرتی ہیں۔

مترجمہ :- پروفیسر نصیر احمد عثمانی
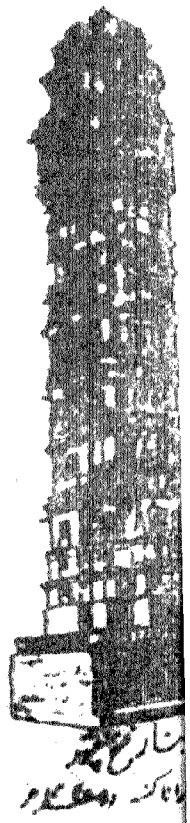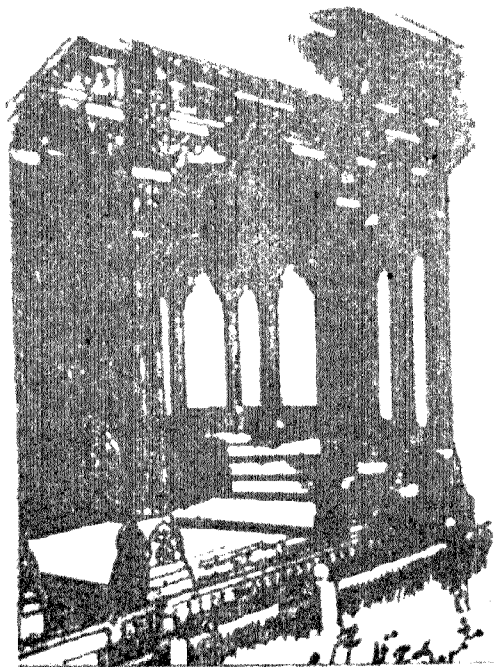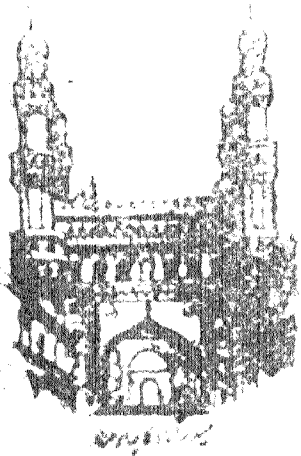
حیدرآباد اسٹیٹ بنک

کا قیام تحت قانون حیدرآباد اسٹیٹ بنک عمل میں لایا گیا تا کہ سکہ کی ترویج و اس کے استحکام و تحفظ کا انتظام بدرجہ اتم ہو سکے۔ اندرون و بیرون ریاست رقوم کی ادائی میں سہولت پیدا ہو و نیز ملک کی معاشی ضروریات کے لئے قرضہ فراہم اور زراعت تجارت صنعت و حرفت کی اعانت بہتر طریقہ پر کیجا سکے۔

صدر دفتر حیدرآباد دکن

مجوزہ سرمایہ	۱،۵۰،۰۰،۰۰۰
اجراء و ادا شدہ سرمایہ	۷۵،۰۰،۰۰۰
مد محفوظ	۲۸،۷۵،۰۰۰
کھاتہ جات امانت وچالو	۱۳،۷۸،۱۶،۰۰۰

بمبئی برانچ

نیو انڈیا انشورنس بلڈنگ مہاتما گاندھی روڈ فورٹ

مدراس برانچ

قدیم پاریز بلڈنگ

شاخیں واقع اندرون حیدرآباد

عادل آباد۔ اورنگ آباد۔ بیڑ۔ بھونگیر۔ بیدر۔ بودھن۔ گلبرگہ۔ ہنگولی جڑچرلہ۔ جالنہ۔ جنگاؤں۔ کھمم میٹھ۔ کپیل۔ کوتہ گوڑم۔ لاتور۔ محبوب نگر۔ نانڈیڑ نظام آباد۔ پربھنی۔ پرلی۔ پداپلی۔ پورنہ۔ رائچور۔ سیلو۔ سکندرآباد۔ شاہ آباد تانڈور۔ اودگیر۔ ویجاپور۔ ورنگل۔ یادگیر۔ ظہیرآباد۔

ماہنامہ ہند
آزادیٔ ہند کی دوسری سالگرہ کا علمی پیشکش

سروجنی نائیڈو

(از)

شریمتی پریم لتا گپتا (بی، اے آنرز) لندن

۱۵-اگست سنہ ۱۹۴۹ء
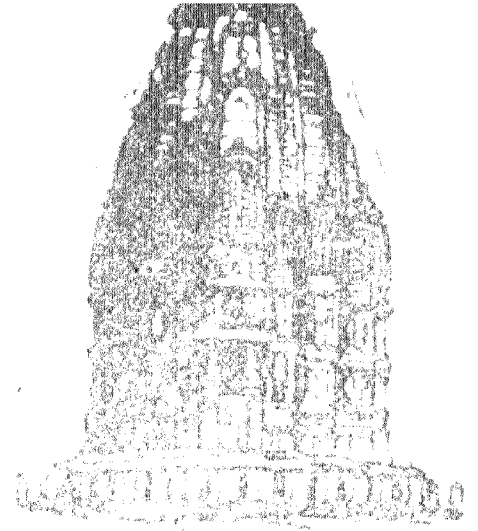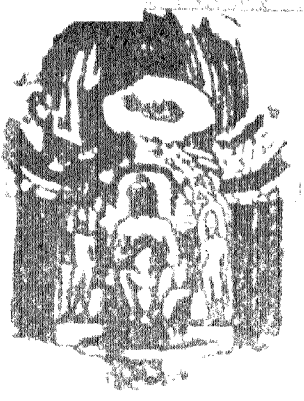
مہاتما گاندھی قوم کے باپ کہلاتے ہیں۔ پچھلے تیس برس سے انھوں نے ہندوستان میں عوامی زندگی اور سرگرمی کے ہر گوشہ پر اپنا گہرا اثر ڈالا ہے۔ چاہے وہ گوشہ فلسفہ، مذہب، سیاست، معاشرت، تہذیب یا تعلیم کا ہی کیوں نہ ہو۔ اور تو اور عام صحت اور قدرتی علاج جیسے بے تعلق گوشے بھی اُن سے متاثر ہوئے ہیں۔ انھوں نے کسی مذہب یا دھرم کی بُنیاد نہیں رکھی۔ لیکن تمام لوگوں میں وہ اخلاقی بیداری اور سیاسی شعور پیدا کر گئے اور اپنے پیچھے پیروؤں اور عقیدت مندوں کی ایک بڑی تعداد چھوڑ گئے جنھوں نے اُن کی تعلیم کی روح کو پا لیا ہے اور اُن کے فلسفہ کے مطابق اپنی زندگیوں کو ڈھال لیا ہے۔ انھوں نے اتنا ہی نہیں کیا کہ ہمیں سیاسی آزادی، نیا معاشرتی جنم، اور قومی خودداری عطا کی بلکہ اس سے بھی بڑھکر یہ ہے کہ ایسے لوگ تیار کر دئے جو اتنی قابلیت رکھتے تھے کہ ان کی زندگی میں اُن کی مدد کر سکیں اور اب اتنے مضبوط ہیں کہ ان کے کام کو جاری رکھ سکتے ہیں۔ کوئی ایسا ملک نہیں جس کو خوش قسمتی سے ایسی قابلیت اور کردار کے رہنما ملے ہوں جیسے کہ پنڈت جواہر لال نہرو، سردار ولبھ بھائی پٹیل، ڈاکٹر راجندر پرشاد اور آخر میں گو کسی سے کم نہیں، وہ ہیں شریمتی سروجنی نائیڈو، محترمہ کستوربائی کے بعد گاندھی جی کی ساتھی، وفادار دوست اور سچی پرستار رہی تھیں انھوں نے اپنی ذات، اپنا آرام اور یوں کہئے کہ اپنا سب کچھ مہاتما کو تج دیا تھا۔

تاج محل
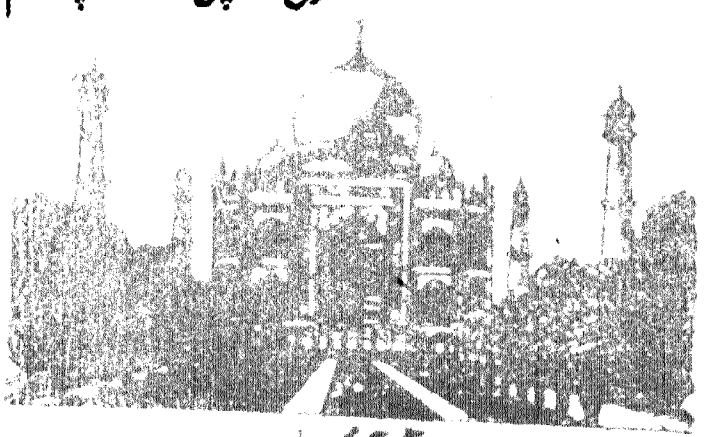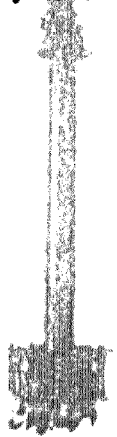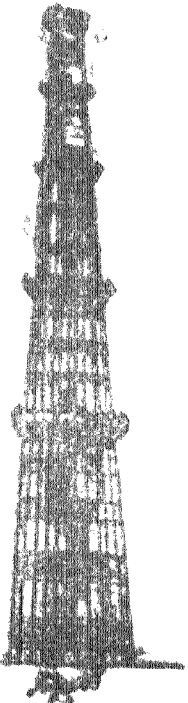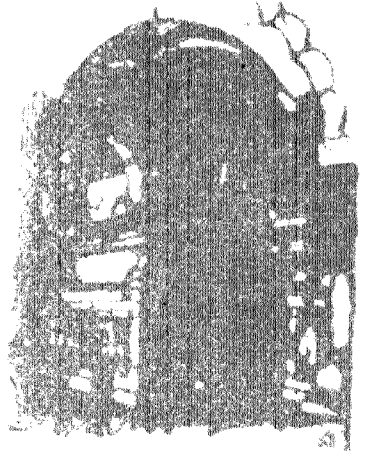
مسز نائیڈو کی تربیت ایک ایسے شائستہ خاندان میں ہوئی جو مغرب کے زیر اثر تھا۔ انھوں نے مغرب کے علم و ادب سے ہر وہ چیز حاصل کر لی جو بہترین تھی۔ وہ انگریزی شاعری سے کما حقہٗ واقف تھیں اور مغرب کے فکر و فلسفہ پر اُن کو کافی عبور تھا۔ مغربی فاضلوں کی مجلس میں وہ بے تکلف شریک ہو سکتی تھیں اور لندن، پیرس حتیٰ کہ نیویارک اور واشنگٹن کے علمی حلقوں میں وہ اپنے آپ کو اجنبی محسوس نہ کرتی تھیں۔ اس تمام پس منظر کے باوجود یہ ایک عجوبہ ہے کہ جب گاندھی جی ہندوستان کی پبلک زندگی میں داخل ہوئے تو وہ اُن کے فلسفہ سے متاثر ہوئیں اور جلد ہی اُن کے پُرجوش پیروؤں میں شمار ہونے لگیں۔ مغرب سے اس قدر شدید وابستگی کے باوجود وہ گاندھی جی کے کام میں تن من سے شریک ہو گئیں اور سچ اور اہنسا کی پرستار بن گئیں۔ اور یہی دو اصول گاندھی جی کی تعلیم کا بڑا جز تھے۔ شریمتی نے مشرق کی تعلیم کو اپنے اندر اسی طرح سمو لیا جس طرح انھوں نے مغرب کو جذب کر لیا تھا اور وہ اب اتنا آگے بڑھ گئیں کہ گاندھی جی کے ساتھ آشرم کی زندگی بسر کرنے لگیں کیونکہ گاندھی جی نے ہندوستان کے اصلی باشندوں کی طرح سادہ زندگی بسر کرنے کا پرچار کیا تھا! اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ شریمتی کی اصلی رُوح ہندوستانی تھی اور نوعیت میں مشرقی تھی۔ اپنے عقیدوں، اپنی ذہنی اور تہذیبی بناوٹ میں وہ اپنشد اور گیتا کے فلسفہ کی وارث نظر آتی تھیں وہ مذہب میں کٹر نہ تھیں۔ ان کا نقطہ نظر وسیع تھا۔ اس لئے وہ ہندوستانی تہذیب کی علمبردار بن سکیں۔ ہندوستان نے نیا جنم لیا تو اس میں اُن کا بھی شاندار حصّہ ہے۔ انھوں نے اپنے میٹھے بولوں اور گیتوں سے لوگوں میں وطن پرستی، خدمت خلق اور قربانی کے اعلیٰ جذبات پیدا کر دئے بالخصوص پڑھے لکھے

لوگوں میں۔ یہی ہندوستان اور گاندھی دونوں کا پیامِ زندگی ہے۔ پچھلے پچاس برسوں میں ہندوستان کی تہذیبی زندگی کے ہر پہلو پر ان کی نظر تھی۔ یہی وجہ ہے کہ گاندھی جی کے زیرِ اثر ہندوستان نے جو نیا جنم لیا اُس کی یہ زبردست نمائندہ بن گئیں۔ آج کل کے ہندوستان میں جو بھی سرگرمی دکھائی دیتی ہے، خواہ اس کا تعلق ادب، فنونِ لطیفہ، موسیقی، اصلاحِ نسواں، فلسفہ، یا سیاست سے ہی کیوں نہ ہو، اس میں شریمتی سروجنی دیوی ہر جگہ براجمان نظر آئینگی۔ یہ زمانہ آزادی کی جنگ کا ہے اس لئے سیاست میں اُن کا وقت اور ان کی توانائی بہت صرف ہوئی۔ یہاں تک کہ بھارت ماتا کی آواز پر انھوں نے اپنے محبوب مشغلہ شاعری کو بھی نظرانداز کر دیا۔ لیکن سیاست انکے نزدیک اقتدار کا حاصل کرنا نہ تھا بلکہ ایک اچھے مقصد کو حاصل کرنے کا ذریعہ تھا۔ بھارت ماتا کی سیوا ہو یا غلامی سے آزادی کی لڑائی ہو، وہ ان اونچے اصولوں پر ہمیشہ قائم رہیں جو ان کی زندگی کے ہر شعبہ پر حاوی تھے وہ ایک اعلیٰ مشن کے لئے کام کرنے کے واسطے ہی پیدا ہوئی تھیں، پھر جو راستہ وہ اپنے لئے اختیار کرتیں اس میں کوئی جسمانی تکلیف یا مادی نقصان ان کو اس راستہ پر چلنے سے روک نہیں سکتا تھا۔ سروجنی نائیڈو کو ایک ایسی فانی ذات خیال کرنا مشکل تھا، جو ہم میں رہتی بستی تھی، ماں کی طرح محبت کرتی تھی، اور جو دوست کی طرح بات کرتی تھی، ان کی زندگی کا کوئی لمحہ بیکار نہ گزرتا تھا۔ خواہ وہ اپنے خاندان میں ماں کی مامتا کا مظاہرہ کر رہی ہوں یا اپنے مہمان نواز گھر میں سچے دوست کی طرح باتیں کر رہی ہوں، یا جیل میں وطن پرستی کی داد دے رہی ہوں یا گاندھی جی کی چیلی بنی ہوں یا شان و شوکت سے گھری ہوئی گورنر بن گئی ہوں۔ ان کی انسانی صفتیں ہر جگہ نمایاں اور ان کے چاروں طرف پھیلی نظر آتی تھیں۔

ہندوستان کی آزادی کی جنگ میں پیش پیش، ہندوستان کی تہذیب کی نمایندہ شریمتی مسز نائیڈو میں قوم پرستی کی تنگ خیالی نہ تھی۔ ان کا نقطۂ نظر بین قومی تھا اور اس لحاظ سے وہ گرو دیو ٹیگور کی سچی پیرو تھیں۔ جب اس شاعر اعظم کا انتقال ہو گیا تو بین قومی تہذیب کے مرکز شانتی نکیتن کی نگرانی کا بار مسز نائیڈو کے کندھوں ہی پر آکے پڑا۔ وہ صحیح معنوں میں دنیا کی شہری تھیں ملک میں اور ملک سے باہر ہر جگہ ان کی یکساں عزت کی جاتی تھی۔ یہ ان ہی کی ذات تھی جس کی بدولت ہندوستان کے مسئلہ نے امریکہ کے سامنے اہمیت اختیار کر لی۔ یہ صرف ان کی خطابت اور انگریزی زبان کی مہارت نہ تھی جس نے امریکہ میں سننے والوں پر جادو کر دیا تھا، بلکہ بڑا سبب یہ تھا کہ انھوں نے تکلیف برداشت کر کے اور قربانیاں دیکر اپنے لئے جو مقام پیدا کیا تھا اس نے ان کو ہندوستانی تہذیب کا علمبردار بنا دیا۔

کسی نے گرو دیو ٹیگور کے متعلق کہا تھا کہ وہ مجسم شعر ہیں۔ اسی طرح مسز نائیڈو کے متعلق یہ کہنا بالکل صحیح ہوگا کہ وہ حسن اور حسن کاری کا مجسمہ تھیں۔ ان کی شاعری میں بہت ترنم ہے۔ وہ حسن کاری (آرٹ) کی سرپرست ہی نہ تھیں بلکہ اسمیں ایک جمالیاتی جھلک پیدا کر دیتی تھیں۔ انکی زندگی کے ہر لمحہ میں حسن اور لطافت کی آمیزش نظر آتی تھی۔ یہانتک کہ سیاست اور جیل خانہ میں بھی انھوں نے ایک حسن کارانہ ادا پیدا کر دی۔ بزم شاعری میں انکی وجہ سے چار چاند لگ جاتے تھے۔ ان کی یاد ہم سب کے دلوں میں تازہ ہے اور تازہ رہے گی۔

سانچی کے استوپا کا داخلی پھاٹک

مصوّر ہند

ادارۂ مصوّر ہند کی دوسری سالگرہ کا علمی پیشکش
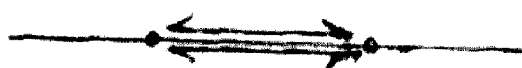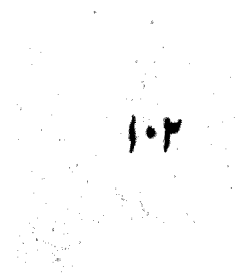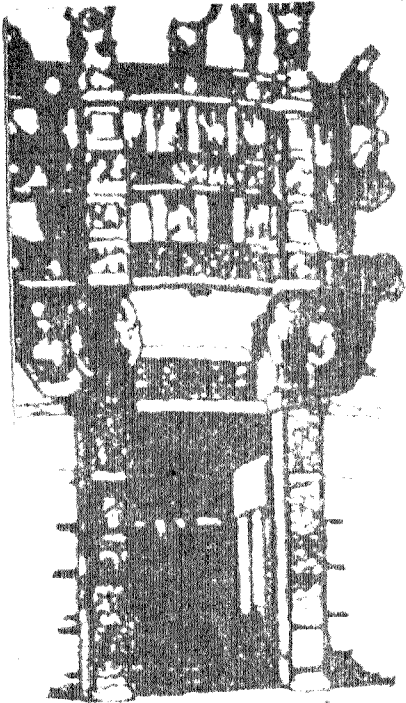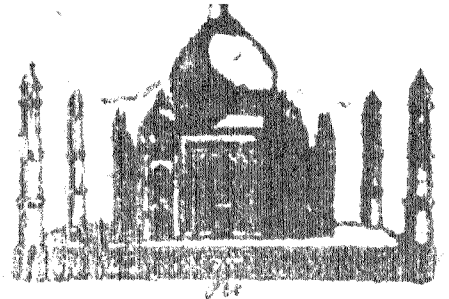
صحافت اور ہندوستان

(از)

مسٹر نبو دیو راؤ ناظم محکمۂ اطلاعات و تعلقات عامہ حکومت حیدرآباد

۱۵۔ اگست سنہ ۱۹۴۹ء

آپ نے یقیناً اُس ایڈیٹر کا قصّہ سنا ہوگا جس نے ایک صبح اپنے اخبار میں لکھ دیا تھا کہ مقامی مجلس بلدیہ کے آدھے ارکان بے وقوف ہیں۔ جب مجلس بلدیہ نے اِس کے خلاف احتجاج کیا تو ایڈیٹر صاحب نے فوراً اِن الفاظ میں معافی چاہ لی:۔

"کل ہم نے اپنے اخبار میں لکھّا تھا کہ مجلس بلدیہ کے آدھے ارکان بیوقُوف ہیں۔ ہمیں اپنی اِس غلطی پر افسوس ہے۔ ہم بڑی مسرت کے ساتھ اعلان کرتے ہیں کہ مجلس کے آدھے ارکان بیوقوف نہیں ہیں"۔

ممکن ہے کہ یہ مثال ایک انتہائی صورت ظاہر کرتی ہو۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ ہر اُس بحث میں جو ایک ایڈیٹر اور دوسرے فریق کے درمیان پیدا ہو پلّا ہمیشہ ایڈیٹر ہی کا بھاری رہتا ہے۔ وہ جب چاہے کوئی اختلافی مسئلہ چھیڑ سکتا ہے اور جب چاہے قضیہ چُکا سکتا ہے۔ پھر اُسے زندہ کر سکتا ہے، بنا سکتا ہے، اُبھار سکتا ہے اور ختم کر سکتا ہے۔ غرض یہ سب کچھ اُس کی مرضی اور طبیعت پر منحصر ہے۔

نپولین نے کہا تھا کہ وہ ایک سو سنگینوں سے اتنا نہیں ڈرتا جتنا کہ چار مخالف اخباروں سے ڈرتا ہے۔ موجودہ زمانے کا کوئی سپہ سالار توپوں، دبابوں

اور جوہری بموں کی شکل میں کوئی ایسا ہتھیار ہمیں نہیں بتا سکا جو طاقت میں
اخباروں کی برابری کرسکتا ہو۔ لیکن جیسا کہ میکالے نے کہا تھا، ایک مدرسے
جانے والا بچہ بھی جانتا ہے کہ آج اخبارات کی کیا طاقت ہے۔ کسی دِل جلے کا   ۱۰۷
قول ہے کہ اگر آپ چاہیں کہ دُنیا میں کوئی بڑی بُرائی کی جائے اور پھر سزا سے
بھی بچ رہیں تو اِس کا طریقہ یہ ہے کہ آپ ایک اخبار کے ایڈیٹر بن جائیے۔
سُبکی اور من چلے پن سے قطع نظر، اِس سے کون انکار کرسکتا ہے کہ
صحافت مجموعی حیثیت سے ایک بڑا ادارہ ہی نہیں بلکہ ایک طاقتور ادارہ ہے۔
دنیا کی نبض پر اُنگلی رکھنا، اُس کی رفتار کا خیال رکھنا، کہ اب تیز ہے اور اب سُست
ہے، اور اسے موثر اور خوبصورت الفاظ میں بیان کرنا، اخبار کو اس تیزی اور
پھرتی کے ساتھ چھاپنا اور شائع کرنا کہ رات کے دوران میں دُور دراز ملکوں میں
جو واقعات پیش آتے ہوں، وہ صبح، ناشتے سے پہلے پڑھے جاسکیں، اور ہر چوبیس
گھنٹوں کے بعد، ہر دن، نئے سرے سے یہ کرشمہ کر دکھانا، اور اپنی محنت کے حاصل
کو اتنے معاوضے میں فراہم کرنا، جو ایک دیا سلائی کی ڈبیہ کی قیمت سے کچھ ہی
زیادہ ہو، یقیناً ایک حیرت انگیز کارنامہ تسلیم کیا جائے گا۔ اخباری کام کے عملی
تجربے کے بغیر کوئی شخص یہ محسوس نہیں کرسکتا کہ ایک اخبار نکالنے والے کا
کام کتنا محنت طلب اور کٹھن ہوتا ہے اور اُسے کتنے کام انجام دینے پڑتے ہیں
یہ سارے کام قوّتِ فیصلہ، تیزی، سنجیدگی، قوّتِ حافظہ، راست بازی، ہمدردی،
اور لکھنے کے فن سے واقفیت اور تمام قدروں کے گہرے احساس کے طالب
ہوتے ہیں۔ اخبار والوں کو کس طرح اپنی جان جوکھوں میں ڈالنی پڑتی ہے

اُس کا اندازہ ہوائی جہاز کے اُس حادثے سے ہوسکتا ہے جو حال ہی میں بمبئی میں پیش آیا اور جس میں تیرہ امریکی جریدہ نگاروں نے اپنی جانیں دیں۔

برطانیہ کے شاہی صحافتی کمیشن نے، جس نے برطانوی صحافت کے لئے حال ہی میں ایک جامع، واضح اور صحت بخش مسودۂ قانون پیش کیا ہے، اُسی قدیم، سچے اور کُھلے اُصول کی توثیق کی ہے، جو بلیک اسٹون نے انگلستان کے قوانین پر تبصرہ کرتے ہوئے بیان کیا تھا اور جو یہ ہے کہ ایک آزاد مملکت کے قومی مزاج کے لئے صحافت کی آزادی لازمی ہے۔ کوئی شخص، یہاں تک کہ وہ لوگ بھی جو اخبار نویس بننے کی اہلیت اور صلاحیت سے محروم ہیں، اِس اُصول سے اختلاف نہیں کر سکتے۔ لیکن ایک عام رجحان یہ پایا جاتا ہے کہ جب کبھی صحافت کی آزادی کی گفتگو آئے تو اُس کے معنی فقط حکومت کی پابندیوں سے آزادی کے لئے جائیں۔ حقیقت میں "آزادی" سے مراد نہ صرف کسی شکل یا صورت میں بھی، حکومت کی نگرانی اور ہدایات سے آزادی ہے بلکہ اُن تمام اثرات سے آزادی ہونی چاہئے جو کسی اخبار کے ایڈیٹر کو، اس بات کے آزادانہ اور بے لاگ اظہار سے، جسے وہ حق بجانب سمجھتا ہو، باز رکھیں چنانچہ شاہی کمیشن نے یہ رائے ظاہر کی ہے کہ برطانوی اخبارات میں سنسنی پھیلانے کی نامُناسب حد تک کوشش کی جاتی ہے اور چھوٹی چھوٹی باتوں کو حد سے زیادہ نمایاں کرنے اور خبروں کو بھی جانب داری کے ساتھ توڑ مروڑ کر پیش کرنے کا رُجحان پایا جاتا ہے۔ یہ آخری فعل تو اخبار نویسی کے پیشے میں زبردست گُناہ ہے۔ اگر کوئی اخبار اپنے آپ کو شخصی، فرقہ واری
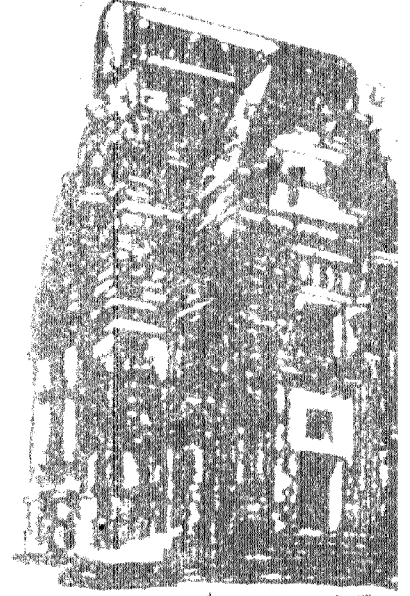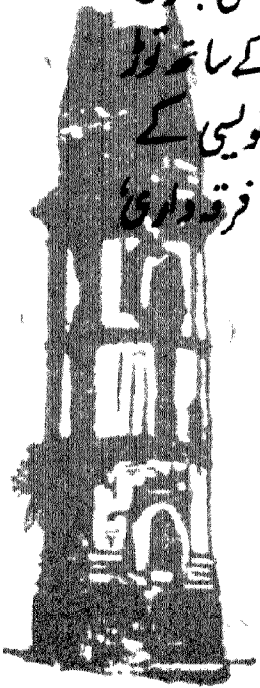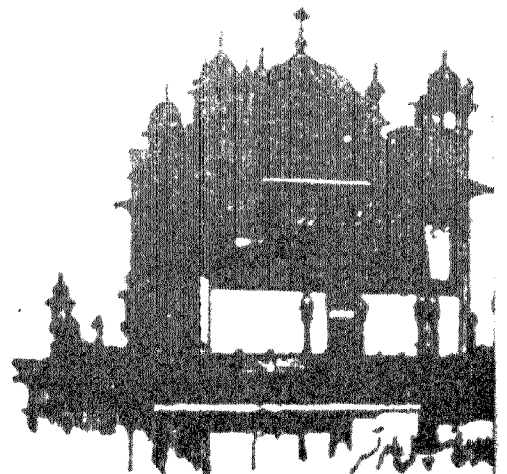
جماعتی یا دوسرے تعصبات کے اظہار کا ذریعہ بنا لے تو وہ بھی کسی ایسے اخبار سے زیادہ آزاد نہیں کہلایا جا سکتا جو حکومت کی طرف سے اپنی خدمت کا معاوضہ پاتا ہو۔ اگر کسی اخبار کی اشاعت کا دار و مدار صرف ڈرامائی اور گمراہ کن سرخیوں پر یا مشتہرین کی خوشنودی پر ہو تو وہ ایک آزاد اخبار نہیں ہے۔ جو اڈیٹر خبروں کی اشاعت میں صرف اپنے یا مالک کے مفاد کے تحت جوڑ توڑ سے کام لیتا ہو وہ آزاد نہیں ہے۔ ایک مشہور برطانوی اخبار نویس کا بیان ہے کہ وہ اُس دن کا منتظر ہے جب کہ کسی اخبار کے خلاف خبروں کو بگاڑنے اور غلط کرنے اور اپنے مخالفین کی عمداً غلط تصویر پیش کرنے کے الزام میں مقدمہ چلایا جا سکے۔

ہماری خوش قسمتی ہے کہ ہندوستان میں اخبارات کی اکثریت صحافت کے سنجیدہ، معتدل مزاج، اور معقولیت پسند طبقے سے تعلق رکھتی ہے جو بحران کے زمانے میں رائے عامہ کو مستحکم رکھتے ہیں اور شک و شبہ اور مشکلات کے زمانے میں اُسے سنبھالتے ہیں۔ اِن اخباروں کے اڈیٹر بلند مقاصد اور عوام سے اپنی غیر متزلزل وفاداری کے ساتھ اپنی بھاری ذمہ داریاں پوری کرتے ہیں۔ اور یہ وفاداری اُنہیں حکومت کی واجبی تائید و حمایت سے باز نہیں رکھ سکتی۔ وہ اُس مرکزی ستون کے اجزا ہیں جو سارے ملک کی عمارت کو سنبھالے ہوئے ہیں لیکن اخبار نویسوں کا ایک دوسرا طبقہ بھی ہے اور بدقسمتی سے ایسے صحیفہ نگاروں کی تعداد میں اضافہ ہی ہوتا جا رہا ہے، جن کا فلسفۂ حیات 'پیٹ سے آگے نہیں بڑھتا وہ اپنے طرزِ عمل سے صحافت کے نام کو داغ دار کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایسے اڈیٹر جو اپنی نیک نامی کو برقرار رکھنا چاہتے ہوں، عام مفاد کی خاطر اِس بات

کی کوشش کرینگے کہ اخبار نویسوں کا یہ طبقہ اپنے کئے کی سزا پائے۔
آج ہندوستانی عوام کے سامنے دو اہم مسئلے فوراً حل طلب ہیں: ایک تو غذائی پیداوار بڑھانے کا مسئلہ اور دوسرا ملک کے بعض حصوں میں سماج دشمن عناصر کو کچلنے کا۔ صحافت کی توانائیوں کے استعمال کے لئے ان سے بہتر مقصد کوئی نہیں ہوسکتا۔ اور اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ مقامی صحافت اس میں حصّہ لے گی۔

موجودہ دور کی صحافت اتنی طاقت رکھتی ہے کہ وہ تہذیب وتمدن کے دھارے کا رُخ بدل دے۔ اگر دنیا کے اخبارات مِل جُل کر رائے عامہ کی صحیح اُصول پر تربیت کے لئے اپنے اثر کو کام میں لائیں اور اگر وہ اپنے اثر سے، جو موجودہ دور میں کسی دوسرے کے اثر سے بہت بڑھا ہوا ہے، امن قائم کرنے اور ایک نئی شاندار دنیا کی تعمیر کرنے کی کوشش کریں تو ہمیں آئندہ چند سال کے اندر اندر ہی دنیا میں امن وآمان اور لوگوں کے درمیان خیرسگالی نظر آئیگی۔
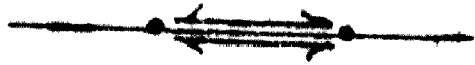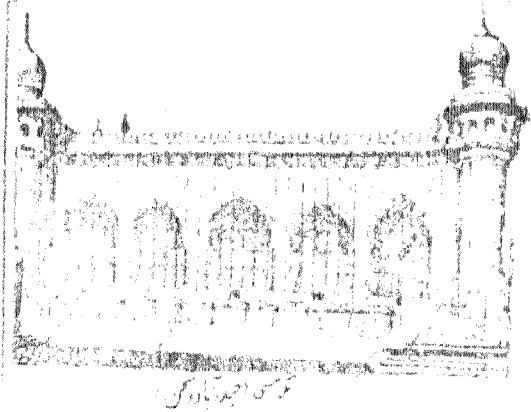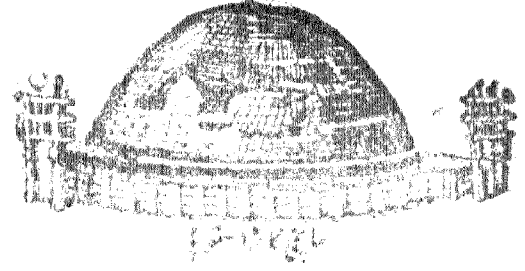
آزادی ہند کی دوسری سالگرہ کا علمی پیشکش

آزادی کی سحریں

(از)

مسٹر وی، وی، شبری کھنڈے (بی، اے، ال ال، بی)

ایڈوکیٹ جنرل حیدرآباد دکن

۱۵۔ اگست سنہ ۱۹۴۹ء
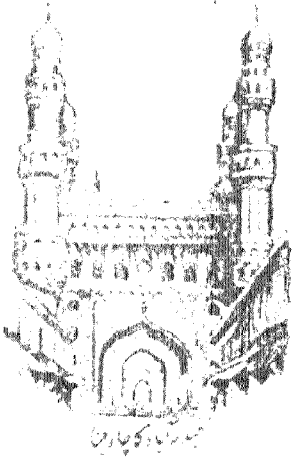
جب سے انسان نے جنم لیا ہے اس وقت سے لے کر اب تک اسکو اپنی آزادی کی لڑائی بہت سی سرحدوں پر لڑنا پڑی ہے اور وہ بھی جوش و خروش کے ساتھ۔ سرحدوں کے بدلنے سے انسان کو لڑائی کا طریقہ اور ہتھیار بھی بدلنے پڑے۔ یہ سب کچھ ہوا لیکن خود لڑائی اپنی شدت اور اپنی وسعت کے اعتبار سے بڑھتی ہی رہی کیونکہ آزادی خود ایسی عنقا صفت ہے کہ تمدن کی اس ترقی کے باوجود اگر خیالی بن کر نہیں رہ گئی ہے تو گرفت میں بھی نہیں آئی ہے۔ آیئے ذرا اس کی تحقیق کریں کہ اس کے اسباب کیا ہیں۔

انسان کی عملداری اس زمین پر انسان کی ابتدائی عملداری کا نقشہ انجیل کی کتاب پیدائش کے پہلے باب کی ان آیتوں میں کم و بیش صحیح طور پر یوں کھینچا گیا ہے :-

خدا نے انسان کو اپنی صورت پہ پیدا کیا۔ اپنی صورت پر پیدا کیا اس کو نر اور مادہ (آیت ۲۷)

اور خدا نے انہیں برکت دی اور اُن سے کہا کہ پھلو پھولو اور پھیل جاؤ زمین کو بھر دو اور اس کو مسخر کر لو اور ماہی دریا، مرغ ہوا اور اس زمین پر جو بھی زندہ حرکت کرے اس پر حکمراں بنجاؤ (آیت ۲۸)

ہم چونکہ ارتقا سے واقف ہیں کہ اس سیارے پر نوع

فطرت کی سرحد پر انسانی سب سے آخیر میں نمودار ہوئی ہے اس لئے انجیل میں پیدائش کی جو داستان بیان کی گئی ہے اُسے ہم آنکھ بند کرکے قبول نہیں کر سکتے۔ ایک بات تو یہ ہے کہ اگر خدا قادرِ مطلق ہے، جیسا کہ وہ بلاشبہ ہے، تو ایک آدمؑ پیدا کرنے کی بجائے دنیا کے مختلف حصوں میں کئی آدم پیدا کر سکتا تھا۔ اتنی بات تو دل کو لگتی ہے کہ انسان کی نسل کے ارتقاء کی ابتدائی منزلوں میں اس زمین پر جگہ کافی سے زیادہ تھی اور کھانے کو بھی بہت زیادہ تھا اس لئے انسان آزادی کے ساتھ بڑھا اور زمین پر پھیل گیا۔ پھر ماہی دریا، مرغ ہوا، اور ہر زندہ حرکت کرنے والے پر اس کی حکومت قائم ہوگئی۔ انسان چونکہ تعداد میں بڑھا اور زمین کے دور دراز گوشوں میں بھی پھیل گیا اس لئے اس نے سب سے پہلے لڑائیاں فطرت کی ان وحشی قوتوں کے خلاف لڑی ہوں گی جو دیکھنے میں بہت زبردست اور نوعیت میں بہت مختلف تھیں۔ اسلئے انسان کا جانی نقصان بھی بہت زبردست ہوا ہوگا پیشتر اس کے کہ پہلی فیصلہ کن لڑائی میں فطرت کی سرحد پر انسان کو فتح حاصل ہوئی یہاں تک کہ انسان، شاعر کی زبان میں، اس طرح نمودار ہوا کہ

> "وہ تا بہ حدِ نظر مالک تھا مرکز سے لے کر چاروں طرف سمندر، رنگ، پرندے اور درندے کا مالک۔"

فطرت کی سرحدوں کو جب انسان نے پار کر لیا تو پھر انسان کی نسلیں اور انسانی قبیلے پھلنے پھولنے لگے اور بڑی تیزی سے اُن کی تعداد بڑھنے لگی۔

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مختلف نسلیں اور قبیلے ایک جا ہوئے تو پھر زمین کی اچھی چیزوں مثلاً ہوا، پانی وغیرہ کے جہاں وہ بلا شرکت مالک تھے۔ اب ان میں شریک کرنا ٹہرا۔ اس کا لازمی نتیجہ آویزش تھا۔ اس آویزش میں فیصلہ فطرت نے بقاء اصلح کے اصول پر کیا۔ کوئی ایسا ہی عمل ہوا ہوگا جو متعدد اور مختلف نسلیں پھیل گئیں اور زمین کے گوشوں گوشوں میں آباد ہوگئیں۔ زمین کے ابتدائی باشندوں میں جو ذرا کمزور اور اثر پذیر تھے وہ زیادہ طاقتور حملہ آور نسلوں میں ضم ہوگئے پس آبادکاری اور انضمام کا یہ عمل جو جاری رہا تو آزادی کی جنگ نے زمین پر پھیل جانے اور زمین کی اچھی چیزوں کے حصول کی جنگ کی صورت اختیار کرلی۔ یہ گویا آزادی کی دوسری سرحد ہے یعنی نسلی مقابلہ کی سرحد جس پر جنگ ہوا کی جو بہ ظاہر آج تک ختم نہیں ہوئی ہے۔

علاقہ جاتی سرحد لیکن سوال یہ ہے کہ کیا یہ جنگ کسی وقت ختم بھی ہوگی ؟ نئے علاقے حاصل کرنے کی جو عادت عرصہ دراز سے چلی آئی ہے اس نے علم اور تجربے کی ترقی کے ساتھ نئے محرک پیدا کردئے ہیں اور نئے راستے کھول دئے ہیں۔ دور دراز ملکوں میں تجارت جو پھیلی تو اس نے اپنے علاقہ کی توسیع کی لالچ اور بڑھادی۔ جو قومیں ذرا ہمت والی تھیں تجارت اور سمندر میں دخل رکھتی تھیں انھوں نے زمین کی اس بھوک کی بدولت کئی نوآبادیاتی سلطنتیں قائم کر ڈالیں۔ نسلوں میں ابتدا میں علاقہ حاصل کرنے کے لئے جو کشمکش تھی اس نے زمانہ گزارنے پر قوموں اور سلطنتوں میں تجارتی مقابلے کی صورت اختیار کرلی۔ لیکن اسکا محرک یہ نہ تھا کہ استحصال سے جو کچھ حاصل ہو اس میں سب انسانوں کو اور استحصال

کئے جانے والے ملکوں کے باشندوں کو شامل کیا جائے بلکہ اس کی غرض یہ تھی کہ اپنے ہی قوم اور اپنے ہی ملک کے لئے فائدہ اور حکومت حاصل کی جائے۔ کسی دوسرے کو شریک کئے بغیر علاقہ واری توسیع بھی کی، وہ سرحد ہے جس پر انسانیت انسانی آزادی کی عمر بھر کی لڑائی میں اپنی آخری خندقیں کھود رہی ہے۔ اور جب سے موجودہ زمانہ کے مہذب انسان کے ہاتھوں میں سائنس نے ہلاکت کے نئے ہتھیار دے دیے ہیں اس وقت سے یہ لڑائی اور بھی بھیانک ہو گئی ہے۔

رُوحانی سرحد صدیوں پرانی آزادی کی اس لڑائی میں انسانیت اپنے آپ کو ایک عالمی جنگ میں مبتلا پاتی ہے۔ اس جنگ میں قومیں ایک دوسرے کو ختم کر دینے کی کوشش میں ایک دوسرے سے آگے بڑھ جانے میں مصروف ہیں

لیکن اس تصویر کا دوسرا رخ بھی ہے۔ خدا نے انسان کو پیدا کیا اور اپنی صورت پر پیدا کیا۔ اس لئے انسان کے اندر جو روح مقید ہے وہ بھی اپنی انتھک کوششوں میں مصروف ہے اور ذہنی، اخلاقی اور روحانی سرحدوں پر برتری حاصل کرنے کے لئے جنگ جاری رکھے ہوئے ہے۔ لیکن اس جنگ میں بھی کچھ دقتیں ہیں۔ کچھ خطرے ہیں۔ ذہنی اور روحانی سرحدوں پر آزادی کے جو علمبردار رہے ہیں اُن کو انسانیت کی بہتری کی خاطر بہت سی مصیبتیں اٹھانی پڑی ہیں اور بہت کچھ قربانیاں دینی پڑی ہیں۔ ان کو انسان کی ذہنی، اخلاقی، مذہبی یا روحانی آزادی کے راستے میں جہالت، توہم، بے حسی، تعصب، مخالفت اور نہ جانے کن کن حریفوں سے سابقہ پڑا ہے۔ یہ سب ایسے ہی لوگوں کے شاندار کارناموں کا نتیجہ ہے جو انسانیت کے پاس سچائی اور بھلائی کچھ نظر آتی ہے اور

فنون لطیفہ، سائنس، فلسفہ، اخلاقیات اور مذہب میں کچھ حسن دکھائی دیتا ہے
قوموں کے علاقہ واری فتوحات کے برخلاف ان روحانی فتوحات کا یہ خاصہ ہے
کہ یہ فوراً ساری نسل انسانی کی ملکیت ہو جاتی ہیں۔ یہی میرے نزدیک انسانی
تہذیب اور تمدن کا ایسا وصف ہے جو باوجود ان کے ایجاد کرنے ملکوں کے
اثر کے نمایاں رہتا ہے۔ فنون، مذہب، سائنس یا فلسفہ میں جو تہذیب نظر آتی
ہے وہ ساری انسانیت کے لئے سعادت، مسرت اور روشن خیالی کا سرچشمہ
رہی ہے اور ہمیشہ رہے گی۔ چنانچہ تاج محل کو دیکھ کر جو خوشی ہوتی ہے اور دل
میں جو نئے خیالات جگہ پاتے ہیں وہ وہی ہوتے ہیں جو جنوبی ہند کے کسی
خوشنما مندر، برما کے پگوڈا (بتکدہ) یا یورپ کے گرجاؤں اور خانقاہوں کے گاتھک
طرز تعمیر کے دیکھنے سے پیدا ہوتے ہیں۔ یہی حال نقاشی، شاعری، موسیقی، رقص،
فلسفہ، سائنس اور مذہب کا ہے۔ انسانیت نے جو تہذیبی کامیابیاں حاصل
کی ہیں ان پر کسی ایک قوم یا ایک مذہب کا قبضہ بلا شرکت غیرے ہرگز نہیں
ہے۔ پس جو لوگ تہذیبوں، مذہبوں، یا تمدنوں کے تصادم کا کبھی کبھی ذکر کرتے
ہیں وہ بلا سوچے سمجھے ایسا کہتے ہیں۔ تمدن کیا ہے؟ تہذیب کا محسوس مظہر ہے۔
تمدن اور تہذیب میں جو ایک ذاتی صفت ہمہ گیریت کی ہے اسی کی بدولت
دنیا کے لوگوں کی روزمرہ زندگی میں ان کی مقامی ضروریات اور حالات کے لحاظ
سے بغیر کسی خارجی اثر کے گھل مل جاتے ہیں خواہ ان کی پیدائش کسی ملک میں
کیوں نہ ہوئی ہو۔ جتنے جھگڑے پیدا ہوتے ہیں وہ ان برے جذبات کی وجہ
سے پیدا ہوتے ہیں جن کو آج کل کے ایک خاص قسم کے سیاست داں ابھارتے

اور پروان چڑھاتے ہیں اگرچہ خود اُن سیاست دانوں پر یہ مثل صادق آتی ہے کہ آنکھ کے آگے ناک سوجھے کیا خاک۔ انسان کی روح کے اندر جو ایک ذاتی طلب آزادی حاصل کرنے کی ہے بلکہ یوں کہیئے کہ ناقابل حصول کو حاصل کرنے کی ہے وہ بار بار ابھرتی رہی ہے بالخصوص اس وقت جب کہ زندگی کے حالات اس قدر خراب ہو جاتے ہیں کہ انسان کی ذہنی اور روحانی ترقیوں کو خطرہ لاحق ہو جاتا ہے اور انسانی سوسائٹی کی فطری اپج کا دم گھٹنے لگتا ہے۔

تاریخ میں سماجی، مذہبی یا سیاسی انقلاب جتنے ہوئے ہیں وہ اس بات کی کافی سے زیادہ شہادت دیتے ہیں کہ انسان کی سماجی اور مذہبی زندگی میں جو بے ترتیبی پیدا ہو جاتی ہے اس میں انسان کی روح کے مطالبات کی مطابقت میں اصلاح ہوتی رہتی ہے۔ فرانس کا بڑا انقلاب جس کی بنیاد آزادی، مساوات اور اخوت پر تھی، یا روس کا انقلاب زار کی حکومت کے مظالم کے خلاف یورپ کی جدید سیاسی تاریخ کی وہ مثالیں ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ انسان کی آزادی کی تڑپ کو کچلنے کے لئے جو ہمالیائی کوششیں کی گئیں ان کا کامیاب مقابلہ انسانی روح نے کس طرح کیا ہے۔ خود ہمارے زمانے میں قوت یا تشدد پر جو پورا بھروسہ کیا گیا تو اس کا ردعمل پیدا ہوا اور وہ بھی سچ اور اہسا کے تجربوں کی صورت میں ہوا جس کی رہنمائی ہمارے زمانے کے دو روحانی لیڈروں کاؤنٹ ٹالسٹائی اور مہاتما گاندھی نے کی۔

جس طرح دن کے بعد رات آتی ہے اور روشنی کے بعد تاریکی ہوتی ہے اسی طرح انسانی تاریخ میں اصلاح اور احیا کے دور کے بعد بے عملی، غفلت اور کاہلی کے دور آتے ہیں۔ پھر جس طرح ہر دن جو نکلتا ہے وہ اپنے ساتھ نئی توانائیاں نئی امیدیں

اور نئے خیالات لاتا ہے اسی طرح انقلاب اور بیداری کی ہر لہر آزادی کے نئے منظر پیش کرتی ہے اور سرگرمی اور تمناؤں کے نئے میدان کھل جاتے ہیں۔ اس نقطۂ نظر سے تاریخ اپنے کو کبھی نہیں دہراتی۔ انسانیت دائرے میں حرکت نہیں کرتی۔ یہ کہنا حقیقت سے زیادہ قریب ہوگا کہ تمام تاریخی تحریکیں دائری حرکت نہیں کرتیں بلکہ وہ مرغولہ یا پیچ کی سی حرکت کرتی ہیں یعنی ایک بلند سے بلند تر سطح پر حرکت کرتی ہیں۔ خیر کوئی بھی صورت ہو فرانس اور روس دونوں کے انقلاب سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ان میں انہی تصورات کی بناء پر ابتداء میں جو جوش و خروش تھا وہ عرصہ تک قائم نہیں رہ سکا۔ یہ انسان کی بدقسمتی ہے کہ جب سیاسی مقصد ایک حد تک حاصل ہو جاتے ہیں اور اس کے فوائد سے کچھ عرصہ تک فائدہ حاصل کر لیا جاتا ہے تو ان تصورات کی چمک دمک ذرا کم ہو جاتی ہے اور پھر انقلابی رہنماؤں کے پیروؤں میں ان کی طرف سے کوئی کشش باقی نہیں رہتی۔ اس کی بجائے ہوتا یہ ہے کہ قومی طاقت کا جو احساس ہونے لگتا ہے تو وہ لوگوں میں علاقہ کے حصول کے جذبات ابھارتا ہے جو اندرونی خلفشار کے زمانے میں دبے رہتے ہیں۔ بس ان کے تصورات کی قدر و قیمت اس سے زیادہ نہیں کہ دنیا کے سیاسی بازار میں اُن کی بدولت کچھ پرو پاگنڈا ہو جاتا ہے۔

١١٦

نعروں اور تصورات کی سرحد

اس طرح نعروں اور تصورات کی اس نئی سرحد پر آج کی دنیا انسانی آزادی کی اس زبردست کشمکش میں مبتلا ہے۔ ۱۹۱۴ء سے ۱۹۱۸ء تک جو جنگ عظیم برپا رہی اس میں بقاء اصلح کے مقابلے میں "اقلیتوں کے حق خود اختیاری" کا نعرہ اتحادیوں نے بہ بانگ دہل

سنایا۔ ۱۹۱۸ئہ میں جب اتحادیوں کو فتح ہوئی تو یہی نام نہاد اقلیتی قوموں کے امن اور سلامتی کے راستے میں روڑے بن کر اٹکیں۔ اسی طرح جو عالمگیر جنگ پچھلے دنوں ختم ہوئی وہ فاسسطیت کے خلاف جمہوری اداروں کی حمایت میں لڑی گئی۔ اس جنگ کے ختم ہونے کے بعد آج ہمارے ملک میں بھی ایسی علامتیں موجود ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ بڑی بڑی سیاسی پارٹیاں کسی نہ کسی قسم کی فاسسطیت کے تحت پناہ لے رہی ہیں۔ اس کو چاہے آپ "نیک نیت فاسطیت" کہہ لیجئے لیکن اس میں بھی تمام وہ ہیبت ناکیاں موجود ہیں جو اس خطرناک اصول کی ذات میں شامل ہیں۔ پھر بتایا جائے کہ بڑی یا چھوٹی قوموں کی قسمت کے بنانے اور آزادی کے حاصل کرنے میں ان سیاسی تصورات اور نعروں کا کیا مقام ہے؟

صاف اور سیدھی بات تو یہ ہے کہ نعروں کی ماری آج کی مہذب دنیا سچی جمہوریت کے اصول اور عمل کی قدر کرنے کے لئے ابھی تک تیار نہیں ہے۔ اس کا سبب تلاش کچھ زیادہ مشکل نہیں ہے۔ ایسی جمہوریت جس کی بنیاد ووٹوں کی اکثریت کی میکانکی ترکیب پر ہو وہ دراصل مطلق اکثریت پر قائم کی ہوئی فاسطیت سے کچھ زیادہ مختلف نہیں ہوتی ایک صورت میں مخالفت جزوی طور پر ختم کی جاتی ہے اور دوسری طور پر مکمل طور پر۔ ہر دو صورتوں میں پروپاگنڈا سے کام لیا جاتا ہے اور ایک ماہرفن کی حیثیت سے تمام تکلیف دہ واقعات سے انکار کیا جاتا ہے اور سچائی کو توڑ مروڑ کر رکھ دیا جاتا ہے۔ قومی رہنماؤں کی سرپرستی میں آج کل کے سیاسی چور بازاروں میں بہلاوے پھسلاوے اور ڈراوے دھمکاوے وغیرہ سے

کام لیا جاتا ہے۔ ستمبر ۱۸۹۵ء کے اٹلانٹک منتھلی میں پریذیڈنٹ ولسن نے اپنے ایک مضمون کے دوران میں سچی جمہوریت کے بنیادی شرائط کا یوں ذکر کیا تھا:۔

"یہ فرض کر لینا ایک بنیادی غلطی ہے کہ جمہوریت ایک نظریے پر قائم ہے اور وہ سوائے ایک طرز حکومت کے اور کچھ نہیں ہے۔ دراصل وہ کردار کی ایک صورت ہے اور اگر کامیاب ہو تو قومی کردار کی۔"

پس جہاں لوگ نعروں اور اشتہاری تصورات پر چلتے ہوں، جہاں ادنیٰ قسم کے جذبات بھڑکا کر عقل اور سمجھ کو مفلوج کر دیا جاتا ہو، جہاں اقتداری سیاسیات الکوہل کی طرح لیڈروں اور وزیروں کو بدمست کر دیتی ہو، جہاں پڑھے نہ لکھے نام فاضل قسم کے لوگ وزیر تعلیمات بنائے جاتے ہوں، جہاں طالب علم بڑی تعداد میں یونیورسٹیوں سے چال چلن کے نام سے خارج کئے جاتے ہوں وہاں اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ اصول اور کردار کے لوگ جمہوری حکومتوں اور اداروں کو چلائیں گے؟

جابر اقلیتوں اور فاسد اکثریتوں کے درمیان مہذب

چار آزادیاں جمہوریت کو آج نئی قسم کی آزادی پیش کی جاتی ہے۔ پریذیڈنٹ روزولٹ کے قول کے بموجب، یہ قسم "چار آزادیاں" کہلاتی ہے۔ اس کا مطلب ہے محتاجی سے آزادی، خوف سے آزادی، تقریر کی آزادی، آزادانہ ملنے ملانے اور پرستش کی آزادی۔ یہ البتہ سمجھ میں مشکل سے آتا ہے کہ ان سب سے انسانی آزادی کو کیا ترقی حاصل ہوتی ہے۔ آج کے مہذب انسان کی ضروریات کی حدود کیا ہیں؟

جن کی بھوک ایک فرانسیسی مثل کے بموجب کھانے سے بڑھتی ہے۔ پس آزادی کی ہر طرف پکار ہے، تعلیم حاصل کرنے کی آزادی، جسمانی طاقت بڑھانے کی آزادی، اچھے اور صحت بخش مکانوں میں رہنے کی آزادی، طلاق دینے کی آزادی، بیماری سے آزادی وغیرہ وغیرہ۔

حقیقی آزادی

پس ایسی "آزادیوں" کے کوئی حدود نہیں۔ یہ آزادیاں کیا "آشا زادیاں" ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ دنیا کے جدید سیاست دانوں کے دماغوں میں آزادی کا بنیادی تصور ہی غلط ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس بات سے واقف نہیں ہیں کہ آزادی انسانی روح کا ایک لازمی اور ذاتی خاصہ ہے۔ اس حیثیت سے وہ سیاسی تحفہ یا بخشش نہیں ہو سکتی اور نہ اس کا لین دین ہو سکتا ہے۔ روح کی اس ذاتی خاصیت کی وجہ ہی سے کہا جاتا ہے کہ انسان "خدا کی صورت" پر بنایا گیا ہے۔ بہت سے سیاست دان جو کچھ کر سکتے ہیں یا انہیں کرنا چاہیئے وہ یہ ہے کہ آزادی کے اس جوہر کو سیاسی غارتگروں کے دخل در معقولات سے بچائیں۔ اس کے علاوہ سورج کی روشنی یا آسمانی نغموں کی طرح ناقابل تقسیم ہے۔ آزادی کی کوئی سرحدیں نہیں ہوتیں اور نہ وہ ان کو برداشت کرتی ہے۔ یہ غور کرنے کی بات ہے کہ بالکل فطری ماحول میں رہنے والا فطری انسان آزادی کا صحیح مفہوم کس طرح قائم کرتا ہے۔ اس کی تائید میں ہم یہ واقعہ پیش کرتے ہیں کہ امریکہ، روس، فرانس، اٹلی، ہندوستان وغیرہ کے نمائندوں کی ایک پارٹی میکسیکو کے قلب میں رہنے والے چند قبائل کے ملک میں گئی۔ پارٹی کے ساتھ جو ترجمان تھا اس نے

ان سب نمائندوں کا تعارف اُن کے ملکوں اور سیاسی یا قومی سرداروں کے
نام مثلاً پریزیڈنٹ روزولٹ، اسٹالن وغیرہ سے کرایا۔ ان قبیلوں کا سردار
ان بڑے بڑے ناموں کو سن کر منتاثر نہ ہوا لیکن جب امریکہ کے تجارتی وفد
کے ہندوستانی نمائندے کی باری آئی اور اس کا تعارف یوں کیا گیا کہ وہ مہاتما
گاندھی کے ملک سے آتا ہے تو ایک دم وہ قبائلی سردار ہمہ تن جوش بنگیا اور
دوڑ کر اس نمائندے کو گلے سے لگا یا۔ خود ہمارے ملک میں اس کی مثال راجہ
رام موہن رائے کی ذات میں ملتی ہے جن کو جدید ہندوستان کا باوا کہنا موزوں
ہوگا۔ جنھوں نے سو برس ادھر ہندوستان کی حقیقی آزادی کے لئے زندگی تج
دی۔ ایک روز راجہ نے اخباروں میں یہ خبر پڑھی کہ اطالوی فوجیں نیپا لیئن
جمہوریہ میں گھس گئیں اور اس کی آزادی کو کچل ڈالا۔ دنیا (جو سو برس ادھر آج
سے زیادہ وسیع تھی) کے ایک دور دراز گوشے میں آزادی کے کھوئے جانے کا
راجہ پر اتنا اثر ہوا کہ اس روز ٹاؤن ہال میں جو ڈنر ترتیب دیا گیا تھا اس میں وہ
شریک نہیں ہوئے۔ پس قبائلی سردار ہو یا راجہ دونوں کو انسانیت کے
ایک طبقہ کا آزاد ہونا یا اس کی آزادی کا چھن جانا ان کا ذاتی معاملہ بن جاتا
تھا۔ اس کے بالکل برعکس آج کل کے سیاست داں کا رویہ ہوتا ہے۔ آج
کل کی سیاست میں دوسرے کا نقصان ہمارا نفع ہے۔ سچا انسان انسانی آزادی
کے علمبرداروں کی ہمیشہ قدر کرتا ہے خواہ وہ کہیں ہوں۔ آج کا مہذب
سیاست داں اپنے ہی قومی لیڈر کا پرستار ہوتا ہے۔ اور یہ لیڈر صرف
اپنی ہی قوم کی آزادی کی فکر کرتا ہے۔ اکثر و بیشتر اس کی قوم اس کے مذہب

یا نسل کی جماعت ہوتی ہے۔ باقی ساری دنیا اس کے دائرۂ عمل سے خارج
ہو جاتی ہے اگرچہ ان میں اس کو رہنا سہنا ہی کیوں نہ پڑے۔ ساری دنیا میں
جو سیاست داں ہیں خواہ چھوٹے ہوں یا بڑے ان میں سے اکثر ایسے ہیں کہ ان کا
رویہ اقتدار پسند، تنگ نظر، محدود اور جارحانہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج کل
کی جس سیاست کا اتنا پرچار کیا جاتا ہے وہ انسان کی آزادی کے لئے اور اس
لئے دنیا کے امن کے لئے خطرہ بن گئی ہے۔ ہمارے اس زمانے کی سیاسیات
اخلاقی معیاروں سے اس قدر خالی ہے کہ جو شخص بے گناہوں کے قتل عام کا
ذمہ دار ہوتا ہے اس کو سولی پر لٹکانے کی بجائے اکثر و بیشتر ہیرو کا مقام عطا
کیا جاتا ہے۔ اور جو شخص انسانی آزادی کے لئے دنیا بھر کی مصیبتیں برداشت
کرتے ہوئے اپنی جد و جہد جاری رکھتا ہے وہ آسانی سے قاتلوں کا نشانہ بنجاتا ہے

محض سیاسی آزادی فریب ہے

تو ظاہر ہے کہ اخلاقی اور روحانی بنیاد کو الگ
کر دیجئے تو سیاسی آزادی خود اپنی نفی ہے۔
سیاست داں جو آزادی حاصل نہیں کر پاتا اور دنیا میں امن و امان قائم رکھنے میں
کامیاب نہیں ہوتا تو اس کی وجہ نہ صرف خود اس کی ہوس اقتدار ہے جو کبھی سیر نہیں
ہوتی بلکہ اس نے آزادی کا جو تصور قائم کیا ہے وہی غلط معلوم ہوتا ہے۔ اس کے
نزدیک آزادی یہ ہے کہ ایک ہاتھ میں مکھن روٹی ہو اور ایک ہاتھ میں تلوار اور
نیزہ۔ آزادی کے صحیح مفہوم سے کہ وہ انسانی روح کی ایک پیدائشی اور روحانی
صنعت ہے، سیاست داں کا دماغ ایسا ہی بے تعلق ہوتا ہے جیسے لو کان سے
یا موسیقی ناک سے۔ سیاست دانوں کے نزدیک انسان معاشی تناسبوں

کا ایک مجموعہ ہوتا ہے اور اس لئے سیاسی آزادی کی جنگ کا مطلب اس کے سوا کچھ نہیں کہ "دار" اور "نادار" کے درمیان ایک جنگ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہماری سیاست انسان کی مختلف جماعتوں کے حقوق اور امتیازات کا مجموعہ بن کر رہ گئی ہے یہاں تک کہ ایک جماعت کے حقوق اور امتیازات میں دوسری جماعت شریک ہی نہیں ہوسکتی یہی ٹکر سیاست کا بڑا جز بن جاتی ہے۔ آج ہماری سوسائٹی ایسے مردوں اور عورتوں کی ایک جماعت ہے جو ایک دوسرے سے لڑتے جھگڑتے رہتے ہیں۔ کہیں دیکھئے تو زمیندار اور کسان میں ٹکر ہو رہی ہے، کہیں آقا اور نوکر میں، کہیں سرمایہ دار اور مزدور میں، کہیں شاگرد اور استاد میں، کہیں حاکم اور رعایا میں، کہیں میاں اور بیوی میں، اور کہیں مرد اور عورت میں۔ غرضکہ ہمارے زمانے کے مہذب ملکوں کی مہذب سوسائٹیوں میں بھی روزمرہ کا دستور ہے۔ یہ جھگڑے تو تھے ہی اس پر طرہ یہ کہ نسل، مذہب، ذات، رنگ، طبقہ اور آج کل کی اصطلاح میں سیاسی عقیدہ کی بنیاد پر بھی جھگڑے ہونے لگے ہیں۔ چنانچہ برہمن اور غیر برہمن میں ٹھنی ہوئی ہے، ہندو اور مسلم میں چلی ہوئی ہے، یہودی اور عرب سے بگڑی ہوئی ہے، گجراتی اور مہاراشٹری میں لاگ ڈانٹ ہے، کمیونسٹ اور سوشلسٹ میں بیر ہے، سرمایہ دار اور جمہوریت پسندوں میں نہیں نبتی، وغیرہ وغیرہ لطیفہ تو یہی ہے کہ سوسائٹی میں یہ تعلقات صدیوں سے اچھی طرح قائم چلے آتے ہیں لیکن جہاں سیاسی "وجود" کا احساس ہوا اور لڑائی چھڑ گئی۔

رُوحانی اور سیاسی نقطۂ نظر میں فرق

اس نام نہاد سیاسی آگہی کے دور سے پہلے ہر طبقہ اور ہر خیال کے مرد

اور عورتوں میں فرائض کا لحاظ زیادہ تھا۔ چنانچہ امیر غریبوں کا خیال کرتے تھے، حاکم رعایا کا لحاظ رکھتا تھا، آقا نوکر کو نہ بھولتے تھے، میاں بیوی ایک دوسرے کا پاس کرتے تھے۔ ظاہر ہے کہ سوسائٹی میں وفاداری، احترام، محبت، اطاعت، خدمت اور ہمدردی کے جذبات کام کرتے تھے۔ اس کا یہ نتیجہ تھا کہ سوسائٹی کے سب طبقوں میں ایک طرح کا قدرتی توازن قائم رہ جاتا تھا۔ سیاسی نقطۂ نظر زندگی کے اس طرز کے بالکل برخلاف ہے۔ آج ادنیٰ سے ادنیٰ سیاست داں بھی اپنے پیدائشی حقوق اور امتیازات کا ایک پلندہ بغل میں مارے پھرتا ہے اور شاید اسے احساس تک نہیں کہ اس پر کچھ فرائض بھی ہیں اور کچھ ذمہ داریاں بھی ہیں۔ آج کل کے نوجوان کی تربیت میں دانشمندی اور احترام کی کوئی جگہ نہیں۔ پھر کیا تعجب جو یہ خود فریب نوجوان وعظ کہنے والے کو بے نقط سنائے یا سب سے زیادہ پارسا کو گولی کا نشانہ بنادے۔ اگر مردوں اور عورتوں میں اپنے حقوق اور امتیازات کا احساس بجائے زیادہ ہونے کے کم ہو جائے تو موجودہ غیر فطری کشمکش بڑی حد تک کم ہو جائے۔

آزادی کی حقیقی جنگ بات یہ ہے کہ انسانی آزادی کی سرحد پہ حقیقی لڑائی آدمیوں، سوسائٹیوں اور قوموں کے حقوق اور امتیازات کے درمیان نہیں ہے جیسا کہ سیاست داں بتلاتے ہیں بلکہ حقیقی لڑائی جیسا کہ راجہ رام موہن رائے نے اپنے ایک دوست کو خط میں لکھا تھا، آزادی اور زبردستی، انصاف اور بے انصافی، حق اور ناحق میں ہوتی ہے۔ دوسرے الفاظ میں آزادی کی اصلی لڑائی نوعیت میں روحانی ہوتی ہے۔ پس جب تک

اقتداری سیاسیات کو انسانی زندگی کے معاملات میں غلبہ رہے گا اس وقت تک حق اور انصاف کی کوئی بنیاد نہیں قائم ہو سکتی۔ سیاسی آزادی کا نام ہی گویا غلط ہے۔ یہ دراصل ایک طبقہ یا ایک قوم کا دوسرے طبقہ یا قوم پر اقتدار یا حکومت کے لئے ایک پردہ ہے۔

ویدوں، اپنشد اور بھگوت گیتا کی اس پرانی سرزمین پر ہم نظر ڈالیں تو ہم کو شری رام چندر جی، شری بدھا، شری چیتنیا، گرونانک، سنت کبیر، اشوک، راجہ رام موہن رائے، موہن داس کرم چند گاندھی، سوامی دیویکا نند کیشپ چندرسین، دیویندرناتھ ٹیگور، اور نہ جانے کتنے بھگت اور بدھی نظر آئیں گے۔ پس اگر ہم ان تمام نسلوں قوموں اور قبیلوں کی سچی آزادی کے لئے کوشش کریں جو تہذیب اور تمدن کی اس پرانی جنم بھومی کو اپنا دیس سمجھتے ہیں تو ہم ساری دنیا کے لئے ایک مثال قائم کر دینگے اور ان تک تمام گیانیوں کے اس بڑے پیام کو پہنچا سکیں گے کہ جو آزادی سچی اور ہمیشہ کے لئے ہوتی ہے اور جو انسانوں میں امن اور خوشدلی پیدا کرتی ہے اس کی لڑائی صرف روحانی سرحد پر لڑی اور جیتی جاتی ہے اور سیاسی عقیدوں کی سرحد پر اس لڑائی میں ہار ہی ہار ہوتی ہے۔ دنیا دوراہے پر کھڑی ہے۔ اس کو بربادی کی "ایٹمک" قوتوں اور امن اور خوشحالی کی "آتمک" (روحانی) قوتوں کے درمیان انتخاب کرنا ہے۔

مترجمہ: پروفیسر نصیر احمد عثمانی
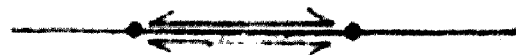
ہماری

آزادیٔ ہند کی دوسری سالگرہ کا علمی پیشکش

اُشوک اعظم کا مسلکِ انسانیّت

(از)

پرُوفیسر ڈاکٹر ایشور ناتھ ٹوپا۔ ڈی، فل (فرائبرگ)

۱۵- اگست ۱۹۴۹ء

تیسری صدی قبل مسیح میں موریا خاندان کی حکومت عروج پر تھی۔ اس راج میں ہندوستان کے سیاسی تصورات اپنے انتہائی نقطۂ کمال پر پہنچ چکے تھے۔ موریا سلطنت کے وزیر اعظم، کوٹلیا نے اپنی قابل قدر تصنیف "ارتھ شاستر" میں اُس زمانے کی سیاسی بلند نظری (آئیڈیل) اور ان کی عملی صورتوں کا ذکر نہایت شرح و بسط کے ساتھ کیا ہے۔ کیونکہ سیاسی اصولوں کو عملی جامہ پہنانا، اور ان میں شدت پیدا کرنا، سلطنت کے مقاصد کو ترقی دینا، حکومت کے مفادات کی حفاظت کے علاوہ آئین شاہی کی تائید و حمایت بھی اس کے اہم فرائض میں داخل تھے۔

کوٹلیا کے اصول کے مطابق کوئی حکومت عوام کی خوش حالی اور صلاح و فلاح کا کام اس وقت تک حسن و خوبی کے ساتھ انجام نہیں دے سکتی، جب تک وہ تمام سیاسی قوتوں کو ایک خاص منصوبے کے تحت منظم نہ کرلے۔ چنانچہ اسی اصول کے پیش نظر، انتھک کوششوں کے ساتھ اس نے ساری سیاسی قوتوں کو ایک ہی مرکز پر (یعنی بادشاہ کی ذات میں) جمع کر دیا تھا تاکہ امور سلطنت اور موریا شہنشاہیت میں استحکام و ہم آہنگی پیدا ہو جائے اور بلا کسی مزاحمت کے دونوں آزادانہ طور پر اپنا کام جاری رکھ سکیں۔ موریا سلطنت بالکلیہ سیاسی ادارہ تھی۔ اس کے گوناگوں عناصر میں وحدت پیدا کرنے والی تمام رہنما قوتوں نے بادشاہی ادارے میں نہ صرف

استحکام وزندگی کی روح پھونکی تھی، بلکہ اس میں سیاسی تدبر کا بھی خاطر خواہ اضافہ کر دیا تھا۔ مختصر یہ کہ موریا سلطنت سیاست اور اُن کے تمام اصولوں کو ایک دوسرے میں سمو کر ترقی کر رہی تھی۔

اشوک اعظم نے موریا خاندان کی روایات اور عقائد ہی میں تعلیم حاصل کی تھی۔ اس کی شخصیت میں موریا روایات کی روح مجسم بن چکی تھی بہ الفاظ دیگر وہ ان روایات کا مجسمہ یا اوتار تھا۔ وہ موریائی سیاسی طرز تفکر(Thinking) کی پیداوار تھا، کیونکہ اسی انداز سے سوچنے والا نفس، اس کو ورثہ میں ملا تھا۔ موریائی سیاست کی برتری کے تصور کو ایک ٹھوس حقیقت میں تبدیل کرنے کی غرض سے اس نے کلنگ کے ساتھ خونی جنگ چھیڑ دی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اس جنگ کے زمانے تک اشوک کی شخصیت کے ہر پہلو میں، یہی موریائی روایات اور عقائد کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ بودھی روایات میں "چانداشوک" کی مثال غالباً موریائی خصوصیت کی حامل ہے، جس نے اشوک کے نفس میں موریا سیاست کے عملی اور نظری پہلو کو بے نظیری کے درجہ تک بلند کر دیا تھا۔ لیکن بدھ مت کی دنیا میں موریائی تصور پرستی، مختلف قسم کے مقاصد کو حاصل کرنے میں، نہایت پست، ناکارہ اور ضرر رساں ثابت ہوتے ہیں۔

عوام کی زندگیوں کو تہذیب و شائستگی سے آراستہ کرنا، بدھ مت کے پیروؤں کا عظیم ترین مطمح نظر تھا۔ اس کے برعکس موریائی پیرو، انسانی فلاح و بہبود کی بنیادی قدروں کا موازنہ کئے بغیر انہیں سیاسی رنگ میں رنگنا چاہتے تھے۔ دونوں جماعتوں کے نقاط نظر ایک دوسرے کے بالکل متضاد تھے۔ اگر موریائی مطمح نظر، زندگی کی

ایسی باقاعدگی کی تائید کرتا تھا، جس کی بنیاد سراسر سیاسی اصولوں پر رکھی گئی ہو تو اس کے مقابلے میں بودھی نقطۂ نظر بھی زندگی کی اس باقاعدگی کو ترجیح دیتا تھا، جو تہذیب و شائستگی کی قدروں کو عملی جامہ پہنا سکے۔ پس معلوم ہوا کہ موریائی اور بودھی نقاط نظر کے تصادم سے وہ راز فاش ہو جاتا ہے، جس کے ذریعہ "چانداشوک" اپنی ہیئت بدل کر "دھرم اشوک" کا روپ دھار لیتا ہے۔ شاہ باز گڑھی کی تیرھویں چٹان پر کندہ کیا ہوا فرمان، نہ صرف موریا سلطنت کے چانداشوک، کی نمایاں خصوصیت کا ایک حقیقی ثبوت ہے، بلکہ اشوک کی شخصیت میں جو دوررس تبدیلیاں پیدا ہو چکی تھیں، اس کی بھی چغلی کھاتا ہے۔

کلنگ کی جنگ نے اشوک کو ایسی شاہی اقتدار رکھنے والی سیاسی تنظیم کے فطری خطرات سے آگاہ کر دیا تھا، جو انسانی فلاح و بہبود کے نام سے مستقل طور پر قائم کی جاتی ہیں۔

اشوک چونکہ شدت کے ساتھ سیاسی مملکت کی روحانیت کش نوعیت کو اپنی آنکھوں سے دیکھ چکا تھا، اس لئے مملکت کی بقا اور اس کے نظم و ضبط کو چلانے والے سیاسی اصولوں سے وہ یہاں تک نفرت کرنے لگا تھا کہ آخر میں ان اصولوں نے اس کے نفس میں شدید قسم کے رد اعمال پیدا کر دئے تھے۔

اشوک سیاسی مملکت کو نچلی جبلتوں کی ایک ٹھوس شکل سمجھتا ہے۔ اور سمجھتا ہے کہ ان جبلتوں کی نکاسی کا راستہ اور مظاہرات کا طریقہ، صرف سیاست ہی کے میدان میں دیکھا جاتا ہے۔ ایسی مملکت، اپنے مقاصد کو حاصل کرنے کیلئے، بلا کسی افسوس اور ندامت کے، بے دریغ بنی نوع انسان کا خون بہا دیتی ہے۔ انسانوں میں

نفاق کو ہوا دینے اور نفرت کے جذبات بھڑکانے کے علاوہ ایسے جذبات کی
پرورش بھی کرتی ہے، جو عوام میں دہشت، خوف و ہراس پیدا کر کے اپنی مکروہ
سیاسی برتری کو منواتی ہے۔ سیاسی اقتدار کے بھونڈے اور بدوضع آلۂ کار کی
حیثیت سے، سیاسی مملکت انسان کی شخصیت کو ذلیل و خوار بنا کر رکھ دیتی ہے۔

کلنگ کی جنگ میں انسانی خون سے اپنے ہاتھ رنگنے کے بعد، اشوک پر یہ
راز منکشف ہوا کہ موریا سلطنت کے قلب میں تک گھن لگ چکا ہے اور سڑاند
پیدا ہو گئی ہے۔ مزید اس حالت کو برقرار رکھنا، گویا بدی کو منظم شکل میں قائم
کر دینے کے مترادف ہوگا۔ موریا سلطنت اصل میں ایسی شیطانی قوت کے مماثل تھی،
جو بہ ظاہر نیکیوں کا لبادہ اوڑھے ہوئے تھی۔ شاہ باز گڑھی کی تیرھویں چٹان کا
فرمان موریا فرمانروا کے سیاسی اصولوں کی لغویت کا وہ جیتا جاگتا اقرار نامہ ہے،
جو آج تک محفوظ ہے۔

اشوک کی نظر میں، جنگ نہ صرف انسان میں بیماری اور بیرحمی پیدا کر دیتی
ہے، بلکہ تمام انسانی احساسات اور شریفانہ جذبات کا گلا بھی گھونٹ دیتی ہے۔ جنگ
ہی کے ہاتھوں، سماج، تہذیب و شائستگی، فنا کے گھاٹ اترتے ہیں۔ اقتداری
سیاست کے قوانین، مختلف ممالک کے درمیان دشمنی کا بیج بوتے ہیں۔ سیاست کی
روح، جنگ ہی کی بدولت پروان چڑھتی ہے۔ جنگ نے کبھی بھی حق و ناحق کا
تصفیہ کیا ہے اور نہ کر سکتی ہے۔ اقتدار کی فتح، ہرگز حق کی فتح نہیں ہوتی۔ سیاست
کی کامیابی اور جنگ کی فتح، سیاسی دانشمندی خیال کئے جاتے ہیں۔ لیکن اشوک
کے اخلاقی معیار میں اس طرح حاصل کی ہوئی فتح، ہرگز حقیقی فتح نہیں ہوتی۔ اس قسم

کی فتح کا نفسیاتی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ فاتح اور مفتوح کے درمیان ایک دائمی جنگ چھڑی رہتی ہے۔ فاتح اور مفتوح کے تعلقات، انسانی قدروں پر قائم نہیں ہوتے۔ فاتح ہمیشہ فاتح بنا رہتا ہے اور مفتوح کو ہمیشہ مفتوح ہی رکھا جاتا ہے۔ ان دونوں طبقوں کے مقاصد میں نہ تو کوئی اشتراک ہوتا ہے، اور نہ تصورات میں ہم آہنگی اور نہ مفادات میں یکسانیت اور نہ سماجی وحدت ہی ممکن ہوتی ہے۔ اس طرح جنگ، کو ختم کرنے کے بجائے وہ خود بخود مستقل صورت اختیار کر لیتی ہے۔

سیاست کے نکمے اور بھونڈے اصولوں کی افادیت سے انکار کرتے ہوئے، عوام میں خوش حالی اور فارغ البالی پیدا کرنے کے لئے، اشوک نے اپنی سلطنت کی بنیادوں کو رحم دلی اور خدا ترسی کے وسیع تر اصولوں پر قائم کیا۔ اور کوٹلیا کے اس دعوے کی تردید کی کہ سلطنت کی فلاح و بہبود، عوام کی خوشحالی پر دلالت کرتی ہے۔ وہ سمجھتا تھا کہ انسان اور سماج کا وجود ہرگز سلطنت کے لئے نہیں بلکہ مملکت کی حقیقی غرض و غایت انسان اور سماج کی خوش حالی میں مضمر ہے۔ کیونکہ انسانی فلاح و بہبود کے علاوہ اور کسی مقصد کے لئے سلطنت وجود میں نہیں آتی۔ یہی وہ بنیادی فرق ہے جو اشوک راج اور موریا راج میں پایا جاتا ہے۔ چونکہ اشوک راج کا ہمہ گیر اصول انسانی فلاح و بہبود ہی تھا، اس لئے اس کے تمام فرامین سے یہ بات صاف طور پر مترشح ہوتی ہے کہ اس کی زندگی کا ہر لمحہ بنی نوع انسان کی خوش حالی اور فارغ البالی کے لئے وقف تھا۔ اس طرح پر اس نے مملکت اور عوام کی درمیانی خلیج کو پاٹ کر دونوں کے مشترک مفادات، توقعات، اور اغراض کو پیش نظر رکھتے ہوئے، بالکل نئے رشتوں پر اپنی سلطنت کی بنیاد رکھی۔

اپنے فرامین کے ذریعہ اشوک نے اپنی رعایا پر یہ ثابت کر دیا کہ وہ ان کا مشفق باپ ہے۔ اور عوام اس کے چہیتے بچے ہیں، اور حکومت کے عہدہ داران بچوں کی رکھوالی یا نگرانی کرنے والی آیا کی حیثیت رکھتے ہیں۔ حکمرانی کرنے کے یہ وہ طریقے تھے، جن کو اختیار کرکے اشوک نے اپنے نقطۂ کو اس صفائی سے پیش کر دیا کہ اس میں ذرا بھی شک و شبہ کی گنجائش باقی نہ رہی کہ عوام اور سلطنت کو مربوط و متحد کرنے والے انسانی رشتے، خوف و ہراسانی، استحصال اور فتوحات کی بنیادوں پر ہرگز مضبوط و مستحکم نہیں نہیں رہ سکتے۔ پس اسطرح اس نے خوف، دہشت اور دوسرے مظالم کا مکمل طور پر خاتمہ کرکے ایسی سیاست کے لئے راستہ صاف کر دیا، جس کی بنیاد پدرانہ رشتوں پر قائم کی گئی تھی۔ اہمسا جیسا انسانیت پرستی کا اصول، اشوک کی ساری کارروائیوں کا محور تھا۔ پدرانہ حکومت کے اصول پر کاربند ہونے کی وجہ سے، اس کو اپنے فرائض اور دیگر ذمہ داریوں کا بڑا گہرا احساس ہو گیا تھا۔ ایک مشفق باپ کی طرح وہ اپنے فرائض کو انجام دینے کیلئے ہر وقت تیار رہتا تھا، تاکہ عوام، بچوں کی طرح اپنے محبوب باپ کے ہر وقت ممنون اور شکر گزار رہ سکیں۔ اس طرح تہذیب و شائستگی کے رنگ میں ڈوبی ہوئی اشوک کی سلطنت، ایک بہت بڑے خاندان کی شکل میں تبدیل ہو گئی، جس کو چلانیوالا قانون، ایک محبت بھرے دل کا قانون تھا۔

اشوک کے پدرانہ قانون پر صرف اسی کی سلطنت میں عمل نہیں ہوتا تھا، بلکہ اہمسا کے اصول کے ذریعہ وہ اپنے شفقت آمیز پدرانہ پیام کو دوسری ریاستوں کے عوام تک بھی پہنچایا کرتا تھا۔ اس طرح وہ دوسرے عوام میں بھی اس بات کا یقین پیدا کر دیتا تھا کہ وہ کسی طرح اس کے رویہ سے خوف زدہ نہ ہوں، کیونکہ وہ ان سب کو بھی

اپنے بچوں کے برابر سمجھتا ہے۔ اور ایک مشفق باپ کی طرح وہ ان کی خوش حالی اور فارغ البالی کا دل سے خواہاں ہے۔ سیاسی برتری کے قیام و استحکام، بین الاقوامی سفارتی تعلقات اور ان کی ہر جہتی حکمت عملی، جاسوسی اور سراغ رسانی کی کارروائیوں، حتیٰ کہ سیاسی پروگینڈا جیسے سیاسی مقاصد اور امور مملکت کی گہرائیوں تک، اشوک کا پدرانہ اصول برابر سرائت کئے ہوئے تھا۔

اقتداری سیاست کے قانون کو فنا کرکے انسان کی شخصیت کو مذہب انسانیت کے اصولوں پر ترقی کرنیکا موقع فراہم کرنے کے لئے، اشوک کی یہ دلی خواہش تھی کہ تمام ملک ایک خداترس اور انسانیت پرست تہذیب کے قالب میں ڈھل جائے، اشوک کی ایسی رہنمائی کرنیوالی تلقین، انسان کے حق میں نئی تہذیب کیلئے مشعل راہ تھی۔

اشوک کے فرامین چونکہ انسانی فلاح و بہبود کیلئے دعوے کیساتھ نئے اشتراک عمل، نئے احساسات اور نئی بصیرت کا پیام سناتے ہیں، اس لئے سیاسی قوانین کو چیلنج دینے والے سارے اصولوں پر اشوک کے فرامین کو بہرصورت ترجیح حاصل ہے۔ تمام سیاسی قوتوں، حکومت کے اصولوں اور مملکت کے مختلف النوع مقاصد کو مکمل طور پر تہذیب و شائستگی کے رنگ میں رنگ دینے کا اشوک نے تہیہ کرلیا تھا چنانچہ اس نے اپنے سارے فرامین میں اسی چیز کو عوام تک پہنچایا ہے کسی ندامت اور پشیمانی کو محسوس کئے بغیر اشوک نے موریا راجاؤں کی تخلیق کی ہوئی سلطنت کو اپنے ہاتھوں تباہ و برباد کردیا۔ یعنی موریا راجاؤں کی بنائی ہوئی سیاسی سلطنت نیست و نابود ہوگئی اور اس کی جگہ اشوک کی وہ سلطنت قائم ہوگئی، جو تہذیبی قدروں کی تائید کرتی اور انہیں ترقی دیتی تھی۔

سیاسی اقتدار کا نشہ اُترنے کے بعد، جن اصولوں سے اس نے سکون قلب حاصل کیا وہ بدھ مت ہی کے اصول تھے معلوم ایسا ہوتا ہے کہ بدھ کی روحانی و باطنی رَو، اشوک کی بڑھتی ہوئی شخصیت میں غیر محسوس طریقہ پر سرایت کرکے موثر تبدیلیوں کا باعث بنی تھی۔ چنانچہ کلنگ کی جنگ نے اس کو ازسرتا پا لرزہ براندام کر دیا۔ اور اسی وقت سے اشوک فلسفۂ عمل کی حیثیت سے بدھ مت کی اہمیت کا قائل ہو گیا۔ اشوک دنیا کو کبھی ترک نہیں کیا اور نہ نروان کی تلاش میں زندگی کی کشمکش سے دور جمودی دنیا میں گوشہ نشینی اختیار کی کشمکش حیات میں مہاتما بدھ کا پیام، اس کیلئے الہام کا درجہ رکھتا تھا۔ بدھ مت کا یہی وہ زبردست پہلو ہے، جو سازِ دل کے اندرونی پردوں کو متاثر کرتا ہے۔ اشوک ایک باعمل انسان تھا۔ ایک شکست خوردہ آدمی کی طرح ہتھیار ڈال دینا، اس کی فطرت کے خلاف تھا۔ عملی انسان کی حیثیت سے مضطرب ہو کر ہتھیار کھول دینا، خود اس کے بہترین اوصاف کا ایک ثبوت ہے۔ دنیا سے منہ موڑنا، اشوک جیسے انسان کے لئے ممکن نہ تھا۔ بدھ مت نے اس میں عمل کی روح پھونکی تھی۔ اور عمل کاری کے اسی اثر نے، سماجی خوش حالی اور انفرادی اصولوں کیساتھ مکمل طور پر ہم آہنگ بنجانے کا جذبہ اس میں پیدا کر دیا تھا۔ یوں تو ایک مفہوم میں اشوک بنیادی طور پر راسخ العقیدہ بودھی بن چکا تھا، لیکن نہ تو وہ کٹر قسم کا بودھی تھا اور نہ متعصب قسم کا۔ اشوک نہ تو دہشت انگیز ظالم تھا اور نہ افسر احتساب، یہ اسپرٹ تو اس میں تھی ہی نہیں۔ اس کی روح انسانی تہذیب و شائستگی سے مالامال تھی۔

محولہ فرامین اشوک کے "اپاشک" سے "بدھ ساکھیہ" کی طرف بڑھنے والی ارتقائی منزل ہی کی غمازی نہیں کرتے، بلکہ اس ہمہ تن انہماک اور دلچسپی کو بھی

منظر عام پر لاتے ہیں، جو اس نے بودھی عقائد کی اشاعت اور مقدس تثلیث کو قائم رکھنے میں دکھلائی تھی۔ اشوک کی "حادی برکل" فراست نے بدھا کے قوانین کی ایسی بے نظیر تفسیر کی تھی، جس سے مختلف ادوار کے علما اور مختلف ممالک کے باشندے

محو حیرت ہو گئے تھے۔ بودھی دنیا میں اشوک بیحد متعصب پیرو تھا، اس لئے جہاں تک اس سے ممکن ہو سکا اس نے بودھی دنیا کے گوناگوں عناصر میں یکجہتی اور بودھی سرگرمیوں میں شدت پیدا کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ رمز پسند بدھ پیروؤں میں بودھی ادب کو فروغ دینا اور بودھی نظم وضبط کو برقرار رکھنے کی ذمہ داری اسی پر عاید ہوتی ہے اس خصوص میں اس نے جس قدر بھی کام کیا ہے، نہ صرف قطعی ہے بلکہ اپنی ایک مستقل حیثیت بھی رکھتا ہے۔ جس جوش وخروش سے اس نے بودھی دنیا کی فلاح وبہبود میں حصہ لیا، تمام بودھی اس کو بڑی قدر کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ بدھ مت کے پیروؤں کے لئے اشوک کا وجود ایک زبردست اقتدار کے ساتھ ایک مستحکم ومضبوط طاقت بھی تھی۔ بایں ہمہ اس کی منفنا طیسی شخصیت اور بھی بڑھ جاتی ہے، جب ہمیں یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ اشوک نے غیر بودھی عوام میں نیک تہذیبی خطوط پر چل کر ترقی کرنیکا عام میلان پیدا کر دیا تھا۔ یہی چیز اسکی حقیقی عظمت ہے۔ انسانی تہذیب کی حیثیت سے بودھی تہذیب کو آفاقیت میں تبدیل کرنیکی وجہ سے، اشوک کو تمام دنیا کے راجہ مہاراجاؤں میں ایک ممتاز درجہ نصیب ہے۔

بدھ تہذیب کو انسان دوست اور خدا ترس تہذیب کے روپ میں شہرت دینے کا سہرا اشوک ہی کے سر ہے، یہی اس کی زندگی کا اہم ترین مقصد تھا۔ اس کو یہ کامل یقین تھا کہ دنیا کے عوام ذات پات اور رنگ ونسل کے جھگڑوں سے بالاتر ہو کر،

بودھی تہذیب کو قبول کرلیں گے۔ اشوک کے لئے بدھ مت کا فلسفہ نہ تو نری خیال آرائیوں کا ایک گنجلک ڈھانچہ تھا اور نہ ذہنی قلابازیوں کا حیران کن کرتب۔ وہ تو صرف انسانی شخصیت میں پائی جانیوالی حیات آفریں صلاحیتوں میں تہذیب و شائستگی پیدا کرنے والا ایک بالکل سیدھا سادھا پیام تھا۔ اشوک نہ صرف بذات خود ان اصولوں کو اچھی طرح سمجھ چکا تھا، بلکہ اپنے فرامین کے ذریعہ اس نے بدھ کی تعلیمات کی اصل روح کو عوام میں مقبول عام بنانا چاہتا تھا۔ اشوک کا بودھی پیام بالکل صاف، نہایت واضح، حد درجہ سادہ ہونے کے علاوہ تمام مخفی رازوں سے پاک تھا، بدھ مت کا تجزیہ کرکے اشوک نے اس کی حقیقتوں اور صداقتوں کو بے نقاب کیا۔ اور اسی تجزیے کی بدولت وہ ان اہم اجزا و عناصر کو، جن کو وہ بدھ مت کی اصلی روح، مرکزی خیال اور اساس سمجھتا تھا، انتخاب کرکے اپنے فرامین میں اکھٹا کر دیا۔

گوتم بدھ اپنے فلسفۂ حیات کو معمولی فہم و فراست کا معقولیت پسند فلسفہ کہتے ہیں بدھ مت کے موقوعہ قوانین کی حقیقی روح کو سمجھنے، انہیں بہ نظر استحسان دیکھنے اور ان کو عملی جامہ پہنانے کے لئے مقدم چیز انسان میں عملی استعداد رکھنے والے تہذیب یافتہ نفس کا موجود ہونا ضروری ہے۔ بدھ مت کا راستہ دیکھنے میں سیدھا تو نظر آتا ہے، مگر حقیقت میں وہ جاتا چڑھائی ہی کی طرف ہے۔ اس صعودی راستہ کی دور دراز منزلوں کو طے کرنے والے یا کامیابی کے ساتھ اپنی منزل مقصود کو پہنچنے والے وہی راہگیر تھے، جنھوں نے ابتداء ہی سے بودھی طریقوں پر اپنی تربیت کی تھی۔ لیکن وہ عوام جو توہم پرستی اور جہالت کے دلدل میں پھنسے ہوئے تھے، وہی لوگ نروان کی شاہراہ پر چل نہ سکے۔ یوں تو بہا تما بدھ کی تعلیمات نے اپنے اور اپنے بعد کے زمانے کے

عوام کی زندگیوں پہ بڑا گہرا اثر ڈالا تھا۔ لیکن ان کا حقیقی پیغام صرف انکے پیروؤں ہی تک محدود رہا۔ بایں ہمہ بدھ مت کی تہذیب آفریں قوتوں نے انسان اور سماج کو خلاق دوست بنانے یں حیرت انگیز کام کیا تھا۔ عوام کی ثقافتی تعمیر کرنیوالے مذکورہ بالا بودھی عوامل سے اشوک بے خبر نہ تھا۔ یوں تو بودھی تعلیمات کے ذریعہ بدھ مت یں دوبارہ جان ڈالی جا سکتی تھی۔ لیکن انسانیت پسند تہذیب کے اعتبار سے بدھ مت یں بذات خود ہمہ گیر اصولوں یں تبدیل ہونیکی صلاحیت موجود تھی۔ یہی نہیں بلکہ بدھا کے آئین و قوانین کی سرشت یں جو تہذیبی قوتیں کارفرما تھیں، ان کی اساس پہ وہ ہر ملک و قوم کے افراد کا ایک مشترک ورثہ یا سرمایہ بھی بن سکتا تھا۔ بدھ مت کا یہی وہ اہم ترین پہلو تھا، جس نے اشوک کو بے حد متاثر کر دیا تھا۔

اشوک اپنے آپ کو اس انسانیت پرست تہذیب کے حوالے کر دیا تھا۔ اس طرح اس کی سپردگی بدھ مت کی بالواسطہ خدمت گزاری تھی۔ اشوک بودھی تہذیب کا یہی مفہوم سمجھتا تھا کہ یہ تہذیب مختلف قوموں کے درمیان امن و آشتی کی بنیادوں پر ان کے باہمی تعلقات یں ہم آہنگی اور اشتراک عمل پیدا کرتی ہے۔ انسانی معاملات یں باقاعدگی اور نظم و ضبط پیدا کرنے کا یہی وہ بنیادی اصول تھا، جس نے آخر یں معاملہ فہمی، اشتراک عمل اور سماج یں ہم آہنگی پیدا کرنیوالی صلاحیتوں کو ابھارا بھی تھا۔ اشوک نے یہ اچھی طرح محسوس کر لیا تھا کہ جس مملکت یں اس طرح کی سماجی امن و شانتی کی فضا پیدا ہو جاتی ہے، وہاں عوامی زندگیوں یں انتشار پیدا کرنے والے اور جلا گلا کر بھسم کر دینے والے عناصر نیست و نابود ہو جاتے ہیں۔

سیاسی اقتدار اعلیٰ کا وجود اور اس کی تنظیم کا سارا دار و مدار جنگ اور لوازمہ

جنگ پر قائم ہوتا ہے، جس کے نتیجہ کے طور پر عوام میں جنگجویانہ رجحانات ترقی پاتے ہیں۔ اس لئے امن کا اصول ہی وہ اصول ہے، جو نہ صرف سیاسی اقتدار کے وسعت وترقی کی نفی کرتا ہے، بلکہ قوموں کے درمیان نئے انسانی رشتوں کے علاوہ رواداری، استحسان نظر، معقول پسندی، اور انسانی ترغیب وتحریص کی بنیادوں پر انسانی خوشحالی کی خاطر نئے سماجی نظام کو بھی قائم کر دیتا ہے۔ یہی وہ چیز تھی، جس کو اشوک نے اپنی "تہذیبی مملکت" کے ذریعہ حاصل کرنے کی انتہک کوشش کی تھی۔

محولہ فرامین کی شہادت سے یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ اشوک اپنے پیش رو راجاؤں سے زبردست اختلاف رائے رکھتا تھا، جنھوں نے اپنی رعایا کی تہذیبی اور ثقافتی نشو ونما میں ذرا بھی دلچسپی نہیں لی تھی۔ اشوک سے پہلے جتنے راجہ گذرے تھے، انھوں نے نہ تو عوام کی خاطر حکومت کی اور نہ ان کے مفادات کی خاطر۔ انکی حکومت صرف انہی کی ذات کی خاطر ہوا کرتی تھی۔ ان کی مملکت میں "اخلاق کی آواز" کے بجائے" ڈھول پٹنے کی آوازیں" سنائی دیتی تھیں۔ اس لئے اشوک اس بات کو ثابت کرنا چاہتا تھا کہ گذشتہ دور کے تمام راجے و مہاراجے، انسانی خوشحالی کو فنا کر کے نہ صرف اپنے مخصوص سیاسی اغراض کی تکمیل کرنا چاہتے تھے بلکہ انہیں ہمیشہ کے لئے قائم بھی رکھنا چاہتے تھے۔ البتہ اگر کوئی بات ایسی پیدا ہو جاتی، جو ان داتاؤں کے سیاسی منصوبے میں ٹھیک بیٹھ جاتی، تو اسی صورت میں وہ کوئی ایک رفاہ عام کا کام کر گذرتے ورنہ نہیں۔ اس کی اصل وجہ یہ تھی کہ ان راجاؤں کی تہذیبی اور سیاسی سرگرمیوں میں ہمیشہ مملکت ہی کی سیاسی فلاح و بہبود کو پیش نظر رکھا جاتا تھا۔ تہذیب پذیر انسانی مواد کی حیثیت سے عوام کبھی بھی ان کی سیاسی

ترقی کی اساس نہیں بن سکے۔ بلکہ اس کے برعکس ان کے مجوزہ اقتداری سیاست کے سانچے میں ڈھل نکلنا، عوام ہی کا فرض قرار پاتا تھا۔ باہمی اختلاط و امتزاج، اشتراک و اتحاد، افہام و تفہیم جیسے انسانی روابط کے علم پر مملکت کی تعمیر کرنا گذشتہ دور کے راجاؤں کی سمجھ سے بالاتر بات تھی۔ طرز حکومت اور سیاسی نظام پر ازمنۂ سلف کے سیاسی ادب میں "عوام، مملکت کی زندگی کا اہم ترین جز ہوتے ہیں" کے موضوع پر بہت کچھ بحث کی جا چکی ہے، لیکن اشوک کے فرامین کے مطابق ان راجاؤں کی سیاسی تنظیم میں عوام کو وہ مقام نصیب نہیں تھا، جس کے وہ ہر طرح مستحق تھے۔

گذشتہ راجاؤں کے بارے میں اشوک اس حقیقت سے اچھی طرح واقف تھا کہ انھوں نے عوام کی اخلاقی ترقی کے لئے موزوں ترغیبی وسائل کی فراہمی کے لئے عملی قدم اٹھایا ہی نہیں۔ عوام کی یہ خوش فہمی یا مقدس آرزو کسی وقت بھی شرمندۂ معنی نہ ہوئی۔ اشوک کے زمانے سے قبل جو مملکت قائم تھی، اس میں کوئی شعبہ ایسا نہیں تھا، جو عوام کی تہذیبی سرگرمیوں کو پروان چڑھانے میں ان کی مدد کرتا۔ اس دور میں "دھرم۔ مہاماتراس" کا وجود ہی نہیں تھا۔ گرنار کی پانچویں چٹان کے فرمان سے صاف پتہ چلتا ہے کہ اخلاقی نظام قائم کرنے کے لئے مختلف فرقے کے لوگوں نے مہاماتراس (کونسل) پر اپنا قبضہ جما لیا تھا۔ اسی طرح اخلاقیات کی خاطر جن لوگوں نے اپنے آپ کو وقف کر دیا تھا، ان کی فلاح و بہبود کے لئے آقا اور غلاموں نے ملکران اداروں پر قبضہ کر لیا تھا۔ اسی طرح مہاماتراس کے اداروں پر ہر جگہ قبضہ ہو گیا تھا۔

اشوک کی مملکت نے دو اہم فرائض اپنے ذمہ لئے تھے۔ ایک تو عوام کو بودھی

تہذیب کی تعلیم دینا ـــ اور دوسرا عوام میں فارغ البالی پیدا کرنا۔ اشوک کی مملکت میں عوامی فلاح و بہبود کی روح سرایت کی ہوئی تھی۔ عوام کی خوش حالی اشوک کا واحد مقصد تھا، اور صرف اسی ایک مقصد کی خاطر اس کی مملکت وجود میں آئی تھی۔ اشوک صاف طور پر کہتا ہے کہ

"آج سے قبل کسی وقت بھی نہ تو کارروائیوں کے تصفیئے کیے جاتے تھے اور نہ ان کے بارے میں کوئی رپورٹ پیش ہوتی تھی۔ میرے زمانے میں یہ انتظام تھا کہ رپورٹیں یا اطلاع نامے اس ہدایت کے ساتھ ہر جگہ منظر عام پر چسپاں کیے جاتے تھے کہ باغ، اصطبل، پالکی، دسترخوان، حرم سرا حتیٰ کہ میں خلوت ہی میں کیوں نہ رہوں، مجھے اپنی رعایا کی کیفیت ہر وقت ملتی رہنی چاہیے۔ ان مقامات میں سے، میں جہاں کہیں بھی رہتا ہوں، برابر اپنی رعایا کی نسبت فیصلے کرتا رہتا ہوں ـــ جب تک میں اپنی ذاتی کوشش سے عوامی شکایتوں کو رفع نہیں کرتا، مجھے اطمینان قلب نصیب نہیں ہوتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ بنی نوع انسان کی خوشحالی اور فارغ البالی کو ترقی دینا، میں اپنا فرض سمجھتا ہوں۔"

وہ بنیادی تبدیلیاں، جو اشوک نے اپنی مملکت میں کی تھیں، وہ عام قدروں سے بالاتر قدروں کو ظاہر کرتی تھیں۔ گرنار کی چھٹی چٹان کا فرمان، اشوک کا اہم ترین فرمان ہے۔ اشوک چونکہ عوام کے معاملے کو اپنا ذاتی معاملہ جانتا تھا، اس لئے ان کے انفصال کو معمولی کام نہیں سمجھتا تھا۔ وہ یہ کہا کرتا تھا کہ جب تک وہ اپنی پوری زندگی کو عوام کی بے لوث خدمت کے لئے وقف نہ کر دے گا، اس وقت تک وہ عوامی فارغ البالی کی

ذمہ داریوں سے ہرگز سبکدوش نہیں ہو سکتا۔ علاوہ ازیں کسی کام کی انجام دہی میں درمیانی راہ اشوک کے نزدیک کوئی وقعت نہیں رکھتی تھی' اس لئے ان سارے رفاہی کاموں کو جو بادل ناخواستہ کئے جاتے تھے' انہیں ایک لغویت سمجھتا تھا۔ عوامی ضروریات کے ساتھ ہم آہنگی پیدا کرنے کا پرخلوص جذبہ اس میں موجود تھا۔ وہ اس حقیقت سے بےخبر نہ تھا کہ عامتہ الناس کی فارغ البالی کی راہ میں جب تک "سعی بلیغ" نہیں کی جاتی' اس وقت تک کامیابی کی صورت دیکھنا نصیب نہیں ہوتا۔ اشوک اسی اصول کو تمام نیک اعمال کی اصل جڑ سمجھتا ہے۔ اشوک کا یہ قول تھا کہ عوام کی فارغ البالی کو بڑھانا جتنا بڑا اور اہم فرض ہے' اس سے بڑھ کر اور کوئی فرض نہیں۔ زندہ انسانوں کا جو فرض مجھ پر عائد ہوتا تھا' اس سے سبکدوش ہونے کیلئے میں نے جو کچھ کوشش کی ہے' محض اسلئے کی ہے کہ اگر انہیں اس دنیا میں خوش حالی نصیب ہو تو دوسری دنیا میں جنت بھی ہے۔

اشوک اگر ایک طرف خدمت خلق کے محاسن کا شعور رکھتا تھا' تو دوسری طرف اپنی اُس بےچارگی سے بھی واقف تھا' جس کے مدنظر وہ اس خدمت کو بہ حسن وخوبی انجام نہیں دے سکتا تھا۔ ایسی صورت میں اس کے لئے یہ ضروری ہوچکا تھا کہ وہ انسانیت کے بلند ترین مقاصد اور خوش آئند توقعات کو پورا کرنے کیلئے' خود کو ریاضت اور ضبط نفس کا پابند کرے۔ اشوک کے اس نظریہ حیات کی تربیت کے لئے جس کی رو سے زیادہ سے زیادہ افراد کو خوش حالی نصیب ہوتی ہے' ایسے ریاضت اور ضبط کی ضرورت تھی کیونکہ اتنا بڑا نصب العین بغیر جوش عمل کے ہرگز پایہ تکمیل کو نہیں پہنچ سکتا۔

اشوک کی تعلیمات مادی صورت میں تبدیل ہو جانے کی اصل وجہ یہ تھی کہ اس کو بنی نوع انسان سے بےحد محبت تھی۔ انتھک کوششوں کے ساتھ اس نے عوامی فلاح و

بہبود کے اعلیٰ و ارفع مقصد کو حاصل کیا تھا۔ عوام کی خوشحالی کو ترقی دینے میں، اسکا جوش کبھی زوال پذیر نہیں ہوا۔ بالآخر اس کے آہنی اور ناقابل تسخیر ارادے نے اسکے نصب العین کو مادی صورت میں تبدیل کر ہی دیا۔

عوام کی خوش حالی، جو اشوک کا نصب العین تھا، بدھ مت کے سماجی فلسفہ سے ماخوذ تھی۔ اشوک نے اس امید کے ساتھ بدھ مت کی تبلیغ شروع کی تھی کہ وہ ہر مذہب و ملت میں اور رنگ و نسل کے امتیازات سے بالاتر ہو کر عوام میں مقبولیت حاصل کر سکے۔ اپنے سماجی تہذیبی نصب العین کو مادی صورت میں تبدیل کرنے کیلئے اشوک نے کوئی متعصبانہ استبدادی طریقہ کار اختیار نہیں کیا تھا، بلکہ سماجی اور گھریلو زندگی کے گوناگوں پہلوؤں میں یک رنگی و ہم آہنگی پیدا کر کے حاصل کرنا چاہتا تھا۔ جب تک کسی جماعت یا برادری کی پوری زندگی، انسانیت پرستی کے اصولوں میں عمدگی سے سموئی نہیں جاتی، اس وقت تک سماج کے افرادیوں یا کسی خاندان کے اراکین، ان سے اتحاد عمل اور باہمی ہمدردی کی امید رکھنا فضول ہے۔ کیونکہ لوگوں کے رویہ اور باہمی تعلقات کا تعین، ان کے باہمی احساس ہمدردی، خود ضبطی، ادب، عزت اور احترام ہی کی مدد سے ہوتا ہے پس اس طرح خاندان، جو چھوٹے پیمانہ کی برادری ہوتی ہے، انسان کی وسیع تر سماج کی ترقی پسندانہ زندگی سے مربوط و ہم آہنگ ہو جاتی ہے۔

تہذیبی قدروں کو نشو و نما دینے کے لئے افراد خاندان میں آپس کے باہمی فرائض کا شعور ہونا ضروری ہے۔ افراد خاندان میں چھوٹے بڑے، دوست، آشنا، خدمت گار اور غلام سبھی شامل ہوتے ہیں۔ اشوک، ماں باپ، اور بزرگوں کی اطاعت کیشی، دوست آشنا اور رشتہ داروں کے ساتھ فیاضی، برہمنوں اور سرامنوں کے ساتھ خوش خلقی،

خدمتگاروں اور غلاموں کے ساتھ مہربانی کے برتاؤ پر بہت زور دیتا ہے۔ اس طرح
عمل پیرا ہو کر ایک خاندان کے افراد، انسانیت کے اصول کو بجنسہٖ قائم رکھتے ہوئے،
نیک نیتی، یکجہتی، اتفاق و اتحاد عمل کی فضا میں انسان کے باہمی رشتوں کو زیادہ سے
زیادہ مضبوط بنا سکتے ہیں۔ اشوک نے ہمیں یہی پیام دیا تھا کہ خاندان جو وسیع تر
سماج کی سب سے چھوٹی مگر اہم اکائی ہوتی ہے، اس کو بھی انسانی خوش حالی اور
ہم آہنگی کا ایک جیتا جاگتا نمونہ ہونا چاہئے۔ لیکن ایسی اکائیاں، اتحاد، رواداری،
اور سماجی اشتراکِ عمل کے اصولوں پر خود بخود کام کرتی رہیں گی۔

سماجی اعمال کی کثرت میں، اشوک نے زندگی کی غیر منقطع وحدت کو محسوس
کر لیا تھا۔ زندگی کی اس وحدت کو تہذیب و شائستگی سے آراستہ کرنا اسکا نصب العین
تھا۔ اشوک اس حقیقت کو اچھی طرح جانتا تھا کہ زندگی میں ناجائز فائدہ اٹھانیوالے
اعمال کی حد نہیں۔ اور انہی اعمال کی وجہ سے زندگی خطرے میں پڑ جاتی ہے پس
زندگی بخش قوتوں کو ترقی دینا، ان کی حفاظت کرنا اور انہیں تہذیب و شائستگی
کے سانچوں میں ڈھالنا، راجہ اشوک کا سب سے پہلا اور سب سے بڑا فرض تھا۔
کیونکہ زندگی کو نیست و نابود کر دینے سے، انسانی اور غیر انسانی، دونوں فعلیتوں کا
یک لخت خاتمہ ہو جاتا ہے۔ یاد رہے کہ بودھی تصور کے مطابق، انسانی شخصیت کی
تعمیر و ترقی کا دار و مدار انسانی زندگی کے احترام ہی پر ہوتا ہے۔ روح کو نجات دلانیوالی
مقدس جد و جہد میں بھی احترام زندگی کا اصول، بہت بڑا کام کرتا ہے۔ زندگی کو فنا
کرنیوالی ہر کوشش، مقصد حیات ہی کو فنا نہیں کرتی بلکہ اس کے چالو کام کو بھی پورا ہونیسے
پہلے ختم کر دیتی ہے۔ زندگی کو قائم رکھنے سے ہی، زندگی خود اپنی فلاح و بہبود کی

خاطر، اپنی پوشیدہ قوتوں اور صلاحیتوں کو بروئے کار لانے لگتی ہے۔ انسان کی مکمل شخصیت، احترام زندگی کے اصول کی پابند ہوتی ہے۔ تحفظ اور احترام زندگی کے اسی اصول کو اشوک نے مختصر اور پُر مغز انداز میں گرنار کی چٹان کے فرمان میں وضاحت کی ہے۔

تحفظ حیات ہی کی بدولت انسان کے نفس میں بعض نئی قدروں کے احساسات اُبھرتے، اخلاق کے نئے معیارات اور انسانی کردار کو بلند کرنیوالے تصورات پیدا ہوتے ہیں زندگی کی حفاظت، جبلتوں، تصورات اور اعمال میں بلندیاں پیدا کر کے انہیں انسانیت کے رنگ میں رنگ دیتی ہے۔ اشوک کے فلسفہ نے جس نقطہ نظر پر زور دیا تھا، وہ یہی تھا کہ احترام زندگی کی اساس پر عوام کی زندگی کو بلند خیالی اور اعلیٰ طرز معاشرت کی سطح تک پہنچا دیا جائے۔ زندگی بسر کرنا بذات خود ایک فن ہے اور فن ہونے کی وجہ سے زندگی، حیاتیاتی قوتوں کے ادھورے اور غلط اظہار کا نام نہیں۔ اس لئے اشوک جس بودھی نقطۂ نگاہ کو عوام تک پہنچاتا ہے، یہی ہے کہ اچھی زندگی بسر کرنے کے لئے چند شرائط کی پابندی ضروری ہوتی ہے۔ اور یہ وہ شرطیں ہوتی ہیں، جو ایک خوش حال زندگی کو ترقی دینے اور دیر تک قائم رکھنے میں مدد دیتی رہیں۔ ایک طرف تو اس نے اس نقطہ نظر کو "قدیم ضابطہ" کا نام دیا ہے، تو دوسری طرف اس ضابطے میں کھٹکنے والے بودھی عنصر کو بھی علٰحدہ کر لیا، تاکہ زندگی بسر کرنے کا یہ زرین اصول، بغیر کسی مزاحمت یا طرفداری کے سب لوگوں کے لئے یکساں طور پہ قابل قبول بن سکے۔ اشوک کے طریقہ کے مطابق اس "قدیم ضابطے" کے چار بنیادی اصول ہیں، جن پر کاربند رہنے سے انسانی زندگی پھولتی پھلتی اور آگے

بڑھتی ہے۔ فرمانبرداری، فیاضی، پرہیزگاری، اور اعتدال پسندی، یہی وہ چار اصول ہیں، جن کو اشوک بہت اہم اور قابل ستائش سمجھتا ہے۔ ان عمل آفریں اصولوں کے زیر اثر انسانی جبلتیں اور انسانی کردار، تہذیب کے سانچے میں اس طرح ڈھل جاتے ہیں کہ ان کی مدد سے سماجی ضبط و اقتدار، سماجی ہم آہنگی اور خوش اعتمادی، سماجی وحدت اور میل ملاپ، سماجی آزادی اور ترقی کے احساسات نشوونما پاتے ہیں۔

تہذیبی اور سماجی تعلیم میں جس شخص کو اشوک کے بتلائے ہوئے طریقوں کے مطابق تربیت دی جائے گی، اس کی اخلاقی حالت میں ترقی ہونا ضروری ہے۔ اشوک کے محولہ فرامین میں "دھما" کا لفظ وسیع تر معنی میں، اخلاق ہی کے لئے استعمال کیا گیا ہے۔ چنانچہ فرامین کے متن سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ دھما انسان کی عام نشوونما کا وہ اصول ہے، جس کی وجہ سے بلا امداد غیرے، ہر فرد اپنی ذات سے اپنی انفرادی اور سماجی صلاحیتوں کو ترقی دے کر مہذب اور شائستہ بن سکتا ہے۔ اس لئے دھما نہ تو کوئی مکتب خیال ہے، اور نہ عقیدہ، بلکہ ایک خاص فرقہ یا طبقہ ہوتا ہے۔ دھما نہ تو اشوک کے دعوے کا سلبی یا انکاری پہلو ہے، اور نہ زندگی کے مطالبات کی نفی ہے۔ بلکہ ایک مستقل اور مثبت قسم کا دعویٰ ہے اور ساتھ ہی زندگی کی اہمیت کا سب سے بڑا اقرار بھی۔ دھما دنیا کے تمام مذاہب کے ان بنیادی اصولوں کا مدمقابل ہے، جو یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ ان کے اصولوں پر چلنے سے انسان کے اوصاف اور اس کی قدرتی استعدادوں میں نمایاں ترقی ہوتی ہے۔ دھما کی وحدت پسند اسپرٹ کو اشوک نے اپنا لیا تھا۔ دھما کا مشترک اور ہمہ گیر اصول جو تمام مذاہب میں پایا جاتا ہے، اس سے اشوک بے حد متاثر ہو چکا تھا۔ دھما وہ بنیادی تصور ہے، جس سے اشوک نے

اپنا فلسفہ اخذ کیا تھا اور اسی فلسفہ کی تشہیر و تبلیغ بھی کرنے لگا تھا، تاکہ تمام انسان اشوک کے فلسفہ کو اپنی زندگی کا مشترک فلسفہ سمجھ کر اسے سراہنے لگیں۔ اشوک یہ سمجھتا تھا کہ اس نے اپنے مذہب کی "چھوٹی سی دنیا" میں ایک عالمگیر مذہب کی "وسیع تر کائنات" کو سمو دیا ہے۔ بہ الفاظ دیگر اس کی چھوٹی سی ذات میں وسیع تر کائنات کا عکس اس طرح نظر آتا ہے، جس طرح ایک بڑے نفس کے اندر اور کئی نفوس نہ صرف دھڑکتے رہتے ہیں بلکہ دھما جیسے ہمہ گیر اصول کا ذاتی طور پر تجربہ بھی حاصل کرتے رہتے ہیں۔ اسی اشتیاق کے ساتھ اشوک نے اپنے فرامین کے ذریعہ انسانی مشابہت، یکسانیت اور وحدانیت کے اس ازلی اور سرمدی اصول کی تشریح کی ہے، جو دنیا کی تمام مخلوق میں یکساں کارفرما ہے۔ دنیا میں ہر جگہ بسنے والا انسان، اشوک کی نظر میں ایک ہی قسم کا امکان ہے، جسکی پسندیدگی اور ناپسندیدگی کا رجحان، اسے دنیا سے قریب تر یا بعید تر کر دیتا ہے۔ اس کا یہ عقیدہ تھا کہ تمام انسان، ایک لازوال سرمدی قانون کے تحت اپنی زندگی گذارتے ہیں۔

دھما کے اصول کو ترقی دینے کے یہ معنی نہیں تھے کہ اشوک اس اصول کے ذریعہ ایک ایسی سماج کی تخلیق کا حامی تھا جو خیالی دنیا آباد کرنے والے، خبطی ماہران اخلاق اور وہمی روحانیت پرستوں پر مشتمل ہو، بلکہ اس کے برعکس وہ ایسے صحت مند افراد کو پیدا کرنا چاہتا تھا جن کی سمجھ سیدھی ہو اور جن میں زندگی بخش وجدانات پائے جاتے ہوں۔ دھما کے اصول سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اس کا اصل مقصد ان تمام انسانوں میں خوشحالی کو فروغ دینا تھا، جو اس دنیا میں رہیں یا دوسری دنیا میں۔ اسی اصول کے پیش نظر اشوک نے عوام پر یہ بات واضح کر دی تھی کہ تمام لوگ

خوشحالی اور فارغ البالی پر فتح پا سکتے ہیں۔ البتہ یہ شرط ضرور لگا دی تھی کہ جب تک پوری قوت، انتہائی محبت، محتاط جانچ پڑتال، غیر معمولی فرمانبرداری، اور گناہ کا بے حد خوف، دل میں نہ سمایا ہو، اس وقت تک خوش حالی حاصل نہیں ہو سکتی۔ اس سے یہ بات بالکل صاف ہو جاتی ہے کہ انسانوں کی ترقی اور فلاح و بہبود کے لئے، ذاتی طور پر تعلیم حاصل کرنے کی جو اسکیم بنائی جاتی ہے، اس میں کام کرنے والی تہذیبی قوتوں کی اہمیت کو لوگ اچھی طرح سمجھ لیں۔ اشوک انسانی فطرت کی کمزوریوں سے اچھی طرح واقف تھا۔ اس لئے اس کا یہ ایقان تھا کہ جس شخص میں اچھے کردار کا فقدان ہوتا ہے، وہ ان ترقی پسند افراد کی صف میں شامل نہیں ہو سکتا، جن کے رویہ پر دھما کے اصول کی مہر لگ چکی ہو۔ انسانی خود ضبطی نیک کرداری کی ایک لازمی شرط ہے، کیونکہ اس سے زندگی کے مختلف عناصر ہی میں نہیں بلکہ خود زندگی میں خاص معنی پیدا ہو جاتے ہیں۔ اشوک کا مطلب یہ تھا کہ انسان کی شخصیت میں انتشار و بے آہنگی پیدا کرنے والی قوتوں کے اثر کو زائل کرنے کے لئے، انسان کو بعض اخلاقی قوتوں کی بھی ضرورت پڑتی ہے۔ اشوک نے اپنے فرامین میں نہایت صاف اور کھلے الفاظ میں بتلا دیا ہے کہ "گناہ بڑی آسانی کے ساتھ کیا جاتا ہے"۔ بخلاف اس کے "نیک اعمال کرنے میں اتنی ہی مشکلات پیش آتی ہیں"۔ یہ یاد رکھنے کی بات ہے کہ اشوک کے ہاں گناہ کا تصور ایک ماہر اخلاقیات سے بالکل مختلف ہے۔ "دہشت آفرینی یا دہشت پسندی، سنگدلی و بیرحمی، برافروختگی اور غضبناکی، نخوت و تکبر، بغض و حسد" کے شدید جذبات، اندر اندر ہی انسانی شخصیت کی جڑوں کو کھوکھلا بنا دیتی ہیں، بلکہ بد تہذیبی اور ذلالت کی طرف بھی مائل کر دیتی ہیں۔ اشوک انسانی نفس کے اندرونی عمل پر

غور کرکے اس حقیقت کا پتہ لگاتا ہے کہ انسان " اپنی بداعمالیوں (جس میں سوچ بچار بھی شامل ہے) کی طرف ذرا بھی توجہ نہیں کرتے" یہی وجہ ہے کہ گناہ یا بداعمالیاں ایک نہ سوچنے والے نفس کے نتیجہ میں پیدا ہوتے ہیں۔ اور نیک اعمال، شعوری طور پر سوچ سمجھ کر کئے جاتے ہیں وہ اشوک کی نظر میں " بدکاری یا بداعمالی" غیر مہذب نفسی عمل کی حیثیت رکھتی ہے" اور نیک کرداری کو وہ نفس کا تہذیب ممتاز عمل سمجھتا ہے"۔

رحمدلی، فیاضی، راستبازی وسچائی، عصمت و پاکدامانی، شرافت و نیکی" انسان کو شائستہ اور مہذب بنانے والے وہ عناصر ہیں، جن کی بدولت " روحانی بصیرت" حاصل ہوتی ہے، دھما کا یہی پیغام تھا، اور اسی پیغام کو اشوک نے تمام دنیا کے لئے نشر کیا تھا دھما کو ترقی دینے کے لئے اشوک نے دو طریقے اختیار کئے تھے۔ ایک اخلاقی پابندی اور دوسرا تبدیل مذہب۔ چونکہ تبدیل مذہب سے دھما میں بے حد اضافہ ہوجاتا ہے اسلئے اشوک کی بنیادی قدروں میں، تبدیل مذہب سے بڑھ کر، اخلاقی حد بندیوں کو اہمیت نہیں دیجاتی تھی"۔ یوں تو اشوک کے فرامین، اشوک کے پروپگنڈا اور تبدیل مذہب یا اخلاقی پابندیوں کے ذریعہ دھما کو شہرت دینے والی سرگرمیوں کا ذکر نہایت صفائی کے ساتھ کرتے ہیں، باوجود اس کے فرامین کے متن سے کبھی اس بات کا پتہ نہیں چلتا کہ اشوک صرف تبدیل مذہب پر زور دیتا تھا اور تبدیل مذہب ہی کو اہم جانتا تھا۔ اشوک کے نزدیک مذہب کی تبدیلی، اس نصب العین کی کمی کو ظاہر کرتا ہے جس کو حاصل کرنیکی پیہم کوشش کی جاتی ہے۔ لیکن جہانتک اخلاق کا تعلق ہے وہ کسی اور چیز کو اخلاق کی خداداد صلاحیت کے برابر نہیں سمجھتا۔ اس لئے اخلاق کے توسط سے شناسائی اور واقفیت بڑھانا۔ یا اخلاقی اصولوں کو عوام میں پھیلانا یا اخلاق کے ذریعہ آپس میں رشتے ناطے

قائم کرنے کو' اشوک بہت زیادہ اہمیت دیتا ہے۔

ظاہر ہے کہ اشوک کی مملکت میں ہر طبقے اور ہر فرقے کے لوگ رہتے بستے تھے' ان سب کا تبدیل مذہب کرکے بدھ مت اختیار کرنا' ناممکن تھا۔ اسلئے اشوک کی فراست کی عظمت اس امر سے ظاہر ہو جاتی ہے کہ اس نے عوامی خوش حالی کی ترقی' رعایا میں ربط و شناسائی' اخلاقی اصولوں کی تقسیم و اشاعت' اور باہمی رشتہ داریوں جیسے "دھما" کے اصولوں کے ذریعہ مختلف مذاہب اور فرقوں میں ہم آہنگی پیدا کرکے سب کو اپنا ہمنوا بنالیا تھا۔ بودھی تہذیب نے اشوک کی مملکت میں ایسی صلاحیت پیدا کردی تھی' جس کی وجہ سے مملکت کی ساری فضا بودھی رنگ میں رنگ گئی تھی۔ فرامین سے خود اس امر کی تصدیق ہوتی ہے کہ بودھی تہذیب دور دراز ممالک تک نہ صرف پھیل چکی تھی بلکہ تمام لوگوں کے دل کی گہرائیوں تک سرائت بھی کر گئی تھی۔ گرنار کی ساتویں اور بارھویں چٹان کے فرامین اشوک کی مملکت میں بسنے والے تمام باشندوں کو اپنے مذہب کی پیروی کرنے کی عام آزادی دے رکھی تھی۔ لیکن دھما کے اصولوں کو ان کے مذاہب کے ساتھ جوڑ کر ان میں "نفس کی پاکیزگی اور خود ضبطی" کی اہمیت کا احساس پیدا کردیا تھا۔ اس نے یہ بات نہایت وضاحت کے ساتھ عوام کے ذہن نشین کرادی تھی کہ اگر ان میں ضبط نفس اور نفس کی پاکیزگی' شکر گذاری اور احسان مندی' ریاضت و پرہیزگاری" جیسی صفات کا فقدان ہوگا' تو فیض رسانی کی خلایق دوست قوت ان میں نیست و نابود ہو جائے گی۔

اس طرح اشوک نے بالواسطہ طریقہ پر "دھما" کے ذریعہ اپنے زمانے کے تمام مذاہب اور مختلف فرقوں کے تصورات کی حوصلہ افزائی کی تھی۔ اشوک نے ان فرقوں کو

انہی کے مذہب کے مطابق روشنی دکھلائی تھی، مگر جو طریقہ کار اختیار کیا گیا تھا، وہ بودھی تھا۔ گرنار کی بارھویں چٹان کا فرمان، اشوک کے زمانے کی اس نفسی کیفیت کو ظاھر کرتا ہے، جو تمام فرقوں اور مذاہب کے ساتھ "دھما" کی آمیزش کی وجہ سے پیدا ہوگئی تھی

اس طرح اشوک، دلدادگان مذہب کے لئے خواہ وہ بودھی ہوں یا غیر بودھی، ایک سچا نصب العین مقرر کردیا تھا۔ اقتداری سیاست کو ترک کرکے "دھما" کی سماجی تہذیب کی حدود کے اندر رہتے ہوئے، وہ شہرت یا شوکت حاصل کرلے کا متمنی تھا۔ گرنار کی دسویں چٹان کا فرمان رقمطراز ہے کہ" بادشاہ ہرگز اس بات کو نہیں سوچتا کہ آیا اسے شہرت یا عظمت میں کس چیز سے اسکی ذات کو فائدہ پہنچتا ہے۔ سوائے اس مقصد کے کہ اس زمانے میں اور اس کے بعد مستقبل بعید میں، عوام کو اخلاقی فرمانبرداری کی طرف ترغیب دے۔ اور یہ کہ عوام اخلاقی فرائض کی پابندی کریں۔ صرف اسی بنا پر بادشاہ شہرت اور شوکت کا متمنی رہتا ہے۔ اسی لئے بادشاہ اپنی رعایا کیلئے جو کچھ بھی جانفشانی کرتا ہے، اس کا اصل مقصد صرف اسیقدر ہوتا ہے کہ عقبیٰ میں اس کو اس کی لیاقت کے برابر مقام ملے، اور اس دنیا میں اس کی رعایا کو کم سے کم خطرہ لاحق ہو یا بالکل نہ ہو اشوک کے دل میں یہ توقع پیدا ہوچکی تھی کہ اگر وہ دھما کو ہردلعزیز اور مقبول خاص وعام بنادے گا تو اس کو شہرت اور عظمت میں چار چاند لگ جائینگے۔ دوسرے الفاظ میں اسکا یہ مطلب تھا کہ اشوک خود کو دھما کا ایسا پرچارک بنانا چاہتا تھا، جس کی وجہ سے عوام "اخلاقی فیاضی اور اخلاقی دادودہش" کے اصولوں سے مالامال ہوجائیں۔ اسلئے اشوک تمام بندگان خدا کی زندگیوں میں بنیادی طور پر دھما کی کامیابی کو اپنی شان و شہرت کے مترادف سمجھتا تھا۔

اشوک کی تہذیبی سرگرمیاں، اپنی سلطنت کے عوام ہی تک محدود نہ تھیں۔ اپنی حدود سلطنت کے باہر کے غیر مفتوحہ سرحدی علاقوں میں بھی وہ اپنا پرچار برابر جاری رکھا تھا۔ اپنی رعایا کی طرح ان علاقوں کی رعایا کو بھی وہی باتیں بتلاتا تھا کہ اسکو نہ صرف سیاسی فتوحات، اقتدار کی توسیع اور اسی قسم کی ناجائز لوٹ کھسوٹ ہی سے نہیں بلکہ اس قسم کے تصورات سے بھی اس کو انتہا درجہ نفرت ہے۔ ہر دیس میں رہنے والے بدھ باشندے کی طرح، پردیسی باشندوں کو دھما کی مشترک برادری میں شامل کرنے کے لئے، اس کا دل بے چین رہا کرتا تھا۔ دھولی کی دوسری چٹان کا فرمان، سیاسی برتری، سیاسی اقتدار و فرمانروائی، اور سیاسی مملکت کے تصور کو ڈھا کر خاک میں ملا دیتا ہے۔ تمام انسانوں کو آنکھ کھول کر پڑھنے کے لئے اشوک کا یہ تحریری فرمان ایک کھلی ہوئی کتاب ہے، جس میں اس نے سیاسی عملدرآمد اور سیاسی مقالات کے علاوہ مملکتوں، قوموں اور ملکوں کے درمیان مصنوعی حد بندیوں کے پرخچے اڑائے ہیں اور ان کی لغویت کو واضح کیا ہے۔ لہٰذا اشوک کی بلند و بالا شخصیت، اس کے ہر دیسی اور صلح کل مشرب میں اجاگر ہو کر دکھائی دیتی ہے جب وہ "غیر مفتوحہ سرحدات" پر جاتا ہے، تو ایک فاتح بادشاہ کی حیثیت سے نہیں جاتا، بلکہ ایک ایسے شائستہ اور مہذب انسان کی طرح جاتا ہے، جس کا دل، ہمدردی، محبت اور انسانیت سے بھرپور ہوتا ہے۔ اشوک کی درخشاں کامیابیوں کی عظمت، انسانیت سازی اور خدا ترسی کے عملی میدان میں دکھائی دیتی ہے۔

سرحدات کے متعلق اشوک کہتا ہے کہ میری واحد خواہش یہی ہے کہ اس نگری کے لوگ دیونم پریا کو جان لیں ــــ تاکہ وہ مجھ سے خوفزدہ نہ ہوں۔ بلکہ میری ذات

میں ان کا اعتماد رہے ــــــ یہ لوگ میرے ہاتھوں سے افلاس و مصائب نہیں بلکہ صرف خوشحالی اور فارغ البالی حاصل کریں۔ اسی چیز کو وہ سیکھ لیں، تاکہ دہرم پریا انہیں وہ چیزیں معاف کردے، جو معاف کی جاسکتی ہیں۔ میں نے جن اخلاقی اصولوں کو اختیار کرنے کی ترغیب دی ہے، اس پر عمل کریں۔ تاکہ وہ دنیا اور عقبیٰ دونوں جگہ خوش و خرم رہ سکیں ــــــ انہیں معلوم ہونا چاہئے کہ دیونم پریا، ان کے باپ کے مانند ہے دیونم پریا ان کے ساتھ ویسی ہی محبت کرتا ہے، جیسی وہ اپنی ذات سے کرتا ہے۔ اور دیونم پریا کے ساتھ ان کا رشتہ بالکل اس کے بچوں کے مانند ہے۔"

یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ اشوک نے اپنے فرامین کے ذریعہ دہما کے پیغام کو دوسروں تک پہنچایا۔ لیکن بعض فرامین ان لوگوں کے لئے خاص پیغام بھی رکھتے ہیں، جو عوام کی فلاح و بہبود کی نگہداشت کرتے تھے۔ یہ وہ فرامین ہیں جو اشوک کی خدا ترس اور انسانیت پرست اسکیم کی کارروائیوں کو منظر عام پر لاتے ہیں۔ اشوک نے انسانیت پرستی کے نصب العین کو مادی صورت میں تبدیل کرنے کیلئے جو اقدامات کئے تھے، انکی نوعیت بالکل عملی تھی۔ دہما کے ایک پرجوش کارکن کی طرح اشوک اخلاقیات کا پرچار کرنے کے لئے سفر بھی کرتا تھا، اس طرح وہ براہ راست عوام سے ربط پیدا کر لیا تھا۔ چنانچہ وہ انہیں اخلاقیات کی تعلیم دیتا اور ان سے اخلاقیات کے بارے میں سوالات بھی پوچھتا تھا۔ دہما کی روح اشوک کی شخصیت میں مجسم ہو چکی تھی۔ وہ مہاماتراس (کونسل) کو بھی دہما کی تعلیم دیتا تھا، تاکہ ان کی عملی سرگرمیوں کے ذریعہ وہ اپنا نصب العین حاصل کر سکے۔ مہاماتراس (ارکان کونسل) اشوک کی سلطنت کے سربرآوردہ عہدہ دار ہوتے تھے عوام میں ہردلعزیزی اور ان کی محبت کو حاصل کرنے کیلئے مہاماتراس ہزارہا افراد سے

ربط قائم رکھتے تھے۔ انہیں ہدایت تھی کہ ان لوگوں کے معاملات کا تصفیہ کرتے وقت اس بات کا خیال رکھیں کہ سب اشوک کے بچے ہیں۔ اور بچوں کیلئے بھی اس نے یہی خواہش ظاہر کی تھی کہ انہیں بھی دنیا و عقبیٰ میں مکمل خوشی و خوش نصیبی حاصل رہے۔ اور بالغ افراد کیلئے بھی وہ یہی چاہتا تھا۔ اپنے فرائض کی انجام دہی میں مہاماتر اس کو چاہئیے کہ وہ ان ہدایتوں کو خاص طور پر پیش نظر رکھیں۔ مہاماتر اس کو حکم تھا کہ وہ بغیر کسی کی طرفداری کے انصاف کرنے کیلئے ہر وقت اور ہر لمحہ تیار رہیں۔ اشوک کا خیال تھا کہ جو شخص انصاف رسانی میں تکان محسوس کرتا ہے، اس کے مرتبے ہرگز بلند نہیں ہوتے لہذا ہر منصف کو چاہیے کہ وہ اپنا قدم اٹھائے اور آگے بڑھے۔ مہاماتر اس اگر اپنے فرائض کی انجام دہی میں ناکام رہیں، تو بجائے خود یہ ایک بڑی بدی نہیں، بلکہ اس سے اشوک کے نصب العین کو مادی صورت اختیار کرنے میں، ایک زبردست رکاوٹ حائل ہو جاتی ہے۔ اشوک کی سلطنت کے دوسرے عہدہ دار، جن کو "لاجوک" کہتے ہیں، ان پر اشوک نے یہ ثابت کر دیا تھا کہ دیہاتی عوام کی خوش حالی اور ان کی فلاح و بہبود کا انتظام کرنا، ان کا سب سے پہلا اور مقدم فرض ہے۔ اور وہ ان کی ویسی ہی نگرانی کریں جس طرح ایک آیا اپنے بچوں کی دیکھ بھال کرتی ہے۔

اشوک کا یہی طریقہ کار تھا، کہ وہ اپنی ذاتی صلاحیتوں کے علاوہ اپنے چیلوں کی صلاحیتوں سے بھی استفادہ کرکے دھما کے پرچار کو نہایت حسن و خوبی کے ساتھ انجام دیا۔ بدھ تہذیب کو مقبول عام بنانے اور اس کا پروپگنڈہ کرنے میں اشوک کے فرامین نہ صرف نمایاں کام کرتے ہیں بلکہ ہر ملک اور ہر زمانے کے عوام کے لئے ایک الہامی محرک بھی ثابت ہوتے ہیں۔ اشوک کے زمانے میں عوام اس کے فرامین کے معنی و مطالب

تک نفوذ کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ اشوک کے نصب العین کو اچھی طرح سمجھنے اور اس کو عملی جامہ پہنانے میں، ان پر جو فرائض عائد ہوتے تھے، انہیں انجام دینے کی برابر کوشش کرتے تھے۔ اشوک نے عوام کی صلاح و فلاح اور ان کی خوش حالی اور فارغ البالی کے لئے ایک نئی سماجی تہذیبی مملکت کی تخلیق کر کے، انسانیت پرستی اور خدا ترسی کی روشنی میں دھما کی زبردست خدمت انجام دی ہے۔
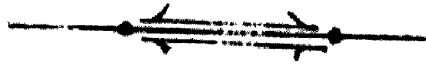
مترجمہ۔ مسٹر امجد علی

ماہنامہ
آزادیٔ ہند کی دوسری سالگرہ کا علمی پیشکش

راجگان آندھرا

(از)

علامہ حکیم سید شمس اللہ قادری صاحب ماہر آثار قدیمہ

۱۵- اگست سنہ ۱۹۴۹ء

آندھرا قوم کے عروج سے دراصل دکن کی سیاسی تاریخ شروع ہوتی ہے۔ سکندر کبیر کی فوج کشی سے بہت پہلے یہ قوم وجود میں آ چکی تھی۔ سنسکرت زبان کے ادب عالیہ میں آندھرا کا نام ملتا ہے اور اس سے اس قوم کی قدامت ظاہر ہوتی ہے
آتیریہ براہمنہ میں آندھرا کا تذکرہ ساویرا، پولیندا، اور موتیبا وغیرہ کے ساتھ آیا ہے۔ اور ان سب کو داسی لوس یعنی غیر آریہ اقوام میں شمار کیا گیا ہے۔
تاریخی دور کے شروع ہونے سے صدیوں پہلے وندھیا کی جنوبی سرزمین میں اَنو خاندان کی حکومت تھی۔ اس خاندان کا ایک راجہ جس کا نام بالی ہے۔ اکسواکو خاندان کے راجہ مندہاتری کا معاصر تھا۔ بھاگوت پوران میں لکھا ہے کہ راجہ بالی کے چھ فرزند تھے۔ انگا۔ بنگا۔ کلنگا۔ سوہما۔ پورندرا اور آندھرا۔
اَنو خاندان کی سلطنت راجہ تی تیکسو کے زمانہ میں مشرق کی سب سے بڑی سلطنت سمجھی جاتی تھی۔ راجہ بالی تی تیکسو کا پڑپوتا تھا۔ بالی کے بعد اس کی سلطنت اس کے چھ فرزندوں میں تقسیم ہو گئی۔ اور جو علاقہ جس فرزند کے قبضہ میں آیا اسکے نام سے منسوب ہو گیا۔ اور اس طرح اَنو خاندان کی سلطنت کے حسب ذیل چھ حصے ہو گئے
انگا دیس۔ بنگا دیس۔ کلنگا دیس۔ سوہما دیس۔ پورندرا دیس۔ آندھرا دیس۔
رگ وید میں اَنو کا ذکر آیا ہے اور رگ ویدی دور کی پانچ اقوام میں یہ

بھی شمار ہوئی ہے۔ اور اس کو اندر کی رتھ چلانے والی قوم کہا گیا ہے۔ یہ لوگ سورج بنسی یعنے سورج کے پرستار تھے۔

توراۃ کی روایت کے بموجب حام بن نوح کی اولاد سے ایک قوم انومیم نامی وادی نیل میں آباد تھی۔ اس کا مورث اعلیٰ جس کا نام اَنو ہے مصرایم بن حام کا فرزند تھا۔ اس نے وادی نیل میں اپنے لئے ایک شہر بسایا تھا جس کا نام اون تھا اس کو بنی اسرائیل بیت الشمس اور یونانی ہیلی پولیس کہتے تھے جس کے معنی ہیں۔ "آفتاب کا شہر" اور یہاں آفتاب کی پرستش ہوا کرتی تھی۔

نہایت قدیم زمانے میں نوح کی اولاد جب فرات و دجلہ کی وادیوں سے نکل کر اطراف عالم میں منتشر ہوئی تو فرزندان حام سے انومیم کی ایک جماعت شام سے گزر کر طور سینا کے دامن سے ہوتی ہوئی وادی نیل میں پہونچی۔ دوسری جماعت نے مشرق کی طرف رخ کیا۔ سمندر کے کنارے کنارے گذرتے ہوئے انڈس کی وادی میں آکر موہن جی دارو کی آبادی کا باعث ہوئی۔ ایک اور جماعت جنوب کی طرف روانہ ہوکر یمن سے گذرتی ہوئی دکن کے مغربی ممالک میں پہونچی اور وندھیا کے نیچے گوداوری اور کرشنا کی وادیوں میں آکر برہما پتر تک پھیل گئی اور قوم آریہ کے ورود سے پہلے مشرق کی عظیم الشان سلطنت کا سنگ بنیاد رکھا۔

آندھرا قوم نے جو سلطنت قائم کی تھی وہ چندراگپتا کے زمانہ میں مگدھ کی سلطنت کے بعد ہندوستان میں سب سے بڑی اور طاقتور سلطنت سمجھی جاتی تھی۔ شام کے بادشاہ سیلوکس کا سفیر میگاس تھی نیز حضرت عیسیٰ سے تین سو سال پہلے چندراگپتا کے دربار میں آیا تھا۔ اس کا بیان ہے کہ آندھرا قوم کی عملداری میں

بے شمار دیہات و قصبات کے علاوہ تیس بڑے بڑے حصار دار شہر تھے۔ اور ان کی فوج ایک لاکھ پیدل، دو ہزار سوار اور ایک ہزار ہاتھیوں پر مشتمل تھی۔

اشوکا نے جو حضرت عیسیٰ سے ڈھائی سو سال پہلے گذرا ہے۔ اپنے چٹانی کتبات میں آندھرا سلطنت کا ذکر کیا ہے۔ اور اس کو اپنی ہمسایہ اور سرحدی سلطنت بتایا ہے۔ اشوکا اور آندھرا دونوں بودھ مذہب کے پیرو تھے اشوکا نے بھکشو بنکر بادشاہت کے ساتھ مذہبی سیادت بھی حاصل کر لی تھی۔ اس لئے آندھرا اشوکا کی بڑی عزت کرتے اور اس کے مذہبی ہدایات کو قابل عمل سمجھتے تھے۔ دریائے گوداوری دونوں سلطنتوں کے درمیان حد فاصل تھا اور اس کے جنوب میں کسی وقت بھی اشوکا کو سیاسی اقتدار حاصل نہیں ہوا تھا۔

آندھرا قوم کا حکمران خاندان جس کا لقب ساتہہ کرنی یا ساتہہ واہن ہے۔ پرانوں کی روایات کے مطابق کنوا خاندان کی تباہی کے بعد برسر اقتدار ہوا ہے۔ پرانوں میں سشرمن کو کنوا خاندان کا اخیر راجہ اور اس کے قاتل سپرا کا کو خاندان ساتہہ واہن کا پہلا راجہ فرض کیا گیا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ سشرمن کے قتل ہونے سے مدت پہلے سپرا کا گذرا ہے۔ کیونکہ ہاتھی گمپا کے کتبہ میں جس ساتہہ کرنی کا ذکر آیا ہے۔ وہ پرانوں کے مطابق خاندان ساتہہ واہن کا تیسرا راجہ ہے اور وہ اشوکا کی وفات سے (۲۳۲) سال بعد حضرت عیسیٰ سے دوسو بارہ سال پہلے بلاشبہ موجود تھا۔ اس سے پہلے آندھرا کے خاندان ساتہہ واھن میں دو راجہ گذر چکے ہیں۔ ایک سپرا کا دوسرا کرشنا۔ پرانوں میں ان کی مدت حکومت تینتیس سال بتائی گئی ہے۔ اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ ساتہہ کرنی کے تخت نشین ہوتے ہی کلنگ کے راجہ

کھارویلانے اس پر حملہ کیا تھا۔ تو اس اعتبار سے راجہ سیمرا کا راجہ اشوکا کا معاصر تھا۔ اور اس کی موت سے گیارہ سال پہلے ۲۴۳ء قبل مسیح میں تخت نشین ہو چکا تھا۔

راجگان ساتہہ واہن کے ایام حکومت کو معین کرنا پرانوں کی رو سے نہایت دشوار ہے۔ ڈاکٹر بھنڈارکر نے پرانوں کے جو نسخے استعمال کئے ہیں ان میں سے وایو پران کی رو سے ان راجاؤں نے دوسو بہتر سال اور مدسیا پران کی رو سے چار سو اڑتالیس سال حکومت کی ہے۔ پروفیسر ولسن نے وشنو پران کے ترجمہ میں ان کا زمانہ حکومت وایو پران کی رو سے تین سو آٹھ سال اور مدسیا پران کی رو سے پانسو گیارہ سال اور برہمانڈ پران کی رو سے تین سو بنتیس سال معین کیا ہے۔

پہلے زمانہ میں رامائن اور مہابھارت وغیرہ کی سند پر راجگان ساتہہ واہن کو ڈراوڈین نسل کے غیر آریہ اقوام سے سمجھا جاتا تھا۔ لیکن آج کل اس نظریہ کے خلاف ان کو آریہ نسل سے بتا کر شمالی ہند کے ساتہوا قبیلہ سے شمار کیا گیا ہے اور کہا جاتا ہے کہ ساتہوا خاندان کے چند افراد شمالی ہند سے آکر دکن میں آباد ہوئے ناگا قوم کے ساتھ ازدواجی تعلقات پیدا کئے۔ اس طرح پر آریہ اور غیر آریہ دو مختلف نسلوں کے میل جول سے خاندان ساتھ واہن وجود میں آیا۔

اشوک کی موت ۲۳۲ء ق م کے بعد سیمرا کا کے جانشین کرشنا نے توسیع مملکت کی کوشش شروع کی۔ ناناگھاٹ کے کتبہ ۲۴۰ء ق م سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اپنے حدود سے نکل کر دو تین سال کے اندر اندر بڑھتا ہوا مغربی گھاٹ تک چلا گیا تھا اور ناسک پر قبضہ کرکے کرشنا اور گوداوری کے دوآبہ کا مالک بن بیٹھا۔

اشوکا کی موت کے گیارہ سال بعد (۲۲۱ء ق م میں) آندھرا قوم نے

کلنگا کے راجہ کھاروِیلا کے ساتھ لڑائی کی۔ ہاتھی گمپا کے کتبہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اسوقت خاندان ساتھہ واہن کا تیسرا راجہ سات کرنی برسرِ حکومت تھا۔ اور اس کو کلنگا کے باشندے مغرب کا بادشاہ کہتے تھے۔

پہلی صدی قبل مسیح کے نصف اول میں کسی آندھرا راجہ نے جس کا نام یقین کے ساتھ بتانا ناممکن ہے۔ کنوا خاندان کے اخیر راجہ سُشَرمن کو مار کر مگدھ کی سلطنت کا بہت بڑا علاقہ فتح کر لیا۔ اور اس کے جانشین کم از کم پچاس سال تک پاٹلی پترا پر قابض رہے۔ یہاں تک کہ کشان خاندان نے ان کو شمالی ہند سے بیدخل کر کے جنوب کی طرف ہٹا دیا۔

اسی زمانہ میں راجگان آندھرا نے مالوہ پر قبضہ کر لیا تھا اور ساتھہ کرنی خاندان کے نویں راجہ نے جو ۶۳ سال ق م سے ۴۵ سال ق م تک اٹھارہ سال حکمران رہا ہے۔ سانچی کے بڑے اسٹوپا کے چار دروازے تعمیر کرائے تھے جو اس زمانہ کی بہترین عمارات میں شمار ہوتے تھے۔ ان کی مُنبت کاری، نقش و نگار، تصاویر کی ترتیب اس دور کے صنعتی معیار اور صناعوں کے کمال کو ظاھر کرتی ہے۔ ایرانی آثوری۔ اور یونانی صناعوں نے ہندو صنعت پر جو اثر ڈالا ہے۔ وہ بھی ان کے نقش و نگار میں نمایاں طور پر نظر آتا ہے۔

راجگان ساتھہ واہن کا سترھواں راجہ ہالا علم و ادب کا سرپرست اور پراکرت زبانوں کا بڑا حامی تھا۔ اس کے زمانہ میں آندھرا دیس کی ادبی زبان پراکرت تھی۔ اور عام طور پر اسی میں تصنیف و تالیف ہوا کرتی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ خود ہالا نے بھی قدیم مرہٹی پراکرت میں متفرق منظومات کا ایک مجموعہ مرتب کیا تھا جسکا نام سپتا ستکا یعنے

ہفت قرن ہے۔

خاندان ساتہہ واہن کے راجاؤں میں گوتمی پتر سب سے جلیل القدر اور ذی ثروت فرمانروا گزرا ہے۔ اس نے اپنی سلطنت کو خوب رونق اور وسعت دی اور بہت سے ممالک فتح کرکے اس کی تہنیت میں راجسویگیہ اور اشومید کے قدیم رسوم بڑی شان و شوکت سے انجام دئے۔

خاندان ساتہہ واہن میں یجنا سری علم و ادب کا سب سے بڑا سرپرست تھا۔ اس کے ایماء سے ماہران تاریخ وانساب نے پراکرت کی متفرق نظموں سے اخذ کرکے عہدِ ماضی کا تاریخی مواد اور نامی گرامی راجاؤں کے نسبی سلسلے جمع کئے تھے۔ یہ سب تاریخی مواد سنہ ۱۶۰ء میں بہاوشیا پران میں شامل کیا گیا۔ پھر سنہ ۳۱۵ء اور سنہ ۳۲۰ء کے مابین پانچ سال کی مدت میں اس پر نظرثانی کی گئی۔ اور یہ اصلاح کیا ہوا مواد وایوپران اور برہمانڈ پران میں شریک کیا گیا اس طرح پر ایک ساتہہ داہن راجہ کی کوشش سے دورِ ماضی کے جو حالات جمع ہوگئے تھے وہ سب پرانوں میں محفوظ کردئے گئے۔

ٹالمی کے زمانہ میں سلطنت آندھرا کا مغربی علاقہ دو حصوں میں منقسم تھا۔ ایک شمالی یعنے مہاراشٹر دوسرا جنوبی یعنے کرناٹا۔ مہاراشٹر کا دارالحکومت پیتھان تھا۔ اور کرناٹا کا مہوکورا یہاں صوبہ دار حکومت کیا کرتے تھے۔ مشرقی علاقہ یعنے تلنگانہ سلطنت کا مرکز تھا اور اس کے دارالحکومت ہناکٹک میں خاص راجگان ساتہہ داہن رہا کرتے تھے۔ اس کے علاوہ ابتدائی دور کا ایک اور بھی دارالحکومت ہے جسے سری کاکلم کہتے ہیں اس کا محل وقوع ضلع کرشنا میں موسلی پٹم سے جانب مغرب اُنیس میل کے فاصلہ پر دریائے کرشنا کے قریب ہے۔

دھنا کٹک نہ صرف ساتھہ واہن خاندان کا بلکہ پلاؤا خاندان کا دارالحکومت بھی رہا ہے۔ اور مشہور چینی سیاح ہیانگ شیانگ یہاں کی ایک بدھتی خانقاہ پروا شیلا میں مدت تک مقیم رہا ہے۔ بعض مصنف اس کو موجودہ بجواڑہ اور بعض دھرنی کوٹہ قرار دیتے ہیں۔ یہ دونوں مقام کرشنا کے کنارے آباد ہیں۔ یہاں بدھتی اور برہمنی دور کے بہت سے آثار موجود ہیں۔

پیٹھان جس کا دوسرا نام پرانستھان ہے۔ ضلع اورنگ آباد میں دکن کا نہایت قدیم مقام ہے۔ اشوکا کے کتبوں میں یہاں کے باشندوں کا پیٹھا نیکا کے نام سے ذکر آیا ہے۔ ٹالمی کی صراحت کے مطابق گوتمی پتر کے فرزند پلومائی نے ولی عہد کی حیثیت سے چوبیس سال پیٹھان میں حکومت کی ہے۔ ہندو روایات کے مطابق مشہور راجہ شالی واہن جس کے نام سے دکن کا سنہ منسوب ہے۔ اسی شہر میں پیدا ہوا ہے۔ شالی واہن شاید بگڑی ہوئی شکل ہے۔ ساتھہ واہن کی جو راجگان آندھرا کا عام لقب ہے۔

ہپوکوراعین اس مقام پر آباد تھا جہاں حیدر آباد آباد ہے۔ اور اس وقت بھی حیدر آباد کا ایک محلہ ہپوگوڑہ کے نام سے مشہور ہے۔ اور اس کا لوکل اسٹیشن چھوٹی لین پر فلک نما اور یاقوت پورہ کے درمیان واقع ہے۔

ٹالمی نے بائیوکورس کو ہپوگوڑہ کا حاکم بتایا ہے اور سکوں پر یہ نام بیلی بائیکر درج ہے اور اس نام کے جو سکّے دستیاب ہوئے ہیں۔ ان پر دو نام کندہ ہیں۔ ایک گوتمی پترا بیلی بائیکر۔ دوسرا واشستی پترا بیلی بائیکر۔ ان میں سے پہلا گوتمی پتر کا بھائی اور دوسرا پلومائی کا بھائی تھا۔ اور یہ دونوں یکے بعد دیگرے گوتمی پتر اور پلومائی

کے عہد میں نائب السلطنت کی حیثیت سے ہپوکورا میں حکمران تھے۔

مرحوم اسمتھ نے ہپوکورا کو موجودہ ناسک اور ڈاکٹر بھنڈارکر نے کولھاپور سمجھا ہے حالانکہ ہپوکورا موسلی کے کنارے آباد تھا۔ برخلاف اس کے ناسک گودریس (گوداوری) کے کنارے اور کولھاپور تینا (کرشنا) کے کنارے واقع ہیں۔ ٹالمی نے عرض وطول کے جو درجے بیان کئے ہیں اُن کی رو سے پروفیسر لاسین اور ریورنڈ بیون نے اس کا محل وقوع عین اس مقام کو بتایا ہے جہاں اس وقت حیدرآباد آباد ہے۔

ٹالمی کا بیان ہے کہ دریائے موسلی جس کے کنارے ہپوکورا آباد تھا خلیج بنگالہ میں گرتا ہے اور اس کے دہانہ پر ایک تجارتی بندرگاہ موسیلیا آباد ہے۔ موسلی کے ساتھ ٹالمی نے ایک اور دریا تینا کا ذکر کرتا ہے۔ جو مغربی گھاٹ سے نکل کر موسلی میں مل گیا ہے موسلی کا نام مسخ ہو کر اس وقت موسی کی شکل میں باقی ہے۔ بندرگاہ موسیلیا اس وقت موسلی پٹم یعنے موسلی ندی کا شہر کہلاتا ہے۔

راجہ یجنا سری کی موت کے بعد خاندان ساتہہ واہن کو انحطاط شروع ہوا۔ اس کے وہ مقبوضات جو مستقر سے دور تھے بتدریج اس کے اثر واقتدار سے آزاد ہونے لگے۔ بیس پچیس سال کے اندر اندر بہت سے چھوٹے چھوٹے خاندان مقامی حکام کی حیثیت سے وجود میں آگئے۔ اور جب سلطنت ساتہہ واہن بالکلیہ نابود ہوگئی تو اس خاندان کے پانچ افراد پانچ مختلف علاقوں میں برسرِ اقتدار ہوگئے۔ جہاں ان کی اولاد مقامی حکام کی حیثیت سے دو ڈھائی سو سال تک حکومت کرتی رہی منجملہ ان پانچ ساتہہ واہن خاندانوں کے ایک خاندان کٹو ساتہہ کرنی کہلاتا ہے۔ جو خاندان کدمبا کے ظہور میں آنے تک کنتلا کی سرزمین میں حکمران رہا ہے۔

خاندان ساتہہ واہن کے زوال پذیر ہونے کے بعد جو اجنبی خاندان ظہور میں آئے ہیں۔ ان میں سے بعض کے نام یہ ہیں۔ ابھیرا۔ گارڈا بھیل۔ وندھیاکا۔ ساکا۔ توسارا۔ وغیرہ۔

۱۶۴

خاندان ساتہہ واہن کے جانشینوں کی حیثیت سے پرانوں میں ان خاندانوں کا ذکر آیا ہے۔ مالوہ اور مشرقی راجپوتانہ ان کا مرکز تھا۔ اور یہ سب ایک دوسرے کے معاصر تھے۔ اور ان کو کسی وقت بھی شاہی اقتدار حاصل نہیں ہوا تھا جو حکام راجگان گپتا (۳۲۰ء تا ۶۰۶ء) کے زیر حمایت تھے اور ان میں دو خاندان پیش پیش نظر آتے ہیں ایک وکٹکا۔ دوسرا کھری۔ پہلا خاندان مہاراشٹر میں حکمران تھا۔ دوسرا خاندان راجگان گپتا کے ساتھ ان کی عملداری میں شریک کی حیثیت سے حکومت کیا کرتا تھا۔

بعض تحقیق طلب اسناد سے ظاہر ہوتا ہے کہ ملک آندھرا میں اکسوا خاندان راجگان ساتہہ واہن کا جانشین ہوا تھا۔ جس نے بلا دفعہ کئی قرن حکومت کی یہاں تک کہ پلاوا راجہ سیوا اسکندا ورمن نے اس کو تباہ کر دیا اور ملک پر قبضہ کر کے دھنا کٹک کو اپنا دارالحکومت بنایا۔

مہا ہند

آزادیٔ ہند کی دوسری سالگرہ کا علمی پیشکش

قدیم ہندوستان کی تجارت

(از)

مسٹر محمد وحید (ام۔ اے)

۱۵۔ اگست سنہ ۱۹۴۹ء

ہندقدیم پر ہندوؤں کی مقدس کتابوں اور غیر ملکی سیاحوں کے سفرناموں سے روشنی پڑتی ہے اور تاریخی قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندو تہذیب نہایت قدیم ہے درحقیقت یہ کہنا مشکل ہے کہ بابل، ایران، مصر وغیرہ کا تمدن زیادہ قدیم ہے یا ہندوستانی تہذیب ۔ بہرحال یہ باور کرنے کے معقول وجوہ ہیں کہ ہندو زمانہ ہائے دراز سے تجارت کرتے آرہے ہیں اور اس لحاظ سے اُنہیں وہی حیثیت حاصل ہے جو قدیم زمانہ میں اہل فنیقیہ (فی نیشیا) کو حاصل تھی ۔

کسی ملک کی تجارت اسکی خوشحالی اور تمدنی ترقی کا بیّن ثبوت ہوتی ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ اس ملک میں امن کا دور دورہ ہے اور لوگوں کے پاس اپنی ضروریات سے زائد چیزیں موجود ہیں اور ان کی معاشرت بھی اس قسم کی ہے کہ وہ اپنے یہاں کی چیزیں باہر بھیجکر جو اشیا، ان کے یہاں پیدا نہیں ہوتیں انہیں وہ غیر ممالک سے منگواتے ہیں ۔

ہندو سماج میں تجارت پیشہ لوگ ہمیشہ سے بڑی وقعت کی نظروں سے دیکھے جاتے تھے اور قومی جلسوں میں ان لوگوں کی شمولیت ضروری سمجھی جاتی تھی ۔ چنانچہ رامائن میں ذکر ہے کہ جب راجہ رامچندرجی اپنے بن باس کی میعاد پوری کرکے اجودھیا واپس آرہے تو اُن کے استقبال کے لئے ایک زبردست جلوس مرتب کیا گیا تھا

جسمیں تمام اراکین سلطنت کے بعد تجار اور دیگر سربرآوردہ اشخاص بھی شامل تھے۔
اس جلوس کے آگے اور پیچھے فوج تھی۔

167

غیر ممالک سے تجارت کے علاوہ قدیم ہندوؤں کی اندرونی تجارت بھی وسیع پیمانہ پر تھی، دکن کی زمین پتھریلی ہے اسلئے وہاں گیہوں اور چاول وغیرہ کے اناج بہت کم پیدا ہوتے ہیں، چنانچہ وادی گنگا کی پیداوار کا بیشتر حصہ دکن بھیجا جاتا تھا، جس کے عوض وہاں سے گرم مصالحے، تلہن، سونا اور موتی وغیرہ شمالی علاقوں میں لائے جاتے تھے۔ خلیج منار میں موتی بڑی کثرت سے پیدا ہوتے ہیں، چنانچہ زمانۂ قدیم ہی سے ان کی تجارت جاری ہے۔

سونا اور دیگر قیمتی دھاتیں ہندوستان میں افراط سے ملتی ہیں۔ اسی لئے اہل مغرب ہندوستان کو ہمیشہ "سونے کی چڑیا" سمجھتے رہے۔ اگرچہ ہندوستان میں سونے اور چاندی کی اتنی افراط نہیں جتنی افریقہ یا آسٹریلیا میں ہے تاہم زمانہ دراز سے اس کی دولتمندی کی شہرت قائم ہے۔ جس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اہل ہند یہ دونوں دھاتیں دوسرے ملکوں سے منگوایا کرتے تھے۔ رامائن میں بھی اکثر مقامات پر سونے کی افراط اور اسکے کثیر استعمال کا ذکر آتا ہے۔ رانی سیتا کی شادی کے موقع پر انہیں جو جہیز دیا گیا تھا وہ تقریباً تمام سونے ہی کا تھا۔ اور اشرفیوں کے توڑوں اور سونے کے ڈلوں کا تو کوئی شمار ہی نہ تھا۔ رامائن کے زمانے سے ذرا آگے چلکر دیکھئے تو زر و جواہر کے انبار نظر آتے ہیں۔ چنانچہ سومنا تھ جی کے مندر کی دولت کا اندازہ لگانا بہت مشکل ہے۔ جنگ و جدل میں ٹھوس سونے کے بڑے بڑے رتھ استعمال ہوتے تھے، مندروں میں سونے کے گھنٹے لٹکائے جاتے تھے، ہاتھی گھوڑے بھی زرکار اور جواہرات سے مرصع زیورات سے سجائے

جاتے تھے، اور شاہی محلات میں تو تقریباً سبھی چیزیں سونے کی ہوا کرتی تھیں۔

اس "عہدِ زرّیں" کا ایک ادنیٰ سا نمونہ آج بھی نظر کے سامنے ہے، یعنی مندروں کے زرّین کلس آج بھی سورج کی دھوپ میں جاتریوں کی آنکھوں میں چکاچوندھ پیدا کر دیتے ہیں۔ انہیں کی تقلید میں مسلمانوں اور سکھوں نے بھی اپنی مسجدوں اور گوردواروں کو مطلّا بنانے کی کوشش کی۔

سلطنت فی نیشیا (فینیقیہ) قدیم زمانہ کی ایک وسیع سلطنت تھی اور دنیا کے کئی ممالک اس کے باجگزار تھے۔ انہیں ممالک سے ایک ہندوستان بھی تھا مگر یہاں خراج میں چاندی کے بجائے سونا پیش کیا جاتا تھا۔

ان واقعات سے دو نتیجے اخذ ہوتے ہیں۔ اوّل یہ کہ زمانۂ قدیم میں ہندوستان میں سونے کی عظیم الشان کانیں موجود تھیں جو اب معدوم ہیں یا ختم ہو چکی ہیں۔ دوسرے یہ کہ ہندوستان والے غیر ممالک سے تجارت کر کے ان سے سونا لیا کرتے تھے۔ پہلا نتیجہ محض قیاس پر مبنی ہے، محققین کو کانوں کا نہ تو کوئی تاریخی ثبوت ملا ہے اور نہ روایت و درایت ہی سے ان کا کوئی نشان یا پتہ پایا جاتا ہے۔ حتیٰ کہ غیر ممالک کے سیاح بھی جو وقتاً فوقتاً ہندوستان میں آتے رہے ہیں اس بارے میں بالکل ساکت ہیں۔ لیکن دوسرے نتیجے کو تاریخی حیثیت حاصل ہو چکی ہے یعنی جب رومیوں کی سلطنت عروج پر تھی تو ہندوؤں کا ان کے ساتھ بحری و برّی تجارت کرنا ثابت ہوتا ہے۔ چنانچہ پلاٹنی روما کا مشہور محب وطن مورخ اپنی "تاریخ روما" میں شاکی ہے کہ "ہندوستان کے باشندے میرے ملک سے ہر سال کروڑوں روپیہ کا مال معمولی اشیاء کے تبادلے میں اڑا لے جاتے ہیں!"

ہندوؤں کی تجارت کے اس زبردست ثبوت کی تردید ممکن نہیں ہے۔ اور اس سے یہ بات بھی ثابت ہوتی ہے کہ جب اہل ہند روما تک جا پہونچے تھے تو ان کے لئے اس سے آگے مغرب، شمال یا جنوب کی جانب پہنچ جانا ایک قدرتی امر تھا۔

یہاں پر یہ سوال قدرتاً پیدا ہوتا ہے کہ ہندوؤں کے ہاں کسی باقاعدہ سکہ کا رواج تھا یا نہیں، اور اگر اس کا رواج تھا تو وہ کب سے شروع ہوا۔ اس زمانہ کے بڑھتے ہوئے تمدن کو دیکھکر لامحالہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ کسی نہ کسی قسم کا کوئی سکہ ضرور موجود تھا، کیونکہ محض اجناس کے تبادلے سے اکثر حالتوں میں کام نہیں نکل سکتا بہرحال قدیم ہندو کتابوں اور روایتوں سے اتنا پتہ ضرور چلتا ہے کہ مہاراج کرشن سے پہلے سکہ رائج تھا مگر یہ تحقیق نہیں ہوسکا ہے کہ یہ سکہ کب سے رائج ہوا اور اس کی مالیت کیا تھی؟ تاریخ کے مطالعہ سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ سب سے پہلا سکہ جو عام طور پر رائج ہوا روپیہ ہے۔ لیکن قدیم زمانے میں سونے کی افراط دیکھکر خیال ہوتا ہے کہ یہاں کا اعلیٰ سکہ ضرور سونے کا ہوگا۔ کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی کہ معمولی سے معمولی اشیاء تو سونے کی ہوں مگر سکہ چاندی یا کسی اور دھات کا ہو۔ چنانچہ جیسا کہ اوپر ذکر ہو چکا ہے رامائن سے کچھ کچھ پتہ چلتا ہے کہ سونے کا سکہ موجود تھا اور سیتا جی کی شادی پر سونے چاندی کی اشیاء کے علاوہ بیشمار طلائی سکے بھی جہیز میں دئے گئے تھے۔

ہندوستان میں جواہرات کی بیش بہا کانیں بھی موجود تھیں اور موتی تو اب بھی افراط سے دستیاب ہوتا ہے۔ اور ہزارہا سال سے ہندوؤں کے یہاں موتی اور جواہرات استعمال ہوتے چلے آتے ہیں۔ بعض لوگ ابھی تک اپنے بچوں کے نام موتی، پنّا اور ہیرا وغیرہ پر رکھتے ہیں۔ منوسمرتی میں ویش لوگوں کو خاص طور پر ہدایت

ہے کہ وہ جواہرات وغیرہ کی اصلی اور عارضی قیمت سے ہر وقت مطلع رہا کریں۔ اسکے علاوہ پرانے زمانہ کی مورت یا سنگ تراشی کے مجسّمہ کانوں گلے۔ ہاتھوں وغیرہ میں موتیوں کے زیورات نظر آئیں گے۔

تمام جواہرات جن میں ہیرے اور لعل کو امتیازی شان حاصل تھی اندرون ملک سے لاکر تل کینڈا کی بندرگاہ پر جمع ہوتے تھے، اور وہاں سے حسب ضرورت مختلف ممالک کو روانہ کر دئے جاتے تھے۔ اس سے بھی واضح ہوتا ہے کہ ہیرے کی کانیں جو اس وقت بھی ہندوستان میں موجود ہیں ہزارہا سال پیشتر کی دریافت شدہ ہیں۔

قدیم ہندوستان کی صنعت و حرفت بھی حیرت انگیز تھی۔ شمال مشرقی ہندوستان گرم و مرطوب ہونے کی وجہ سے ہاتھیوں کا گھر ہے۔ جہاں قدرتی و مصنوعی پیداوار میں ہاتھی دانت کی صنعت کو خاص فوقیت حاصل ہے ایلیفنٹا میں جو بت ملتے ہیں اُن کے کانوں کے آویزے اور گلے کے ہار قدیم صنعت گری کے دلکش نمونے ہیں۔ اب تو شائد زمانہ کی دست برد سے یہ زیورات کہیں بھی محفوظ نہیں رہ سکے لیکن تین ساڑھے تین سو سال قبل مسیح اس قسم کے کثیر التعداد زیورات اپنی اصلی حالت میں موجود تھے۔

مشہور سیاح میگستھینز لکھتا ہے کہ ایلیفنٹا میں کئی ہار ایسے موجود ہیں جو ہاتھی دانت کے ایک ہی ٹکڑے سے تراشے گئے ہیں، ان کے حلقوں میں مطلق کوئی جوڑ نہیں، حالانکہ ان میں سے اکثر دس دس فٹ لمبے ہیں۔ اور ہاتھیوں کے جو ہودے بنائے گئے ہیں اُن میں اگرچہ جوڑ نظر آتے ہیں تاہم وہ اتنے شاندار اور بے عیب ہیں کہ انہیں دیکھکر عقل دنگ رہجاتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ہاتھی دانت کو پگھلا کر اسے مطلوبہ شکل میں ڈھال لیا گیا ہے۔

تاریخ و روایت دونوں سے یہ بات بھی ثابت ہے کہ ہندوستان قدیم کی صنعت وحرفت کا سب سے اہم شعبہ" پارچہ بافی " تھا۔ اس صنعت کیلئے ہندوستان قدرتاً موزوں واقع ہوا ہے۔ روئی اور دیگر خام اجناس جو پارچہ بافی کے لئے درکار ہوتی ہیں یہاں کثرت سے پیدا ہوتی ہیں۔ ہینو نے اپنی تاریخ میں قدیم ہندوستانی ساخت کے تجارتی کپڑوں کے نمونوں کا اس قدر حوالہ دیا ہے جس کو دیکھکر معاً یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ پارچہ بافی کے میدان میں ہندوستان کتنی ہی ترقی کیون نکرے لیکن اُن پرانے نمونوں میں اضافہ نہیں ہوسکے گا۔

ڈھاکہ کی نفیس ململ صدہا سال سے مشہور چلی آتی ہے۔ مسلم فرمانرواؤں کے وقت تک اس کی یہ حالت تھی کہ دو گز عرض کی ململ کا تھان ایک معمولی انگوٹھی سے بہ آسانی گذر سکتا تھا۔ اور اس کی نفاست کا یہ عالم تھا کہ کئی کئی تہوں سے بھی جسم صاف نظر آتا تھا، حالانکہ اس زمانہ میں کلوں کا وجود بھی نہیں تھا اور سب کام ہاتھوں ہی سے انجام دیا جاتا تھا۔ چنانچہ جب انگریز اس ملک میں آئے تو سب سے پہلے جس چیز پر اُن کی توجہ مبذول ہوئی وہ ڈھاکہ کی ململ تھی۔

یہاں ہر طرح کا کپڑا تین قسم کا بنایا جاتا تھا، اعلیٰ، اوسط، اور ادنیٰ۔ اور اسی تفصیل کے مطابق اس کی قیمت مقرر ہوتی تھی۔ سادہ کپڑا تو خیر لاجواب تھا ہی، مخطّط، مشجّر اور منقش کپڑوں کا بھی کوئی شمار نہ تھا۔

لٹھا جو آج تقریباً سب کا سب باہر سے آتا ہے پہلے مغربی گھاٹ کے علاقوں میں بکثرت بنایا جاتا تھا۔ اس کا سب سے بڑا مرکز شہر کالی گھاٹ (موجودہ کالی کٹ) تھا۔ جہاں ولندیزوں، پرتگیزوں، انگریزوں اور فرانسیسیوں نے اپنی

تجارتی کوٹھیاں قائم کیں۔ لٹھے کا انگریزی نام Calico درحقیقت اسی شہر کالی کٹ کے نام پر رکھا گیا۔

۱۷۲

منقش ارغوانی کپڑے، زربفت، کمخواب وغیرہ بھی بکثرت بنے جاتے تھے اور یورپ میں ان کی بڑی مانگ تھی، چنانچہ ہر سال لاکھوں روپیہ کا مال ممالک غیر میں جا کر فروخت ہوتا تھا۔

یونانی لوگ جب ہندوستان آئے تو انھیں ہندوؤں کے سفید کپڑے بہت پسند آئے اور انھوں نے ململ اور لٹھے کو کثیر مقدار میں خریدا کیا۔ یہاں تک کہ خود سکندر بھی ان کپڑوں کی غیر معمولی نفاست اور سفیدی سے متاثر ہو کر کہنے لگا کہ "مجھے ہندوستان کی تین چیزیں بہت پسند آئی ہیں، سفید کپڑا، زر و جواہر کی کثرت اور باشندوں کی غیر معمولی جسمانی طاقت اور خوش اندامی"۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ پارچہ بافی میں ہندوستان سکندر اعظم کے حملے سے پہلے یعنی آج سے ساڑھے بائیس سو سال پیشتر ہی یونان سے سبقت لے گیا تھا۔

یہودیوں کے پیغمبر حزقیل کے بیان کے مطابق صور، صیدا اور بابل میں جو سادہ رنگین اور دھاری دار کپڑا باہر سے آتا تھا، اس سے نصف کے قریب ہندوستان کا بنا ہوا ہوتا تھا۔

یہ کم و بیش تین ہزار سال قبل مسیح کا زمانہ تھا جس کا یہ حوالہ دیا گیا، اس وقت بابل، فینیقیہ اور ہندوستان کی تجارت پورے عروج پر تھی۔

منشیات کا استعمال بھی ہندوستان میں قدیم ہی سے چلا آتا ہے، لیکن یہ ہمہ گیر نہیں تھا۔ رامائن میں عوام الناس کو دو گروہوں میں تقسیم کیا گیا ہے، ایک کا نام سُور ہے

اور دوسرے کا اسُور۔ اول الذکر منشیات کا استعمال کرتے تھے اور مؤخرالذکر ان سے پرہیز کرتے تھے۔ اس تقسیم سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ منشیات کے استعمال کا رواج رامائن سے بہت پہلے شروع ہو چکا تھا۔

منشیات میں سب سے پہلے شراب ہی کا ذکر آتا ہے، لیکن قرین قیاس یہ ہے کہ شراب ہندوستان کی ایجاد نہیں ہے، کیونکہ اول تو یہاں انگور اتنی کثرت سے پیدا نہیں ہوتے کہ وہ شراب بنانے کے کام آسکیں دوسرے یہ بات بھی ثابت نہیں ہوتی کہ ہندوستان کے لوگ انگور سے شراب بنایا کرتے تھے۔

بہرنوع ہندوستان میں شراب کے رواج سے دو میں سے ایک بات ضرور ثابت ہوتی ہے۔ ایک تو یہ کہ شراب دوسرے ممالک سے منگوائی جاتی تھی، یا اگر وہ ہندوستان ہی میں بنائی جاتی تھی تو انگور کے بجائے کسی اور چیز تاڑی، مہوہ اور کھجور وغیرہ سے بھی بنائی جاتی ہوگی۔ ہیتو کا بیان ہے کہ کھجور عرب سے لائے جاتے تھے اور تاڑی ہندوستان میں افراط سے مل سکتی ہے۔

تیز شراب بھپکے سے تیار کی جاتی تھی۔ رامائن میں بھی ایک قسم کی شراب کا ذکر آتا ہے جو میوؤں اور گنے کے رس سے بنائی جاتی تھی۔ اسی طرح منوسمرتی میں بھی تین قسم کی شراب کا ذکر ہے، شیرہ کی شراب، چاولوں کی شراب، اور مدھک کے پھولوں کی شراب مدھک سنسکرت میں مہوہ کو کہتے ہیں، مہوہ کی شراب اب بھی بنتی ہے۔ پہلی دو قسموں کو بالترتیب Rum اور Arrack کہہ سکتے ہیں۔ منوجی نے برہمنوں کو ان تینوں قسموں کی شراب سے پرہیز کرنے کی تاکید کی ہے۔

گرم مسالے ہندوستان میں اتنی کثرت سے پیدا ہوتے ہیں کہ مغربی ممالک کے

لوگ اسے "سرزمین مسالہ جات" کے نام سے پکارتے ہیں۔ اور اس میں شک نہیں کہ ہندوستان صدہا سال سے مغربی دنیا کو گرم مسالے مہیا کر رہا ہے، خصوصاً فینیقہ والے تو اس جنس کے بہت ہی دلدادہ تھے۔ ان کے تجارتی بیڑے ہمیشہ مغربی گھاٹ، لنکا اور جزائر شرق الہند کے سواحل پر جمع رہتے اور جہاز بھر بھر کر گرم مسالے لیجاتے تھے۔

خود ہندوستان میں گرم مسالوں کی چنداں قدر نہ تھی، کیونکہ بحیثیت مجموعی یہ ایک گرم ملک ہے۔ یہاں کے لوگ مسالوں کا زیادہ استعمال نہیں کر سکتے۔ لیکن سرد ملکوں میں ان کی بہت زیادہ مانگ ہے سولھویں صدی عیسوی کے آخر میں پرتگیزوں نے تقریباً تمام جزائر شرق الہند پر محض گرم مسالوں کیلئے قبضہ کر رکھا تھا۔ وہ اس تجارت سے مالا مال ہو گئے تھے اور ان کی دیکھا دیکھی انگریزوں نے بھی اس کی تجارت شروع کی تھی، چنانچہ انگریزوں نے اس سے اتنا نفع اٹھایا کہ "انگلستان میں جن لوگوں کو ایک وقت کا کھانا بھی میسر نہیں آتا تھا وہ بھی اتنے مالدار ہو گئے کہ چوکڑی میں سوار ہونے لگے"۔

سیاہ مرچ جو صرف ہندوستان میں پیدا ہوتی ہے تمام مغربی ممالک میں قدیم ایام سے مشہور تھی۔ حکیم ارسطو کے جانشین تھیو فریسٹس نے اپنی مشہور کتاب میں (جس کا انگریزی ترجمہ History Of Plants کے نام سے مشہور ہوا ہے) سیاہ مرچ کی کئی قسموں کا مفصل حال لکھا ہے۔ سیاہ مرچ کا اصلی وطن جنوبی ملیبار ہے۔ اگرچہ یہ جزائر شرق الہند میں بھی عام طور پر پیدا ہوتی ہے مگر جو خوبی ملیباری مرچ میں ہے وہ اس میں نہیں۔

ہندوستان میں جو عطریات تجارت کی غرض سے تیار کئے جاتے تھے ان کے

نصف کے قریب اجزا دیسی ہوتے تھے اور نصف دوسرے ممالک سے منگوائے جاتے تھے، مثلاً صندل خاص ہندوستان کی پیداوار ہے، رامائن اور گیت گووند میں اس کا جا بجا ذکر آیا ہے۔ لیکن لوبان عرب سے آتا تھا۔

ہندو لوگ خوشبو دار چیزوں کے بہت شائق تھے اور یہی وجہ ہے کہ خوشبویات کا استعمال ان کی مذہبی رسمیات میں داخل ہے یہاں تک کہ کافور یا دھوپ کے استعمال کے بغیر ان کی کوئی مذہبی رسم پورے طور پر ادا نہیں ہو سکتی۔

موجودہ سائنس نے خوشبویات کو جراثیم کش ثابت کیا ہے، اسلئے ہندوستان جیسے گرم ملک میں جہاں کی تمام ہوا جراثیم سے پُر رہتی ہے خوشبویات کا استعمال نہایت مفید و ضروری ہے۔ قدیم ہندو جو طب کے بھی ماہر تھے اس بات سے بخوبی آگاہ تھے کہ خوشبویات سے نہ صرف دل و دماغ ہی تازہ ہوتا ہے بلکہ جراثیم کش ہونیکی وجہ سے اس کا استعمال مفید بھی ہے۔ چنانچہ ان کے مذہبی پیشروؤں نے اسکے استعمال کی تاکید کر دی ہے۔

ہندو مدت دراز سے مدنی الطبع ہیں، اس لئے ہندوستان کے مکانات اور گلی کوچے تنگ ہوا کرتے تھے، اور چونکہ ایک ایک مکان میں متعدد آدمی رہتے تھے اسلئے یہاں کی آبادیوں کی ہوا کا کثیف ہو جانا لازمی تھا شاید اسی خیال سے ہوا صاف کرنے کے لئے صندل۔ عود وغیرہ جلانے کی رسم سی پڑ گئی تھی۔ رامائن میں ذکر ہے کہ جب بھرت جی اپنے نانا کی راجدھانی میں داخل ہوئے تو "شہر کے لوگوں نے انکی پیشوائی کے لئے بازاروں کو صاف کر کے چھڑکاؤ کیا، باریک اور نرم ریت بچھائی، بازاروں میں دو رویہ خوشبودار پھولوں کے گملے سجائے اور تمام مکانات کے دروازوں پر

پھولوں کے ہار آویزاں کئے اور جا بجا لوبان اور دوسری خوشبو دار چیزیں جلائیں۔

یہاں کی خوشبویات کی نہ صرف ہندوستان ہی میں کھپت تھی بلکہ دوسرے ملکوں میں بھی ان کی مانگ تھی۔ چنانچہ ایران۔ فینیقیہ۔ اور روما کے عبادت خانوں میں ہندوستان کے بخور جلائے جاتے تھے۔ مگر ہندو عطر بنانا نہیں جانتے تھے، یہ درحقیقت مسلمانوں کی ایجاد ہے۔ بہرحال ہندوؤں اور مسلمانوں کے مطیبات میں سب سے بڑا فرق یہ ہے کہ اول الذکر بخور جلا کر خوشبو پیدا کرتے تھے اور موخر الذکر خوشبو دار چیزوں کا عطر کھینچ لیتے تھے، لیکن آج کل یہ فرق بھی نہیں رہا۔

قدیم ہندوستان کی تجارت پر بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے۔ ان کے علاوہ متعدد ایسی اشیا تھیں جو قدیم تجارت کی فہرست میں شامل تھیں، بعض کا مختصر حال درج ذیل ہے۔

فولادی تلواریں۔ لوہا ہندوستان میں مقابلتہً بہت کم دستیاب ہوتا ہے، تاہم ہندو اس کا ایسا اچھا استعمال جانتے تھے کہ اس زمانہ کی کوئی قوم ان کا مقابلہ نہیں کر سکتی تھی۔ یہاں کی فولادی تلواریں دُور دُور تک مشہور تھیں اہل ایران ان کے خاص طور پر قدردان تھے۔ "تیغ ہندی" آجتک زبان زد خاص و عام ہے۔

یہ امر بھی دلچسپی سے خالی نہیں ہے کہ راجہ پورس نے سکندر اعظم کو جو تحائف پیش کئے تھے ان میں بہت سی تلواریں بھی تھیں۔ اور اہل فینیقیہ نے کئی معرکے انہی تلواروں کے دم سے سر کئے تھے۔

اِن تلواروں کی نسبت مشہور ہے کہ وہ کلائی میں کاغذ کی طرح لپیٹی جا سکتی تھیں اور سپاہی کئی کئی تلواریں گھوڑے کے خورجین میں رکھ لیا کرتے تھے۔

اگر یہ بیان صحیح ہے تو ہمیں قدیم ہندوستان کی صنعت گری کا لوہا ماننا پڑیگا۔

لیکن اگر یہ مبالغہ ہے تب بھی اس میں کلام نہیں ہو سکتا ہے کہ ہندی فولاد ایک عجیب چیز تھی۔

۱۷۷ رنگ۔ نیل، کسم اور رتن جوت اس ملک میں کثرت سے پیدا ہوتے ہیں اور یہی تینوں بنیادی رنگ ہیں۔ باقی تمام رنگ انہیں کی آمیزش سے بنائے جاتے ہیں چنانچہ رنگوں کی تجارت بھی خوب ہوتی تھی، گو قدیم ہندوستان میں کیمیاوی طریقے سے رنگ نہیں بنائے جاتے تھے تاہم وہ خاصے شوخ اور خوشنما ہوتے تھے۔ نیل کی تجارت بڑے وسیع پیمانہ پر ہوتی تھی، ایران، عرب اور فینیقیہ والے ہر سال سینکڑوں من نیل خرید لے جاتے تھے۔

فینیقیہ کے لوگ بندروں کے بہت شائق تھے، معمولی بندر تو افریقہ سے بھی حاصل ہو سکتا تھا لیکن لنگور صرف ہندوستان ہی میں ملتے ہیں اور ان کی مانگ بہت تھی فینیقیہ کے ایک فرمانروا حیرام نے حضرت سلیمان کو ہیکل کی آرائش کے لئے بہت سے مور بھیجے تھے جو سب کے سب ہندوستان سے حاصل کئے گئے تھے۔

اس کے بعد اہل فینیقیہ اس پرند کے اتنے گرویدہ ہو گئے کہ ہر سال لاکھوں مور ہندوستان سے بھیجے جانے لگے۔ کہا جاتا ہے کہ انھوں نے مور کو اپنے ملک کا باشندہ بنانا چاہا مگر کامیاب نہ ہو سکے۔

قدیم زمانہ میں غلاموں کی تجارت بڑے عروج پر تھی، شام، مصر، روم وغیرہ میں بردہ فروشی انتہائے کمال کو پہنچ چکی تھی۔ ہر سال کروڑوں بدقسمت، مرد، عورتیں بچے مویشیوں کی طرح فروخت ہوتے تھے۔ اس خرید و فروخت میں اہل فینیقیہ بڑی شد و مد سے حصہ لیتے تھے۔ ان کی اس تجارت کی منڈیاں کئی ملکوں میں تھیں

جنمیں سے ایک ہندوستان بھی تھا۔ لیکن یہ وثوق سے نہیں کہا جاسکتا کہ ہندوستان والے غلام خریدتے تھے یا فروخت کرتے تھے۔ بہرصورت مردوں کی نسبت عورتوں کی تجارت زیادہ ہوتی تھی۔

ان چیزوں کے علاوہ اُون اور اونی کپڑے، گھوڑوں کے چارجامے، کمبل، دُھسّے وغیرہ بہت کثرت سے فروخت ہوتے تھے۔

ہندوستان کا بیشتر علاقہ پہاڑی ہے اس لئے یہاں کاروانوں کے ذریعہ تجارت کرنا قریباً ناممکن تھا، تاہم اکثر مقامات پر کاروانوں کے ذریعہ سے تجارت کی جاتی تھی۔ چنانچہ نَل اور دمینتی کے قصے میں کاروان کا ذکر آتا ہے، لیکن یہ کاروان اونٹوں کی بجائے ہاتھیوں کا تھا۔

کوہستانی علاقوں میں زیادہ تر غلاموں کے ذریعے تجارت ہوتی تھی، لیکن گنگا اور سندھ کی وادیوں میں دریاؤں میں جہاز چلتے تھے۔ چنانچہ جب ٹھٹّہ (سندھ) کے حاکم مرزا جانی نے اکبر کے خلاف بغاوت کی تو اکبر نے بہت سا سامان جنگ راوی کے ذریعہ سے ٹھٹّہ کو بھیجا تھا۔ اکبر نامہ میں ذکر ہے کہ:-

> "بادشاہ نے اس مہم میں ایک لاکھ روپیہ ایک مرتبہ، پچاس ہزار ایکدفعہ اس کے بعد ایک لاکھ روپیہ ایک لاکھ من غلّہ، سو بڑی توپیں اور دیگر سامان جنگ، ٹھٹّہ کو بھیجا۔ مرزا عبدالرحیم خانخاناں اس مہم کا سپہ سالار تھا وہ پچیس جنگی کشتیاں لاہور سے لے گیا تھا۔"

اسی طرح دکن کے کئی دریا بھی اس زمانے میں جہاز رانی کے قابل تھے، اور ان میں ہر وقت تجارتی جہازوں کی آمد و رفت رہتی تھی۔ یہ تجارتی جہاز بادبانوں

سے چلتے تھے مگر ان کی رفتار دھیمی ہوتی تھی۔ دکن کے مشرقی اور مغربی سواحل کے مابین تقریباً تمام تجارت جہازوں ہی کے ذریعے سے ہوتی تھی۔

دریاؤں کے علاوہ ملک میں جا بجا سڑکیں موجود تھیں، ان میں سے بعض کا ذکر راماین میں آتا ہے اور ہر سال لاکھوں بلکہ کروڑوں جاتریوں کا بنارس، ہردوار جگن ناتھ وغیرہ جانا اس بات کا بیّن ثبوت ہے کہ سڑکیں موجود تھیں، اگرچہ موجودہ سڑکوں کی طرح عام اور پختہ نہ تھیں، مگر جو موجود تھیں اُن کی اچھی طرح حفاظت ہوتی تھی۔ ان پر جا بجا چوکیاں بنی تھیں اور مسافروں کے آرام کی خاطر آب وطعام اور شب باشی کا پورا پورا انتظام تھا۔ یہ انتظام ہر علاقے کے حاکم کا فرض تھا، اگر اس علاقہ میں کوئی قافلہ یا شخص لوٹ لیا جاتا تو وہاں کا حاکم اسکے نقصان کا ذمہ دار سمجھا جاتا تھا۔

ہندو تجارت کا سب سے مستحکم اور پُر رونق مرکز شہر اوفیر تھا، اوفیر عبرانی میں "کثرت وافراط" کو کہتے ہیں، اسی سے عربی الفاظ وافر۔ وفور۔ توفیر وغیرہ مشتق ہیں۔ یہ ایک سرزمین یا شہر کا نام تھا جسکے جغرافیائی محل وقوع کی نسبت مختلف رائیں ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ یہ شہر عرب کے جنوبی ساحل پر آباد تھا، اکثروں کا خیال ہے کہ ہندوستان کے مغربی ساحل کو اس نام سے موسوم کرتے تھے۔ بعض یہ بھی کہتے ہیں کہ افریقہ کے مشرقی ساحل کا نام تھا، لیکن موجودہ تاریخی انکشافات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس نام کا ایک شہر ہندوستان کے مغربی ساحل پر موجودہ بمبئی سے ذرا شمال کی طرف واقع تھا، اور اس کی بنا اہل فینیقیہ نے رکھی تھی اور توراۃ میں صاف لکھا ہے کہ

"فینیقیہ کے تجار کا جہازی بیڑا بالعموم ہر تیسرے سال اوفیر کو روانہ ہوتا تھا، جہاں سے خالص سونا، نفیس جواہرات، صندل کی لکڑی

اور بخور لائے جاتے تھے۔"

اس سے ظاہر ہے کہ اوفیر ہندوستان ہی میں کہیں واقع تھا اور ہندو لوگ اہل فینیقیہ سے تجارت کرتے تھے۔ آخری حوالہ چونکہ توراۃ سے مستنبط ہے اس لئے اس کی صحت میں کلام نہیں ہو سکتا اور قدیم ہندوستان تجارت کے میدان میں کسی ملک سے ہرگز پیچھے نہیں تھا۔

ہند

آزادیٔ ہند کی دوسری سالگرہ کا علمی پیشکش

ہندوستان کا فنِ موسیقی

از

مسٹر محمد یعقوب (بی، اے)

۱۵- اگست سنہ ۱۹۴۹ء

ہندوستان کی قدیم روایت ہے کہ جب شیوجی نے دنیا میں بدنظمی اور سرکشی دیکھی تو لوگوں کو تسکین دینے اور اعتدال پر لانے کیلئے حسن کاری (آرٹ) سکھائی لیکن جب اس سے بھی امن وسکون قائم نہ ہوا تو پھر انھوں نے عوام کو موسیقی کا سبق دیا۔ جس سے تمام دنیا میں انتظام و ہم آہنگی قائم ہوگئی۔ یہ مشرقی روایت ہے' مشہور مغربی فلسفی رسکن کا قول ہے کہ:۔

"موسیقی بحالت صحت و درستی امن وسکون کا سبق سکھاتی ہے۔ وہ قدوسیوں کی نوائے تہلیل و تسبیح ہے' وہ فضائے بسیط میں اجرام سماوی کی رفیق طریق ہے۔ لیکن یہی موسیقی ابتذال و نادرستی کی حالت میں کامل بدنظمی و سرکشی سکھاتی ہے۔"

ہندوستانی موسیقی کی تاریخ' قدامت کے پردہ میں ڈھکی ہوئی ہے جس کا اُٹھانا قریب قریب محال ہے۔ بایںہمہ قدیم کتابوں میں موسیقی کے جو حوالے ملتے ہیں اُن سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ فن ہندوستان میں ہزارہا سال پہلے سے موجود تھا۔ ہندوستان میں مختلف آلات موسیقی اور قدیم عمارتوں کی دیواروں کے رنگین تصاویر یا پتھروں کے اُبھرے ہوئے نقوش سے ثابت ہوتا ہے کہ ہندوستان میں موسیقی کا فن بہت ہی قدیم زمانہ میں مکمل ہوچکا تھا۔ رگ وید میں بھی جو دنیا کی قدیم ترین کتاب مانی جاتی ہے

بہت سے آلاتِ موسیقی کا ذکر ہے مثلاً ڈھولک، چنگ، کھنجری، پکھاوج، دوتارے، یکتارے، طنبورے، بانسری، پپیری، نفیری، جھانجھ اور مجیرا وغیرہ اور اس میں ان کی بیشمار قسمیں لکھی ہیں جن کو دیکھکر آدمی حیران ہوجاتا ہے، سام وید پڑھنے کے جو قواعد رکھے گئے ہیں اُن سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ اُس وقت اعلیٰ تعلیم میں فنِ موسیقی کو بھی پورا دخل تھا۔ ضمنی طور پر اس سے یہ بات بھی ظاہر ہوتی ہے کہ موسیقی ہندو طریقۂ عبادت کی جان ہے۔ اور ہزارہا سال سے اپنے اسی معیار کو قائم رکھے ہوئے ہے۔ علاوہ بریں بہت سی قدیم علمی شہادتوں سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ اگلے زمانے میں موسیقی کا عمل معاشرتی زندگی کا جزوِ اعظم تھا۔ یہ حالت صرف آریا سماج ہی کی نہ تھی بلکہ ہندوستان کی قدیم دراوڑی قوموں کی بھی یہی کیفیت تھی۔ رامائن میں راون اور سگریو کو فن موسیقی میں کامل بیان کیا گیا ہے۔ تامل لٹریچر سے اس بات کا پورا ثبوت ملتا ہے کہ تامل قوم کا فن موسیقی بالکل جداگانہ تھا۔ اس قوم میں ڈھول کو طبل جنگ کا درجہ حاصل تھا۔ اور فوج میں ڈھول بجانے والے کا درجہ بڑا مانا جاتا تھا۔ رامائن سے واضح ہوتا ہے کہ ہندوستان میں علم اور موسیقی کا فن بہت پرانا ہے۔

موسیقی کے متعلق سنسکرت کی جو قدیم ترین کتاب دستیاب ہوئی ہے وہ بھرت نیٹہ شاستر ہے۔ اس میں علم اور فن موسیقی دونوں سے بحث کرتے ہوئے انہیں "نٹ ودّیا" کی ایک شاخ قرار دیا گیا ہے۔ یہ کتاب غالباً چھٹی صدی عیسوی کی تصنیف ہے اور موسیقی کے متعلق اس میں جو باب ہے اُس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے سے بھی بہت پہلے ہندوستان میں فنِ موسیقی نے غیرمعمولی ترقی کر لی تھی۔ بین کے سُر "مدھم گرام" پر ملانے کے لئے جو طویل اور باریک ہدایات اس کتاب میں دی گئی ہیں ان سے پایا جاتا

ہے کہ بین سات تار کا باجہ ہوتا تھا اور اُس کا بجانے والا صاحب کمال سمجھا جاتا تھا۔ نٹیہ شاستر کے بموجب بین میں بائیس پردے ہوتے تھے، اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ان لوگوں کے کان بائیس مختلف آوازوں میں تمیز کرنے کی قابلیت رکھتے تھے۔ قریب قریب اُسی زمانے کی ایک تامل کتاب "سلپٹری گرام" نامی ملتی ہے۔ موسیقی کے متعلق جو دقیق سائنٹیفک تفصیلات اس کتاب میں درج ہیں اُن سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ فن ارتقا کے تمام مراتب طے کرنے کے بعد جنوبی ہندوستان میں بھی اعلیٰ پایہ کو پہونچ گیا تھا، اور اس سے ضمناً یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ دراوڑی موسیقی کو شروع سے ایک جداگانہ حیثیت حاصل تھی اور وہ سنسکرت آرٹ کی مقلد نہ تھی۔

اسی سلسلے میں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ امراؤتی اور سانچی میں سنگین تصویروں کے اندر جو صورتیں مختلف قسم کے سازہائے موسیقی کی دکھائی گئی ہیں، یا اس قسم کی جو تصویریں غارہائے اجنٹا کے مندروں کی دیواروں پر کھنچی ہوئی ہیں، وہ قدیم مصری اور آشوری سازہائے موسیقی کی تصویروں سے بہت مشابہ ہیں۔ یہ بھی قابل غور ہے کہ اس زمانے میں بھی ہندوستان کے اکثر ساز وہی ہیں جو اس قدیم زمانے میں تھے۔ طنبورہ، نفیری، نرسنگھا، پکھاوج، ڈھولک اور جھانجھ سب اس وقت بھی اپنی پرانی شکل وصورت پر رائج ہیں۔

ساتویں اور چودھویں صدی عیسوی میں بھگتی کی جو تحریک ہندوستان میں جاری ہوئی تھی اُس میں گیت اور بھجن عبادت میں شامل ہوتے تھے۔ جنوبی ہند میں شیوجی کے بھگت اور وشنوی الوار (ساتویں سے دسویں صدی) تک بنگال میں جے دیو، ودیاپتی، اوماپتی، اور چنڈیداس (بارھویں اور تیرھویں صدیوں میں)

اور شمالی ہند میں نام دیو اور راما نند، وغیرہ نے جو روح پرور بھجن گائے انہیں آج تک کروڑوں آدمی گاتے چلے آتے ہیں۔ کیونکہ یہ بھجن معرفت اور راگ راگنیوں میں ہیں۔ ایسی صورت میں وہ ہندوستانیوں کے لئے غذائے روح بن گئے ہیں۔ اس طرح ان بزرگوں کے فیض سے فن موسیقی ہندوستان کے بچہ بچہ کے حصہ میں آیا ہے۔

جنوبی ہند کے مشہور گویئے آپار صاحب کے بارے میں مشہور ہے کہ انھوں نے ویدارانم کے قدیم مندر کے سامنے ایسی جادو بھری آواز سے بھجن گائے کہ مندر کا دروازہ جو صدیوں سے بند تھا عام لوگوں کے لئے کھل گیا۔ اگر اس روایت کو لفظ بلفظ صحیح نہ سمجھا جائے تو اس سے یہ نتیجہ ضرور نکلتا ہے کہ اس شخص کے گانے میں ایسا اثر تھا کہ جب وہ ویدارانم کے مندر میں بیٹھکر، جو صدیوں سے ویران یا بند پڑا تھا، بھجن گانے لگا تو وہ مندر مرجع خاص وعام ہو گیا۔ بہرحال بھگتی مارگ کی ترقی کا یہ اثر ہوا کہ اس سے ہندوؤں میں گانے بجانے اور راگ راگنی سیکھنے کا شوق پیدا ہو گیا۔

تیرھویں صدی سے ابتک فن موسیقی پر صدہا ماہرین فن مستقل کتابیں لکھ چکے ہیں جن میں انھوں نے اپنے اپنے زمانے کے مروجہ اصول اور فن موسیقی پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ ان مصنفین میں سب سے پہلا اور مشہور شخص سارنگ دیو تھا جس کی کتاب "سنگیت رتناکر" ابتک موجود ہے۔ پنڈت موصوف تیرھویں صدی کے پہلے نصف حصہ میں گذرے ہیں۔ انھوں نے بھرت کی طرح تمام راگنیاں شرتیوں میں باندھی ہیں، مگر اس کتاب کا طرز بیان کچھ ایسا مجمل اور مبہم ہے کہ ان کی ہدایات پر عمل کرنا آسان نہیں ہے۔ بہرحال شمالی ہند اور جنوبی ہند میں دو مختلف مگر مستقل فن موسیقی تھے اور اب بھی ہیں، ایک ہندوستانی یعنی شمالی ہند کا دوسرا کرناٹکی یا دکنی۔

پنڈت بھرت نے اپنی کتاب "نیٹہ شاستر" میں ہندوستانی سرگم کو بائیس سُرتیوں میں تقسیم کیا ہے۔ چنانچہ ہندوستان بھر کی موسیقی میں یہ بائیس سرتیاں کسی نہ کسی صورت میں موجود ہیں۔ اور گندھرپ مہا ودیالیہ بمبئی میں یہ بائیس سُرتیاں باقاعدہ سکھائی جاتی ہیں، حالانکہ جنوبی ہند میں پنڈت ونکٹ ماکھی کے نظریہ کی پیروی ہوتی ہے جنھوں نے بائیس سُرتیوں کو گھٹا کر صرف بارہ تک محدود کر دیا ہے لیکن نظری طور پر تمام ماہرین ابھی تک بائیس سُرتیاں تسلیم کرتے ہیں، لیکن خفیف فرق کے ساتھ مثلاً کلیانی راگنی میں بمقابلہ مالوگول راگنی کے رکھب کا سُر ایک سُرتی اترا لگتا ہے۔ اسی طرح کھمبوجی راگنی میں بمقابلہ کلیانی راگنی کے دھیوت کا سُر ایک سُرتی چڑھا لگتا ہے۔ اتری چڑھی کی انہیں نازک باریکیوں کے باعث ہارمونیم جیسا تمام سُروں والا کوئی باجہ ایجاد نہیں ہو سکا جس پر یہ تمام سُرتیاں اپنے اپنے پورے فرق کے ساتھ ادا کی جاسکیں۔

ہندوستانی موسیقی کی بنیاد راگ پر قائم ہے، رہی یہ بات کہ راگ کب ایجاد ہوئے؟ یہ پردۂ قدامت میں مخفی ہے جہاں تحقیق و تجسس کی بھی رسائی نہیں لیکن بھرت کی "نیٹہ شاستر" سے اس قدر ضرور معلوم ہوتا ہے کہ اس میں تمام راگ راگنیاں ایک ہی سُر سے شروع ہوتی ہیں۔ اور اس زمانہ میں تمام راگ سرگم کے صرف دو گراموں یعنی "سا" اور "ما" گراموں پر قائم ہوتے تھے، لیکن بعد میں رفتہ رفتہ صرف ایک گرام پر قائم کر لیے گئے۔ بعد ازاں تمام راگوں کی تقسیم سروں اور سُرتیوں کی بنا پر کی گئی۔ بھرت نے تمام راگ راگنیوں کو مورچھنوں اور جنیوں میں تقسیم کیا ہے یہ دکنی تقسیم ہے، شمالی ہند میں ان کی تقسیم "جنک" اور "جنیا" میں ہوتی ہے۔ مورچھن اور جنک سے مطلب اصلی راگ اور "جیتوں" اور "جنیوں" سے مراد ان سے مشتق شدہ راگنیاں ہیں۔ پندرھویں صدی میں ایک مشہور ماہر فن موسیقی لوچن کوی گذرا

ہے۔ جس نے اپنی کتاب "راگ ترنگنی" میں تمام راگوں اور راگنیوں کو بارہ "تھا ٹھوں" یعنی بنیادی اصولوں میں تقسیم کیا تھا۔ اس کے بعد ۱۶۰۹ء میں پنڈت سوبنا تھ جی نے اپنی کتاب "راگ وبودھ" میں راگ راگنیوں کو "جنکوں" اور "جنیوں" میں تقسیم کیا۔ ان کے بعد پنڈت وینکٹ ماکھی نے اپنی کتاب "چاتر ونی پرکاشک" لکھی اسمیں بھی یہی تقسیم رکھی گئی۔ اور آج بھی کرناٹکی موسیقی میں راگوں کی وہی تقسیم صحیح مانی جاتی ہے۔

لیکن ہندوستانی یا شمالی ہند کے استادان فن نے دوسرا طریقہ قائم کیا اور ردو بدل کرکے راگوں اور راگنیوں کا وہ نظام باندھا جو آج کل مروج ہے۔ قرون وسطیٰ کے شمالی پنڈتوں نے بھی لوچن کوی کی طرح بارہ سے بیس "ٹھاٹھ" یعنی بنیادی راگ قائم کئے تھے۔ اور بقیہ تمام راگنیوں کو ان کے ماتحت کر دیا تھا۔ اور قریب قریب یہی طریقہ پنڈت بھٹ کھانڈے جی نے اختیار کیا ہے۔ یعنی انھوں نے صرف دس بنیادی راگ قائم کرکے باقی سب راگنیاں ان کے ماتحت کردی ہیں۔

کرناٹکی موسیقی میں بنیادی راگوں کو اصلی چیز سمجھا جاتا ہے اور ہندوستانی موسیقی میں محض راگنیوں پر زیادہ زور دیا جاتا ہے۔ کرناٹکی موسیقی میں راگ راگنیوں پر مشتمل گویا مختلف خاندان آباد ہیں۔ لیکن قرون وسطیٰ میں ایک خاندان کے افراد دوسرے میں جا ملے۔ اس لئے ماہرین فن نے پھر تمام افراد کو خاندان یا پیدایش کے لحاظ سے الگ الگ کر دیا ہے۔ ہندوستانی موسیقی میں راگ راگنیوں کو ایک مخلوط مجمع سمجھنا چاہئے جنھیں خاندان کے لحاظ سے تقسیم کرنے میں بڑی دقتیں واقع ہوئی ہیں۔ مثلاً بہاگ راگنی کو جس کا وقت شب کا تیسرا پہر ہے پنڈت بھٹ کھانڈے جی نے بلاول راگ میں رکھا ہے، کیونکہ دونوں میں ایک ہی قسم کی آتریاں چڑھیاں لگتی ہیں۔ مگر بہاگ میں مختلف طریقوں سے تیور مدھم بھی

لگتا ہے، اس لحاظ سے اسے بعض استاد ایمن کی راگنیوں میں داخل سمجھتے ہیں۔ للت راگنی کو پنڈت جی نے بھیروں میں رکھا ہے، حالانکہ بھیروں میں کہیں تیور امدھم نہیں لگتا مگر للت میں برابر لگتا ہے جس سے راگنی کو چار چاند لگ جاتے ہیں۔ واضح ہو کہ ہندوستانی یعنی شمالی موسیقی میں تیور امدھم کا استعمال بمقابلہ کرناٹکی کے بہت زیادہ ہے کرناٹکی والے ہر چیز میں مدھم لگانے کی اجازت نہیں دیتے، شمالی ہند والے بہت سی راگنیوں میں اترا اور چڑھا دونوں مدھم لگاتے ہیں جس سے چیز میں ایک دلآویزی پیدا ہو جاتی ہے۔

ان فنی باریکیوں کو چھوڑ کر اب یہ دیکھنا چاہئے کہ تقسیم اور تقسیم در تقسیم ہونے سے پیشتر راگ راگنیاں کیونکر پیدا ہوئیں۔ دراصل مذہب اور موسیقی دونوں توام ہیں۔ دنیا بھر میں کوئی مذہب ایسا نہیں جس کی عبادات و رسوم میں موسیقی کو دخل نہ ہو مسلمانوں میں جو گانا بجانا اچھا نہیں جانتے، نماز کے وقت خوش الحانی سے قرأت پڑھنا اچھا سمجھتے ہیں۔ چونکہ مذہبی رسموں اور عبادات میں خشوع و خضوع کی ضرورت ہوتی ہے اس لئے اس میں موسیقی کو داخل کیا گیا۔ جس کی بدولت دل اُچاٹ نہیں ہوتا۔ آریاؤں کی تمام عبادات، ویدمنتروں کے پڑھنے سے شروع ہوتی ہیں۔ اس لئے ان کے پاٹھ کے لئے اول اول ایک لہجہ ایجاد کیا گیا جو پانچ نطری سُروں یعنی سا۔ رے۔ گا۔ ما۔ پا۔ پر مبنی تھا۔ اس کے بعد دیگر سُر ایجاد ہوئے اور سرگم کے سات سُر قائم ہوئے۔ پہلا سُر پرتھم۔ دوسرا دوتیتہ۔ تیسرا ترتیتہ۔ چوتھا چاترتھا۔ پانچواں مندرا۔ چھٹا اتی سوریہ قائم کئے گئے تھے۔ بعد کو پرتھم سے کسی قدر زیادہ چڑھا ایک سُر اور ایجاد کر کے سرگم میں شامل کر دیا گیا۔ اور سات سُروں کا سرگم پورا ہو گیا۔ غرض سرگم کے موجودہ پردے بہت تھے

جو لوگوں کو مذہبی رسمیں ادا کرایا کرتے تھے. گانا اور رونا انسان کے فطری جذبات ہیں، لہذا سرگموں یا ٹھاٹھوں سے بیشتر گانے یا گیت ایجاد ہو چکے تھے، جو عموماً ابتدائی پانچ سُروں میں ادا کئے جاتے تھے۔ اب بھی ہندوستان میں دیہات کی عورتیں اسی قدرتی سرگم میں گاتی ہیں۔ وہ میینڈھ، مُرکی، اُترّی یا چڑھی کچھ نہیں جانتیں۔ جیسی انسان کی حالت ہوتی ہے ویسے ہی سروں اور آواز میں وہ گاتا ہے۔ جب کسی شخص نے کوئی چیز اچھی طرز میں گائی سننے والوں نے اُسے یاد کر لیا۔ اس طرح یہ چیزیں اور فنِ موسیقی ایک سے دوسرے کو منتقل ہوتا رہا۔ نہ کوئی مقررہ راگ تھا نہ راگنی۔ لیکن پنڈتوں کا معاملہ دوسرا تھا، عبادت کرنا کرانا، وید منتر پڑھنا پڑھانا اُن کا پیشہ تھا، اور چونکہ ان چیزوں کا تعلق موسیقی سے بھی تھا اس لئے انہیں ہر دلعزیزی حاصل کرنے کیلئے موسیقی کی طرف خاص طور سے منہمک ہونا پڑا۔ اگرچہ قدیم روایات میں مختلف راگوں اور راگنیوں کو مختلف دیوتاؤں سے منسوب کیا جاتا ہے لیکن فی الحقیقت ان کے موجد برہمن تھے پنڈتوں نے مختلف سُروں کے زیر و بم یا اُتار چڑہاؤ سے ترکیب دیکر مختلف راگ راگنیاں تیار کیں اور موسیقی کو فنونِ لطیفہ میں شامل کر دیا. ظاہر ہے کہ یہ ایک دن کا کام نہیں تھا بلکہ ہزاروں سال سے موسیقی کی نشو و نما کا سلسلہ جاری تھا۔

پہلے پانچ سُروں کا قدرتی سرگم بنا، پھر اس میں دو سُر اور شامل ہوئے، بعد ازاں بائیس سُرتیاں وجود میں آئیں، جن کے میل جول سے بھرت نے نیٹہ شاستر میں چودہ مورچن اور جیتاں بنائیں۔ پنڈت سرنگدیو نے سانگیت رتناکر میں راگ اور راگنیوں کو اتنا بڑھایا کہ اُن کی تعداد دو سو چونسٹھ لکھی، اور ہر راگ اور راگنی کے الگ الگ نام لکھکر اُن کی تقسیم بھی مختلف جماعتوں میں کی۔ یہ سلسلہ تحقیق و تدقیق، تقسیم و

ادغام پنڈت پنڈریک وٹھل، پنڈت سومنا تھ جی، پنڈت ونکٹ ماکھی، اور پنڈت آہوبالا نے جاری رکھا اور شمالی و جنوبی فنون موسیقی کے اصول قائم کئے۔

عام طور پر اکثر کے نزدیک چھ راگ ہیں، لیکن جو میگھ راگ کو ایک فصلی چیز خیال کرتے ہیں وہ بنیادی راگوں کی تعداد صرف پانچ مانتے ہیں۔ دن رات کے چوبیس گھنٹے چھ راگوں میں تقسیم کئے گئے، ہر راگ کی حکومت چار چار گھنٹے ہوتی ہے۔ یہی چھ راگ چھتیس راگنیوں میں منقسم ہیں۔ پھر ان راگنیوں کے باون پُتر اور چھیانوے پُتریاں ہیں بھارجاؤں کی تعداد جنھیں راگنیوں کی نواسیاں کہنا چاہئیے سیکڑوں ہیں۔ الغرض ہندوستان کا فن موسیقی ایک بحر ناپیدا کنار ہے جس پر عبور حاصل کرنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔

چھ راگ دو قسموں میں تقسیم کئے گئے ہیں، ان میں بعض سمپورن ہیں یعنی جن میں سرگم کے ساتوں سُر لگتے ہیں اور بعض سنکیرن ہیں جن میں سات سے کم سُر لگتے ہیں۔ مالکوس راگ سنکیرن ہے جس میں صرف پانچ سُر لگتے ہیں پھر جو راگنی جس راگ کے ماتحت ہے وہ اُسی راگ کے زیر اثر گائی جا سکتی ہے، خلاف وقت گانا غلط ہے ہر راگنی کی تان میں صرف انہیں راگنیوں کے سُروں سے کام لیا جا سکتا ہے جو ایک راگ کے ماتحت ہیں غیر راگنی کا سُر لگانا غلط ہے۔

آج کل ہندوستان میں موسیقی کے اکھاڑے (یا اسکول) دو ہیں۔ شمالی ہند کے اسکول کے بانی میاں تان سین ہیں جو اکبر اعظم کے نورتن میں شامل تھے۔ انھوں نے شاگردوں کی بہت بڑی جماعت اپنے گرد جمع کر لی تھی، اور انہیں شاگردوں کی اولاد میں نسلاً بعد نسل یہ فن سینہ بسینہ چلا آتا ہے۔ جنوبی ہند میں موسیقی اسکول کے بانی پنڈت تیاگ راج تھے جن کا تعلق تنجور کے مرہٹہ دربار سے تھا۔ یہ سنسکرت کے زبردست فاضل اور شاعر تھے۔

گانے میں تو اپنا جواب نہیں رکھتے تھے ۔

مُرّوجہ سات سُروں کے نام سُر یا کھرج رکھب، گندھار، مدھم، پنچم، دھیوت، نکھاد ہیں۔ ان ناموں کے پہلے حروف لیکر سا۔ رآ۔ گا۔ ما۔ پا۔ دھا۔ نا۔ سرگم بنایا گیا، جو موسیقی کی ابجد ہے۔

کہنے کو تو ہندی موسیقی کے ہندوستانی اور کرناٹکی یا دکنی دو اسکول ہیں، لیکن درحقیقت دونوں کا اصول ایک ہی ہے۔ اور اب جبکہ ریل موٹر اور ہوائی جہازوں نے سفر کی مشکلات دُور کرکے زمین کی طنابیں کھینچ دی ہیں اور شمال و جنوب کے میل جول میں آسانیاں پیدا ہو گئی ہیں وہ دن دُور نہیں کہ شمالی اور جنوبی دونوں مذاہب ایک ہو جائیں گے۔

قدیم زمانہ میں موسیقی کا مرکز یا تو مندر تھا یا پنڈت کا گھر، لیکن رفتہ رفتہ مندروں کی موسیقی میں ترقی ہوتی گئی کیونکہ ہر پنڈت کو یہ فکر تھی کہ اپنے مندر کی شہرت کو چار چاند لگائے چونکہ مرد کے مقابلہ میں عورت کے حُسن اور آواز میں زیادہ دلکشی ہوتی ہے' اس لئے مندروں میں رفتہ رفتہ دیوداسیوں کا سلسلہ جاری ہو گیا، جو جنوبی ہند میں ابتک موجود ہے۔ دوسرا ذریعہ کتھائیں ہوئیں، جو خوش عقیدہ لوگ وقتاً فوقتاً پنڈتوں کو بلا کر اپنے گھروں پر کرایا کرتے ہیں۔ تیسرا ذریعہ اشاعت راس لیلا تھا جو شمالی ہند میں سفر کرکے جگہ جگہ کرشن لیلا کرتے اور گاتے بجاتے ہیں، چوتھا ذریعہ رام لیلا ہوا' دسہرہ میں ہزاروں لاکھوں آدمی گا بجا کر رام چندر جی و سیتا جی کی یاد تازہ کرتے ہیں۔ پانچواں ذریعہ بھجن منڈلیاں ہوئیں جو جگہ جگہ جا کر بھجن گاتی ہیں۔ چھٹا ذریعہ بھگت فقیر ہوئے جو اکتارہ اور کھڑتال ہاتھ میں لئے جگہ جگہ گاتے پھرتے ہیں۔ ساتواں ذریعہ ہولی کا تہوار ہوا جبکہ بچہ بچہ ہولی گاتا ہے۔

ہر گاؤں اور قصبہ میں سوانگ ہوتے ہیں۔ آٹھواں ذریعہ نوٹنکیاں ہوئیں جنھیں خوبصورت اور خوش گلو لڑکے ساز پر ناچتے اور گاتے ہیں۔

192

علاوہ ازیں ہندوستان میں والیان ریاست کے دربار بھی علم و فن موسیقی کے زبردست مراکز رہے ہیں۔ چنانچہ سلاطین مغلیہ کے دربار ہمیشہ اُستادانِ فن موسیقی کے مرکز رہے، اور انھوں نے شمالی ہند کے بڑے بڑے اہل کمال کی سرپرستی کی تھی۔ حضرت امیر خسرو کے نام نامی سے ہندوستان کا کون شخص واقف نہیں ہے۔ آپ بلبن اور علاؤالدین کے زمانہ میں گذرے ہیں، دیگر علوم و فنون کے علاوہ آپ کو علم و فن موسیقی میں بھی ید طولیٰ حاصل تھا ہندوستان کا مشہور ساز ستار آپ ہی کی ایجاد ہے، آپ ہی نے گانے میں قوالی کی طرز ایجاد کی تھی۔ اسی زمانہ میں جنوبی ہند کی ریاست وجیانگر میں گوپال نائک ایک مشہور ماہر موسیقی تھا۔ پندرھویں صدی میں ترہت کے فرمانروا راجہ شیو سنگھ کے دربار میں ودیاپتی ایک شاعر اور موسیقی میں استاد گذرا ہے۔ اور شمالی ہند کا مایۂ ناز استاد میاں تان سین اکبر اعظم کے دربار میں گزرا ہے۔ محمد شاہ کے دربار میں محمد وزیر خاں اور محمد علی خاں دو مشہور اور کامل اُستاد گذرے ہیں جن کی ہمیشہ آپس میں نوک جھونک رہتی تھی۔ شاہجہاں نے مشہور گوئیے جگناتھ کو کویراج کا خطاب عطا فرمایا تھا۔ ایک مرتبہ شاہجہاں نے جگناتھ سے خوش ہو کر اُسے اور ایک دوسرے گوئیے کو چاندی میں تول دیا تھا۔ جنوبی ہند کا مشہور و مایۂ ناز ماہر فن موسیقی پنڈت تیاگ راج مرہٹہ ریاست تنجور کے دربار میں گذرا ہے۔ اسی طرح میسور اور ٹراونکور کے درباروں میں بھی بہت سے بڑے بڑے گویّے ہوئے ہیں۔ اور اب بھی ہندوستان بہت سے تان سینوں اور تیاگ راجاؤں سے خالی نہیں ہے۔

یہ قول صحیح ہے کہ گانے والے کا ساز اُس کا گلا ہوتا ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ جس طرح کوئی سنار سونا اور چاندی سے آلات کے بغیر دلپسند اور نظر فریب زیورات نہیں بنا سکتا ہے، اسی طرح کوئی گویا بغیر ساز کے اپنے ہنر کا پورا کمال نہیں دکھا سکتا۔

ہندوستان میں سازہائے موسیقی کی تعداد اور قسمیں بے شمار ہیں اور ان میں سے بہت سے ایسے ہیں جو قدیم زمانہ کی یادگار ہیں۔ ان میں جو سب سے زیادہ عام چیز ہے وہ بین ہے۔ موجودہ مردنگ کی وضع کے ڈھول بھی ہیں۔ نفیریاں، شہنائیاں، نرسنگھے، بانسریاں، الغوزے، اور ڈمرو، وغیرہ سب کی تصویریں موجود ہیں تیسری یا پانچویں صدی کے تامل لٹریچر میں ایک ایسے ساز کا حال بیان کیا گیا ہے جس میں ایک ہزار تار استعمال ہوتے تھے۔ "بین" واقعی ہندوستان کا بہت پُرانا ساز ہے۔ اور اب بھی تین چار سو برس سے ویسا ہی چلا آتا ہے۔

ہندوستان کے قدیم ترین سازہائے موسیقی دو قسم کے تھے (۱) ہاتھ سے بجنے والے، یا (۲) منھ سے بجنے والے، جیسے ڈھولک یا بانسری یا نرسنگھا۔ ہندوستان کے قدیم ترین لٹریچر میں ڈھول کا ذکر بار بار آتا ہے، اور تامل قوموں میں تو ڈھول کا اس قدر احترام کیا جاتا تھا کہ اسے صلح ہو یا جنگ حفاظت ربانی کی نشانی سمجھتے تھے۔ جنگ کے زمانے میں ایک ہاتھی کی پشت پر ڈھول رکھا جاتا تھا اور وہ فوج کے آگے آگے چلتا تھا شیو پران میں ہے کہ جب شیوجی اپنا تکو۔ نی رقص ناچتے ہیں تو برہماجی ڈھول بجاتے ہیں قدیم سنگتراشی کے قدیم نمونوں اور نقش و نگار میں بھی ڈھول کی تصویریں پائی جاتی ہیں۔ بات یہ ہے کہ اس قسم کے ساز بنانے اور بجانے دونوں میں آسان ہوتے ہیں۔

نرسنگھے کا مورث اعلیٰ یقیناً سنکھ یا سینگ ہے، قدیم زمانہ کی جنگوں میں سنکھ اور

سینگ دونوں کام آتے تھے۔ چنانچہ مہابھارت کا آغاز سنکھوں کے پھونکنے سے ہوتا ہے رفتہ رفتہ جنگوں میں سنکھ کی جگہ سینگ نے اور بعدازاں سینگ کی جگہ دھات کے نرسنگھوں نے لے لی۔ اب سنکھ پوجا کے وقت صرف مندروں یا گنھاؤں میں سنائی دیتا ہے۔ قدیم زمانہ کے آشوریوں اور یہودیوں میں نرسنگھے استعمال ہوتے تھے۔ چنانچہ قدیم آشوری حجریات میں نرسنگھے کی تصویریں پائی جاتی ہیں۔ اور یہودیوں نے تو اپنے اسرافیل فرشتہ کے منھ میں بھی صور یعنی نرسنگھا دے رکھا ہے۔

بانسری کا تعلق سری کرشن جی کی ذات اقدس سے ہے' یہ ایک نہایت ہی سادہ لیکن سب سے سُریلا اور دلفریب ہندوستانی باجہ ہے۔ یہ ایسا آسان باجہ ہے کہ پتلے بانس کی پوری گوالوں کے چھوٹے چھوٹے بچے بھی تیار کر سکتے ہیں۔ اس پر بھی یہ اس قدر مکمل ساز ہے کہ ایک ماہر فن اس کے ذریعہ ہر قسم کی راگ راگنی بخوبی ادا کر سکتا ہے۔ جو گھور اور گمک اس ساز میں ہے وہ دوسرے میں نہیں۔

ہندوستان کا قدیم ترین ساز بین انگشت شہادت کی نوک سے بذریعہ مضراب یا ناخن بجایا جاتا ہے لیکن اس ساز کا پیشرو فقیروں کا اکتارہ معلوم ہوتا ہے۔ اکتارہ جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے صرف ایک تار کا ساز ہوتا ہے جس سے سُر ملا کر آج کل بھی ہندو فقیر اور سادھو بھجن گاتے ہیں۔ طنبورہ بھی اسی اکتارہ کی دوسری صورت ہے۔ تون تنی اور گوپی چند بھی اکتارے ہیں مگر ان کی صورتیں بدلی ہوئی ہیں۔ کنگرہ کی باجہ کی صورت جو بین کی ماں ہے اس کے بارے میں پنڈت ستیا مورتی نے اس طرح اظہار خیال کیا ہے:۔

"اس کی طبلی یا ڈانڈ آبنوس یا بانس کی بنی ہوئی گول ہوتی ہے جس میں لکڑی یا دھات کی بارہ کھونٹیاں نصب ہوتی ہیں۔ ڈانڈ کے نیچے تین

تونبیاں لگی ہوتی ہیں جن میں بیچ والی تونبی بڑی ہوتی ہے۔ تار جو گھوڑی
پر سے گذرتے ہیں ان میں سے صرف دو تین مضراب سے بجائے جاتے
ہیں، بقیہ تار گھور گرج کے لئے بازو کا کام دیتے ہیں۔"

یہ باجہ ریاست میسور اور اضلاع برار کے دیہات میں اب بھی بجایا جاتا ہے، اسی سے بین نکلی ہے۔ یہ سادہ ساز ہزار ہا سال سے نشو و نما اور ترقی پاتے پاتے کچھ سے کچھ ہو گئے اور اب ہندوستان میں جتنے مختلف اور ترقی یافتہ خوشنما ساز نظر آتے ہیں وہ سب انہیں سے نکلے ہیں۔ لیکن اس واقعہ سے انکار نہیں ہو سکتا کہ تاردار سازوں پر مسلمانوں کے زمانہ میں بھی اثر پڑا، اور شمالی ہند میں مختلف قسم کے جو تار دار ساز نظر آتے ہیں وہ مغلوں کے لائے ہوئے ہیں۔ مثلاً ستار امیر خسرو کی ایجاد ہے، اگرچہ چونکہ وہ ہندوستان میں ایجاد ہوا ہے اسلئے اسے ہندوستانی ہی سمجھنا چاہئے، اور یہی بات "سرسنگار" پر عائد ہوتی ہے۔ البتہ رباب، سرود، طاؤس وغیرہ غیر ملکی ساز ہیں جو مسلمانوں کے عہد میں آئے۔ تان سین کی نسبت مشہور ہے کہ وہ رباب بجایا کرتے تھے۔ سارنگی یا تنبورنگی کی ایجاد زیادہ پرانی نہیں، لیکن یہ ایجاد اس قدر مکمل ہے کہ اس کے سوائے دنیا کا کوئی ساز گلے کا ساتھ نہیں دے سکتا۔ طبلہ جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے (طبلہ از طبل عربی) مسلمانوں کے زمانے کی ایجاد ہے، لیکن یہ ہندوستان کی پکھاوج اور ڈھولک کی ترقی یافتہ شکل ہے۔

ہندوستان کے گیتوں پر بھی غور کرنے سے اس امر کا پتہ چلتا ہے کہ ہندوستانی موسیقی نے کس طرح بتدریج ترقی کی۔ ہندوستانی گیتوں کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے (۱) فنی اور (۲) طربی۔

فنی قسم کے گانے وہ ہیں جو استادانِ فن اپنا کمال دکھانے یا اپنے شاگردوں کو

صحیح اور شدھ راگنیاں سکھانے کے کام میں لاتے ہیں۔ ان میں عموماً مہمل یا بے معنی بول ہوتے ہیں جنھیں راگ راگنی کے سانچہ میں ڈھال یا جاتا ہے۔ مثلاً (۱) دیم تارا، دیم تارہ، دیم تارا۔ (۲) توم تنانانا دیریا۔ وغیرہ۔ اگر مہمل الفاظ سے کام نہیں لیتے تو ایسے الفاظ استعمال کرتے ہیں جن میں کسی دیوتا یا بزرگ کی ستایش ہو۔ اٹھارھویں صدی کے اوائل میں پنڈت پورن دھر ویٹھل نے اس قسم کے بہت سے گانے کنڑی زبان میں وضع کئے تھے جو اب جنوبی ہند میں گائے جاتے ہیں۔ بہت سے گانے ایسے ہوتے ہیں جن میں راگ راگنی کی خصوصیات بیان کی جاتی ہیں۔ انہیں اصطلاح موسیقی میں "لکشن راگ" کہتے ہیں۔ اسی قسم کے نازک اور ٹیڑھے گانوں کو "سر جتی اور پلوی" کہتے ہیں۔ ان سے بھی زیادہ مشکل اور ٹیڑھے گانے "ورن" کہلاتے ہیں جن میں سُر تال سم اور تان کا خاص خیال رکھا جاتا ہے۔

طربی قسم میں وہ مختلف دلفریب ودلآویز گانے داخل ہیں جو نہ صرف موسیقی میں کمال دکھانے بلکہ سامعین کو خوش کرنے کے کام میں بھی آتے ہیں۔ جنوبی ہند میں اس قسم کے گانوں کو کرتی اور کیرتن، اور شمال ہند میں دھرپد اور خیال کہتے ہیں۔ (یہاں خیال سے مطلب لاؤنی نہیں ہے) ان گانوں کے تمام بول پیارے اور راگ راگنی میں گھلے ہوتے ہیں، جنوبی ہند میں اس قسم کے گانوں کے نام پدم، جوالی، ترووپوگل، اور پلوی وغیرہ اور شمالی ہند میں ٹھمری، پٹہ، ہوری، غزل، ابھنگ وغیرہ ہیں۔ اگر ہندوستان کے دیہاتی گانوں کو دیکھا جائے تو ان کا شمار انسان کے حیطۂ تخمین سے باہر ہے۔ مذہب مشرق کا اوڑھنا بچھونا ہے۔ اس لئے ہندوستان کے عشقیہ گانوں میں بھی عموماً رام اور سیتا یا رادھا اور کرشن کے مقدس ناموں نے داخل ہوکر انکو ایک

حد تک مذہبی رنگ دیدیا ہے۔

کچھ زمانہ گذرا ہندوستان کے مائیہ ناز ملک الشعراء ڈاکٹر رابندرناتھ ٹیگور نے مسٹر ایچ. اے. پوپلے سے فرمایا تھا کہ: "ہندوستان کے دیگر علوم و فنون اور شائستگی کی طرح ہندوستانی موسیقی پر بھی حالت جمود طاری ہے۔ اور اس کے زندہ ہونے کی کوئی علامت نظر نہیں آتی"۔ لیکن اس زمانہ سے ابتک نہ معلوم گنگا جمنا میں کتنا پانی بہہ چکا ہے۔ ہندوستان آزاد ہو چکا ہے اور قومی تحریکات نے اس میں از سر نو جان ڈال دی ہے۔ "جرنل آف میوزک اکیڈیمی مدراس" کے پہلے شمارہ میں جو جنوری ۱۹۳۰ء میں شائع ہوا تھا اس میں لکھا گیا تھا کہ:-

"موجودہ زمانہ میں ہندوستانی موسیقی سے زبردست دلچسپی پیدا ہو رہی ہے اور ہر شخص کی خواہش ہے کہ قدیم ماہرین فن اور پرانے استادوں کے ارشادات و ملفوظات سے مستفید ہو۔ جس طرف دیکھو ملک بھر میں موسیقی کانفرنسیں منعقد ہو رہی ہیں جن میں نہ صرف فن کا کمال دکھایا جاتا ہے بلکہ موسیقی کے اصول اور نازک مسائل پر بھی معقول بحث کیجاتی ہے"۔

ہندوستان میں موسیقی کے متعلق سب سے پہلا رسالہ ۱۹۱۱ء میں "انڈین میوزک جرنل" کے نام سے میسور میں جاری ہوا۔ جس کے اڈیٹر مشہور ماہر موسیقی اور مغنی مسٹر کرشن راؤ تھے۔ ۱۹۱۶ء سے ہندوستان میں موسیقی کانفرنسوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ جن میں ملک بھر کے استادانِ فن اور ماہرین جمع ہو کر اپنے اپنے کمالات دکھاتے تھے۔

بیسویں صدی کی ابتداء سے ایک اہم ترقی یہ ہوئی کہ ہندوستان بھر میں جگہ جگہ میوزک اسکول قائم ہو گئے۔ سب سے پہلے موسیقی کے مشہور و معروف دلدادہ اور پرجوش

خدمتگذار پنڈت وشنو دگمبر نے لاہور میں "گندھرو مہاودیالیہ" کے نام سے ایک میوزک کالج کھولا۔ بعدازاں اسی نام کا ایک کالج ۱۹۰۸ء میں بمبئی میں کھولا گیا۔ ان کالجوں میں طلبا کی جماعت بندی کرکے ان کو باقاعدہ علم وفن موسیقی کی تعلیم دیجانے لگی۔ اس کے بعد کلکتہ میں "سانگیت سنگھ" اور "سانگیت سمیلن" اسی غرض سے قائم ہوئے۔ پنڈت وشنو نرائن بھٹکھنڈے ساکن بمبئی نے لاہور، گوالیار اور شمالی ہند کے دیگر مقامات میں موسیقی اسکول جاری کئے تھے۔ ماریس کالج آف میوزک لکھنؤ کا وجود بھی انہیں پنڈت جی کی مساعی جمیلہ اور امداد واعانت کا رہین منت تھا۔ پنڈت بھٹکھنڈے جی ایک ریٹائرڈ وکیل تھے، مگر ان کی تمام عمر موسیقی کے شوق میں بسر ہوئی۔ آپ نے ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر موسیقی پر سنسکرت کی قدیم کتابیں نکالیں اور شائع کیں انہیں جنوبی ہند کے پنڈت وینکٹ مکھی جی کی "چاتردھنی پرکشکا" بھی ہے۔ علاوہ ازیں پنڈت جی نے شمالی ہند کے راگ راگنیوں کو جدید طریقہ پر مرتب کیا، اور جماعت بندی کے ساتھ طلبا کو موسیقی سکھانے کا طریقہ ایجاد کیا۔

۱۹۱۸ء میں ابتداً عیسائیوں کے لئے بنگیین کرسچین ایسوسی ایشن کے لیڈروں نے مدراس میں ایک چھوٹے سے موسیقی اسکول کی بنیاد ڈالی۔ ۱۹۲۷ء کے ہفتہ کانگریس میں آل انڈیا موسیقی کانفرنس کا بھی اجلاس ہوا، نتیجہ یہ ہوا کہ شائقین نے کوشش کرکے ۱۹۲۸ء میں میوزک اکیڈیمی مدراس کی بنیاد ڈالی۔ ۱۹۲۹ء میں بمقام چدمبرم انا ملائی یونیورسٹی کے سلسلہ میں انا ملائی کالج آف میوزک کھولا گیا

مسٹر ایس۔ سیتہ مورتی کی تحریک پر ۱۹۲۸ء میں مدراس یونیورسٹی نے بھی اپنے کورس میں موسیقی کی تعلیم داخل کرلی۔ اور بنگال میں آنجہانی ٹیگور کا شانتی نکیتن

بھی موسیقی کو پروان چڑھا رہا ہے۔ ان واقعات سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہمیں سال سے ملک میں اس فن کو از سر نو زندہ کرنے کی کوشش ہو رہی ہے وہ زمانہ گذر گیا جب گانے بجانے کو ایک ذلیل کام سمجھا جاتا تھا۔ فی زمانہ ہندوستان میں گھر گھر موسیقی سے دلچسپی لی جا رہی ہے۔ شمال و جنوب، مشرق و مغرب، ایک دوسرے کا اثر قبول کر رہے ہیں۔ مدراس والے ہندوستان کے سیدھے سادے گانوں کو سنکر اتنے ہی خوش ہوتے ہیں جتنے کہ اپنے پرانے پکے گانوں کو سنکر، اور یہی حال اب شمالی ہندوالوں کا ہے۔ لیکن ابھی یہ پیشگوئی نہیں کیجاسکتی کہ ہندوستانی موسیقی کی آیندہ کن لائنوں پر ترقی ہوگی، ممکن ہے کہ مختلف ممالک کے فنون موسیقی ملکر ہندوستان میں ایک معجون مرکب تیار کریں، کیونکہ اب نقل و حرکت کی آسانیوں کی بدولت ایک شہر کا آدمی دوسرے شہر میں گھنٹوں کے اندر پہونچ جاتا ہے۔
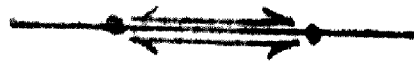
ہمارا

آزادیٔ ہند کی دوسری سالگرہ کا علمی پیشکش

ہندوستان کا مشہور مقنّن منو

(از)

مسٹر بی رام (بی، اے۔ ایل ایل، بی)

۱۵-اگست سنہ ۱۹۴۹ء

قدیم ہندوستان کے ادب میں جو درجہ منوسمرتی کا ہے وہ کسی سے مخفی نہیں۔ ہماری معاشرت کے بعض اصول جو امتدادِ زمانہ کی وجہ سے مذہبی حیثیت اختیار کر چکے ہیں، بہت حد تک منوسمرتی ہی سے ماخوذ ہیں۔ اور منوسمرتی ہی پہ ہندوؤں کے قانون ریاست اور سیاسی نظریوں کی بنیاد قائم ہے۔

مگر کسی قانونی کتاب کا مطالعہ اس وقت تک لاحاصل ہے جب تک ہم اس کے زمانہ تالیف و تصنیف کو متعین نہ کرلیں۔ ہر ایک قانون اپنے ماحول سے متاثر ہوتا ہے، جس حد تک ملک کی معاشرتی، اقتصادی اور اخلاقی ضروریات اس کی تشکیل کی ذمہ دار ہوتی ہیں۔ اس کا اندازہ ان قوانین سے کیا جاتا ہے جو پچھلے چند برسوں میں مجلس واضع قوانین ہند نے نافذ کئے تھے۔ ساردا ایکٹ، انقلابی جرائم کے تدارک کے لئے قوانین، پھر وائسرائے کے آرڈیننس، پنجاب کا قانون ساہوکارہ اور مجوزہ مندر پرویشں بل اسی قبیل سے ہیں۔ جب ہمارا آیندہ مورخ اس زمانہ کی تاریخ لکھے گا، اور ان قوانین کے حسن و قبح پر تنقید کرنا چاہے گا، تو اس کے لئے ناگزیر ہوگا کہ وہ اس زمانہ کی تمدنی و سیاسی، معاشری و اخلاقی تحریکوں کا غائر مطالعہ کرے۔ یورپ میں نپولین کا مجموعہ قوانین بہت اہم چیز ہے، مگر اس کی صحیح اہمیت اُسی وقت سمجھ میں آسکتی ہے جب ہم انقلاب فرانس کے حالات و کوائف سے پورے طور پر

واقف ہوں۔ کیونکہ یہ مجموعہ قوانین اس انقلاب کا نتیجہ ہے۔ بعینہ یہی صورت منوسمرتی کی ہے۔ جب تک ہم اس کے زمانۂ تصنیف کو متعین نہ کر لیں، اس وقت کی سیاسی صورتِ حالات کا جائزہ نہ لے لیں ہم اس پر جرح و تنقید نہیں کر سکتے۔

میکس مولر اسے چوتھی صدی عیسوی سے بعد کا بتاتا ہے۔ مگر اس نے یہ رائے منوسمرتی کے کسی اشلوک کی بنیاد پر قائم نہیں کی، بلکہ ورددھ منو کے ایک اشلوک پر۔ بوہلر (Buhler) نے اس کی تردید کی ہے۔ پروفیسر میکڈونل اپنی سنسکرت لٹریچر کی تاریخ (صفحہ ۴۲۸) میں لکھتا ہے، کہ سمرتی کی موجودہ شکل ۲۰۰ء سے بعد کی نہیں ہے۔ ڈاکٹر جالی لکھتا ہے، کہ منوسمرتی، یاگولکیہ سے پہلے کی ہے، اور یاگولکیہ کسی حال میں پہلی صدی عیسوی سے قبل کا نہیں۔ بوہلر نے منوسمرتی پر بہت وقت صرف کیا اور پوری تحقیق و تفتیش کے بعد اس نتیجہ پر پہونچا کہ موجودہ منوسمرتی دوسری صدی میں موجود تھی، اور اس کا زمانۂ تصنیف دوسری صدی قبل مسیح اور دوسری صدی عیسوی کے آغاز یا اس سے قبل کا درمیانی زمانہ ہے۔ پچھلے چند برسوں میں ہندوستان قدیم کی تاریخ کے متعلق ہماری واقفیت میں غیر معمولی اضافہ ہوا ہے۔ اس رسالہ کی مدد سے ہم اس چار صدی کے طویل زمانے کو اور بھی تنگ کر کے ایک صحیح اور متعین تاریخ پر پہنچ سکتے ہیں۔

سب سے پہلے ہمیں منوسمرتی والے منو کو دوسرے "منوؤں" سے علحدہ کرنا چاہیئے، جو سنسکرت علم و ادب میں ملتے ہیں۔ کا منڈک نے بعض ایسی رائیں بحوالہ منو پیش کی ہیں جن کا منوسمرتی میں کوئی پتہ نہیں چلتا۔ اس کا ایک ہی مطلب ہو سکتا ہے کہ منوسمرتی کے علاوہ سیاسی موضوع پر ایک اور کتاب بھی ایسی تھی جو منو سے

منسوب تھی۔ اور جس سے کامنڈک نے اقتباسات کئے ہیں۔ بوہلر اس نظریہ کا مخالف تھا، مگر کوٹلیہ کے ارتھ شاستر کی دریافت کے بعد اس نظریہ کی صداقت میں بہت کم شبہ رہ جاتا ہے۔ ارتھ شاستر میں کوٹلیہ نے اپنے سے پہلے کے مصنفین کا ذکر کیا ہے اور ان کے اقتباسات دئے ہیں ان میں سے ایک منو کا اسکول ہے، جس کے حوالے سوتروں میں ہیں۔ پس ایک منو ارتھ شاستر یا منو راج شاستر یا راج دھرم کا موجود ہونا تاریخی شہادت کی بنا پر یقینی ہے کامنڈک نے بھی اس کتاب کا حوالہ دیا ہے، ارتھ شاستر کے علاوہ اس کتاب کا ذکر مہابھارت میں بھی ملتا ہے۔ مہابھارت میں اس کا مصنف منو پراچیتس بتایا گیا ہے۔ اسی منو پراچیتس کا ذکر دوسرے سیاسی مصنفین کے ساتھ کوٹلیہ نے بھی کیا ہے، فرق صرف اتنا ہے کہ مہابھارت میں جہاں کہیں ان پرانے مصنفوں کا نام آتا ہے انہیں دیوتا بنایا جاتا ہے۔ مگر ارتھ شاستر میں وہ گوشت پوست کے کھاتے پیتے انسان بیان کئے گئے ہیں۔ درحقیقت یہ ان مصنفوں کی قدامت کی پختہ دلیل ہے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ارتھ شاستر بلحاظ اپنی معقولیت کے بہت زیادہ قابل اعتماد ہے۔ بہرحال اس سے یہ ثابت ہو گیا کہ ایک ارتھ شاستر یا راج شاستر ایسا تھا جس کے مصنف کا نام منو تھا، جس کے باپ کا نام پراچیتس تھا (یاد رہے کہ منو سمرتی والے منو کے والد کا نام سوئم بھو ہے) پنچ تنتر میں بھی اس کتاب کا ذکر ہے۔ وہ علم سیاست کے عالموں کا نام گناتا ہے۔ منو۔ وچسپتی شکر۔ پراشیر۔ پراشر کا بیٹا اور چانکیہ (کوٹلیہ) منو کی اس سیاسی کتاب کی موجودگی ایک اور طرح سے بھی ثابت ہے۔ سوم دیو کی کتاب نیتی واکیہ امرت میں جو چودھویں صدی کی تصنیف ہے، اس کا حوالہ موجود ہے جس میں کہا گیا ہے کہ سنیاسیوں اور سادھوؤں کو

چاہیئے کہ راجہ کو محصول دیں۔ یہ منو سمرتی کے بالکل مخالف ہے اسی طرح کوٹلیہ، مہابھارت اور سوم دیو نے جہاں بھی اس منو کا حوالہ دیا ہے، سوتر میں ہے۔ اور منو سمرتی یقیناً سوتروں میں نہیں ہے، اس لئے ایک اور کتاب راجیہ شاستر کا سوتروں میں موجود ہونا یقینی ہے۔ جس کا منو سمرتی سے نہ کوئی تعلق ہے اور نہ اس کا منو سمرتی میں کوئی ذکر ہے۔

اس کے علاوہ ایک اور منواچار یہ ہیں، جن کا منو گریہہ سوتر آج بھی ملتا ہے۔ یہ کتاب روس میں چھپ گئی ہے، اور مغربی ہندوستان میں متداول ہے۔ اس کا مفسر اشٹا بکر دیو لکھتا ہے کہ گریہہ سوتر کا اصلی نام بردھ دھرم ہے۔ جن لوگوں کا یہ خیال ہے کہ منو سمرتی اسی گریہہ سوتر پر مبنی ہے وہ بھی غلطی پر ہیں دونوں میں بالکل مخالف اور متضاد باتیں ملتی ہیں، مثلاً بیاہ کے متعلق قوانین۔ اس کے برعکس وہ باتیں جن میں دونوں متفق ہیں۔ تقریباً مفقود ہیں، صرف سات اشلوک ایسے ہیں جو دونوں میں یکساں پائے جاتے ہیں۔ اتنی معمولی سی شہادت پر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ منو سمرتی، گریہہ سوتر سے ماخوذ ہے۔ کیونکہ عین ممکن ہے کہ ناموں کے مغالطہ کی وجہ سے منو سمرتی سے ہی لیکر یہ ساتوں اشلوک گریہہ سوتر میں درج کردئے گئے ہوں۔ یہ بحث خالی از طوالت نہیں، ورنہ یہ ثابت ہو سکتا ہے کہ دونوں میں کوئی تعلق نہیں۔

منو کے والد کا نام سوئم بھو دیا ہوا ہے سوئم بھو کے معنی ہیں آفرینندہ، وتسائین کے کام سوتر میں ایک دلچسپ کہانی ہے کہ پرجاپتی یعنی ایشور نے دنیا کی رہنمائی کے لئے لاکھ ابواب کی ایک کتاب لکھی، جو تمام شعبہ جات زندگی پر حاوی ہے۔ اسی میں سے منو نے دھرم کا حصہ الگ کر کے اپنی سمرتی کو ترتیب دیا۔ یہی افسانہ مہابھارت میں بھی درج ہے۔ اس سے اتنا ضرور ثابت ہوتا ہے کہ وتسائین کے زمانہ میں

منو سمرتی کی حیثیت مسلمہ ہو گئی تھی، یہاں تک کے اس کے قوانین کو نہایت قدیم مانا جانے لگا تھا۔ وتسائین کا ذکر پنچ تنتر میں ہے، پنچ تنتر سن ۳۰۰ء کے قریب لکھی گئی تھی۔ اس سے ثابت ہوا کہ وتسائین اس سے پہلے کا ہے، مگر کام سوتر میں خاندان ساتواہن کے ایک راجہ کا ذکر ہے جو پہلی صدی میں حکمران رہا۔ پس وتسائین کا زمانہ دوسری صدی کے اختتام سے پہلے کا ہے۔

اشوگھوش نے اپنی کتاب وجر سوچی میں منو کا ذکر کیا ہے، جہاں وہ ذات پات کے طریق پر جرح کرتا ہے۔ اشوگھوش کا زمانہ مسلمہ طور پر سن ۱۰۰ء کے قریب قریب ہے۔ اب سن ۱۰۰ء میں منو کا مستند حیثیت اختیار کر لینا اس امر کی بین دلیل ہے کہ اس کی تصنیف کو کم از کم ایک صدی کا عرصہ گزر گیا تھا۔ گویا اس حساب سے منو سمرتی پہلی صدی قبل مسیح کے اختتام یا پہلی صدی عیسوی کے آغاز میں لکھی گئی۔

مگر اس کا زمانہ پارتھین سے پہلے کا نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ ادھیائے دس میں جہاں یہ لکھا ہے کہ ہندو رسم و رواج اور برہمنوں کے علٰحدہ رہنے کی وجہ سے بعض قومیں ہندوؤں سے خارج ہو گئی ہیں وہاں پارتھین لوگوں کا اس طرح ذکر ہے۔

"رفتہ رفتہ عدم تعمیل فرائض سے اور براہمن کو نہ ملنے سے مندرجہ ذیل کشتری دنیا میں شودر ہو گئے۔ (۱۰-۴۳)

پونڈرک۔ ڈرووڈا۔ کامبوج۔ یون۔ شک۔ پاروا۔ پہلوتن (پارتھین) کرات درد۔ کھش۔ ان دیسوں کے رہنے والے کشتری لوگ جینو وغیرہ سنسکار اور وید خوانی نہ کرنے سے شودر ہو گئے۔ (۱۰-۴۴)

برہمن۔ کشتری۔ ویش اور شودر ان چاروں ورنوں کے کاموں کو

چھوڑ دینے سے سب فرقے خواہ ان کے نام سنسکرت کے ہوں، خواہ
دوسری زبان کے وہ ورن آشرم سے علٰحدہ "دسیو" کہلاتے ہیں (۱۰-۴۵)

پارتھین حکومت ۲۴۸ قبل مسیح میں آرسک نے قائم کی۔ متھرا وتس اول کے
زمانہ میں (۱۷۱-۱۳۸ ق م) ان کی مشرقی یا جنوبی حد دریائے سندھ تک جا پہونچی۔
پارتھین لوگ اپنے آپ کو پارتھوہ کہتے تھے جس کا ایرانی نام پہلوا ہے۔ پہلوا کا نام
ہندوستانی کتبوں میں عام طور پر پایا جاتا ہے۔ غرضیکہ یہ پارتھو منو کے خیال میں یون
اور شک لوگوں کی طرح شودر ہیں۔ پاتنجلی جس نے اپنا مہا بھاشیہ پشیہ متر (۱۸۸-۱۵۰
ق م) کے ابتدائی زمانۂ حکومت میں لکھا۔ وہ بھی ان قوموں کو منو کی طرح شودر ہی
گنتا ہے۔ مگر اس کے ہاں صرف یون اور شک قوموں کا ذکر ہے۔ پارتھو کا نام نہیں
ملتا۔ پاتنجلی نے مہا بھاشیہ سنگا خاندان کے قائم ہونے کے قریب ہی لکھا ہے جو ۱۸۸ء
ق م ہے۔ پارتھو اس کے قریب بیس برس بعد ہندوستان کی سرحد پر ظاہر ہوئے۔
اس سے ہم یہ نتیجہ نکالنے میں حق بجانب ہیں، کہ منوسمرتی ۱۷۰ء ق م کے بعد کے
زمانے میں لکھی گئی۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ برہمنوں کو پھر سے عروج حاصل ہو رہا تھا۔ سنگا
اور ان کے بعد کے حکمران کنو خاندان دونوں برہمن تھے۔ پانی لکھتا ہے کہ سنگا
خاندان بھاردواج سے تھے۔ یعنی کرشن یجروید کے مقلد۔

اس باب میں منوسمرتی کی اندرونی شہادت بھی اس کے زمانۂ تصنیف کی طرف
اشارہ کرتی ہے۔ کتاب میں جو تعریف آریہ ورت کی کی گئی ہے قابل توجہ ہے۔ آریہ
ورت کی سب سے پرانی تعریف وہ ہے جو "نردان" نامی کتاب میں پائی جاتی ہے۔
"مغربی حد دریائے سندھ ہے، مشرق میں سوریہ اودے (شمال اور

جنوب ایسے کہ) جہاں سیاہ بارہ سنگھے رہتے ہیں"۔

علم الحیوانات سے یہ ثابت ہے کہ بارہ سنگھے کے رہنے کی جگہ کوہستان ہمالیہ اور بندھیاچل کا درمیانی خطہ ہے۔ اس کے بعد بودھائنا مغربی سرحد دریائے سرسوتی کو (ریاست پٹیالہ میں) اور شرقی کالک بن (موت کا جنگل) کو بتاتا ہے شمالی جنوبی سرحدیں وہی ہمالیہ اور بندھیا ہیں۔ وشنیٹ اور پانجلی مغربی سرحدیں اور بھی سکڑ جاتے ہیں۔ پاتنجلی یہ بھی لکھتا ہے کہ یون (یونانی) اور شک آریہ ورت کی حدود سے بدر کر دیے گئے ہیں۔ اور یہ حدود پاتنجلی کی وہی ہیں، جو سنگا خاندان کے بانی پشیہ متر کے عہد میں تھیں، اور بودھائنا اس زمانہ کا ذکر کر رہا ہے۔ جب موریا خاندان کے آخری زمانہ میں پنجاب اس خاندان کے ہاتھ سے نکل گیا تھا چنانچہ منوسمرتی میں لکھا ہے:۔

"سمندر سے سمندر تک مشرق اور مغرب میں اور پہاڑ سے پہاڑ تک،
شمال اور جنوب میں وہ دونوں کے نزدیک آریہ ورت ہے"۔ (۲-۲۲)
"کالا ہرن جس دیش میں رہے، وہ دیش یگیہ کرنے کے لائق ہے۔ اس
کے آگے ملیچھوں کا دیش ہے"۔ (۲-۲۳)

پشیہ متر کی سلطنت میں بنگال شامل تھا، اس لئے منو کی مشرقی سرحد خلیج بنگال درست ہے۔ کالک بن بنگال میں کوئی جنگل ہوگا۔ مگر منو اپنی مغربی سرحد میں غیر یقینی ہے۔ اس کا بحیرۂ عرب کو مغربی حد قرار دیتا ہے اور بتاتا ہے کہ اسے پنجاب کے متعلق یقین نہیں تھا۔ وہ سرسوتی سے پار نہیں جاتا۔ وہ برہم ورت اور برہم رشی دیش کی تعریف کرتا ہے:۔

"دیوتاؤں کی ندی سرسوتی اور درشتودتی کے درمیان کا ملک برھم

۔ ورت ہے۔" (۲-۱۷)

"برہم ورت کے متصل کورو کشیتر، متسیہ، پانچال اور سورسین کا علاقہ برہم رشی دیش ہے۔" (۲-۱۹)

سورسین متھرا کے ارد گرد کے علاقہ کو کہتے تھے۔ پارتھیوں کے دریائے سندھ پر ظاہر ہونے کے تھوڑے عرصہ بعد متھرا ۱۲۰ ق م میں ان لوگوں کے قبضہ میں چلا گیا۔ مگر اس سے پہلے ہمیں کتبوں سے پتہ چلتا ہے کہ متھرا پشیہ متر کے ماتحت تھا۔ اگر سمرتی ۱۲۰ کے قریب کی لکھی ہوئی۔ تو متھرا برہم رشی دیش میں کبھی نہ لکھا جاتا۔ آریہ ورت اور برہم ورت وغیرہ کی تمام حدود گویا ملک کی سیاسی حالات کی آئینہ دار ہیں۔ جہاں تک ہندوؤں کی سلطنت ہوتی تھی، وہ آریہ ورت، اس کے پار ملیچھ دیش۔ اگر منو سمرتی ۱۲۰ ق م سے قبل لکھی گئی، اور ۱۷۰ قبل مسیح کے بعد۔ جیسا کہ ہم اوپر ثابت کر آئے ہیں۔ تو غالباً اس کا زمانہ ۱۵۰ قبل مسیح کے قریب ہے۔

سمرتی میں بعض اشلوک اور بھی ہیں، جو پشیہ متر کے عہد کی طرف اشارہ کرتے ہیں:

"سیناپتی یعنی سپہ سالار کا کام اور فوجداری کا انتظام اور تمام ملکوں کی حکومت کا طریقہ وید شاستر کے جاننے والا ٹھیک طور پر قائم کر سکتا ہے۔" (۱۲-۱۰۰)

اس اشلوک میں وید شاستر کے جاننے والے برہمنوں کو فوج کا سپہ سالار اور راجہ بنانے کی تجویز پیش کی گئی ہے۔ آج تک یہ کام کشتریوں کے سپرد تھے، جن کے لئے وید شاستر کی تعلیم ضروری نہیں تھی۔ خود پرانے شاستروں کے مطابق برہمنوں کے لئے ہتھیار کو ہاتھ تک لگانا منع تھا۔

"کوئی برہمن اپنے ہاتھ میں ہتھیار نہ لیگا، خواہ اس کی خواہش اسے
صرف دیکھنے کی ہی کیوں نہ ہو۔"

یہی گوتم کا بھی خیال ہے، جیسا کہ بودھاینا نے لکھا ہے۔ کیا یہ حیرت انگیز نہیں، کہ تمام پرانی روایتوں کے خلاف، شاستروں کے خلاف، منو برہمنوں کو نہ صرف ہتھیار باندھنے بلکہ سپہ سالاری اور راج گدی تک کی سفارش کر رہا ہے۔ اس کا ایک ہی مطلب ہو سکتا ہے۔ یعنی یہ کہ سیاسی حالات نے ان دونوں باتوں کی اجازت دے دی ہے۔ اور منو وہی لکھ رہا ہے جو ہو چکا ہے، مگر اس سے اگلا اشلوک تمام شکوک رفع کر دیتا ہے۔

"جس طرح بھڑکی ہوئی آگ سرسبز درختوں کو بھسم کر دیتی ہے، اسی طرح
وید کا جاننے والا اپنے کرم سے پیدا شدہ دوش کو جلا دیتا ہے۔" (۱۲ - ۱۰)

یعنی وہ دوش جو وید کے جاننے والے کے کرم سے پیدا ہوا ہو، اور اس کا کرم کیا ہے، جو اوپر بتایا جا چکا ہے سپہ سالاری اور راج گدی۔ تاریخ کے طالب علم سے یہ مخفی نہیں کہ سنگا خاندان کا بانی پشیہ متر برہمن تھا۔ پشیہ متر موریا خاندان کا سپہ سالار تھا۔ مگر اس خاندان کا آخری راجہ برہدارتھ سخت ناکارہ اور عیش پسند شخص تھا۔ اسے اپنی رنگ رلیوں سے کام تھا۔ سلطنت اور رعایا کی چنداں فکر نہ تھی، وہی ہوا جو ایسی حالت میں ہر جگہ ہوتا ہے۔ رعایا اور امرائنے برہدارتھ سے نجات پانے کی سازش کی۔ پشیہ متر سپہ سالار اس سازش کا سرغنہ تھا۔ فوج پہلے ہی سے اس کی مٹھی میں تھی، امراء کے ساتھ مل جانے سے اسکی طاقت بہت بڑھ گئی آخر ایک دن جب برہدارتھ فوج کا معائنہ کر رہا تھا پشیہ متر نے ساری فوج اور امرا کی آنکھوں کے سامنے اُسے قتل کر دیا

اور خود تخت پر بیٹھ گیا' یہ منو کے مطابق بھی وہ دوش ہے جسے وید جاننے والے کو اپنے
کرموں سے سپہ سالاری کی حالت میں کرنا چاہئے' اس کے سارے دوش خود بخود
اس کے علم سے جل جاتے ہیں۔

راجہ بننے کی حالت میں بھی پشیہ متر نے کمی نہیں کی' اشوک اعظم موریا خود بدھ
مت کا پیرو تھا' اور اس کے بعد بھی اُس کے جانشین اس مذہب کے سرپرست رہے۔
برہمنی مذہب کے مقابلہ میں بدھوں نے بہت عروج حاصل کر لیا تھا۔ تارانا تھ نیپالی
مورخ لکھتا ہے کہ پشیہ متر کے حکم سے بے شمار بدھ بھکشوں کا قتل ہوا تھا۔ یہی وہ دوش
ہے جو وید کے جاننے والے کو اپنے کرموں سے راجہ ہونے کی حالت میں کرنا چاہئے
اور منو کے خیال کے مطابق ان کا اثر خود بخود زائل ہو جاتا ہے۔ کیونکہ مجرم وید کا
جاننے والا ہے۔ چنانچہ منو نے اس کا ذکر سمرتی میں کیا ہے:۔

"جس طرح سب یگوں کا راجہ اشومیدھ یگیہ سب پاپوں کو دُور کرتا ہے۔
اسی طرح اگھ مرکھن سوکت سب پاپوں کو دور کرتا ہے۔"

"تینوں جہانوں کے لوگوں کو قتل کرنیوالا برہمن رگ وید کو دھارن کرے'
تو کسی پاپ کو نہیں پاتا۔"

"اگر وہ رگ۔ یجر۔ سام سنگھناؤں کو تین بار پڑھ لے تو سب پاپوں سے
چھوٹ جاتا ہے۔"

اس سے ہم یہ نتیجہ نکالتے ہیں' کہ یہ سارے واقعات ہو چکے تھے۔ کیونکہ
علاج سے پہلے بیماری کا ہونا ضروری ہے۔

ہم اوپر لکھ چکے ہیں کہ برہمن کے لئے ہتھیار باندھنا منع تھا' مگر یہ بھی شاستروں

میں لکھا ہے کہ جب جان کا خطرہ ہو، برہمن بھی بیشک اپنی حفاظت کے لئے ہتھیار اٹھا سکتا ہے۔ لیکن منو اس سے ایک قدم آگے جاتا ہے:۔

"دِوج (برہمن۔ کشتری۔ ویش) دھرم میں مداخلت کی حالت میں اور دوجوں میں زمانہ کی وجہ سے انقلاب آجانے کی حالت میں ہتھیار باندھیں۔"

"آتما کو مصیبت سے بچانے، یگیہ کے واسطے سامان جمع کرنے اور عورتوں اور برہمنوں کی مصیبت مٹانے کے واسطے کسی کو مارنا پاپ نہیں ہوتا۔" (۸: ۳۴۸-۳۴۹)

ناظرین نے دیکھا ہوگا کہ پہلے اشلوک میں صرف دوجوں کا ذکر ہے، انہیں کے اندر انقلاب کا بیان ہے جو زمانہ کے ہاتھوں پیدا ہوا۔ یہ حالت موریا زمانہ کی ہے، موریا شودر تھے، ان کے عہد میں یگیہ ہون حکماً بند کر دئے گئے تھے۔

سب سے پہلی دفعہ منو ایک عجیب وغریب قانون درج کرتا ہے:۔

"جس جگہ شودر کا راج ہے اور جس میں ادھرمی پاکھنڈی چانڈال آدمی فساد کرتے ہوں، سناتک کو اس جگہ نہ رہنا چاہئے۔" (۴: ۶۱)

اور پھر:۔

"جس راج میں شودر دھرم کے معاملات کا فیصلہ کرتا ہے، اس راجہ کا راج اس کی آنکھوں کے سامنے تباہ ہو جاتا ہے جس طرح دلدل میں پھنسکر گائے مر جاتی ہے۔" (۸: ۲۱)

یہ حالات قریبی زمانے میں ہوئے ہوں گے کہ ان کی طرف اشارہ کیا جا رہا ہے، اور واقعی موریا خاندان کے آخری زمانے میں جب غیر ملکی حملہ آوروں نے ناک میں دم کر رکھا تھا،

راج تباہ ہوتا جارہا تھا' اور" اس پھنسی ہوئی گائے" کو پشیہ متر برہمن نے اپنے زور بازو سے نجات دلائی اور دھرم کو از سر نو قائم کیا۔ یہی وجوہ ہیں جنھوں نے برہمنوں کا دماغ آسمان پر چڑھا دیا۔

"محض ذات کا برہمن بھی جو برہمن کا کام نہ کرسکتا ہو اور مورکھ ہو' وہ بھی راجہ کو دھرم کا اپدیش دے سکتا ہے اور شودر کیسا ہی کیوں نہ ہو اپدیش نہیں کرسکتا۔" (۸ : ۲۰)

"اگر برہمن کوئی دفینہ پائے تو وہ اس پر قبضہ کرے' کیونکہ وہ سب کا مالک ہے۔ (۸ : ۳۷)

یہ اور اسی طرح کے دوسرے اشلوک جن میں برہمنوں کو غیر معمولی حقوق دئے گئے ہیں' اسی وقت ٹھیک طور پر سمجھے جاسکتے ہیں جب منوسمرتی کے زمانۂ تصنیف کی سیاسی فضا کا مطالعہ کیا جائے۔

منوسمرتی شروع سے آخر تک جارحانہ قدامت پرستی سے مملو ہے۔ مثلاً بودھوں اور جینیوں کو دارالحکومت سے نکال دو' اور ان سے چوروں کا سا سلوک کرو (۹ : ۲۲۵-۲۲۶) بھکشو اور بھکشونیوں کو اس طرح جل مت دو جس طرح دھرم سے پتت اور خودکشی کرنے والے کو نہیں دیا جاتا (۵ : ۸۹-۹۰) کسی بودھ کی کوئی برہمن کسی حالت میں بھی عزت نہ کرے۔ (۴ : ۳۰) وہ تمام سمرتیاں اور قابل نفرت درشن وغیرہ جو ویدوں پر مبنی نہیں ہیں مرنے کے بعد بے سود ہیں۔ کیونکہ ان کا منبع جہالت ہے۔ ایسے ہی تمام وہ اصول و عقائد جو کسی اور جگہ سے نکلے ہیں' زمانۂ قریب کے ہونے کی وجہ سے بیکار اور جھوٹے ہیں۔ (۱۲ : ۹۵-۹۶)

عورتوں کو بدھ مت ہی نے پہلی بار سنیاسی بننے کی اجازت دی۔ اس سے پہلے ویدک دھرم کے مطابق وہ اپنے خاوند کے ساتھ بان پرستھ آشرم اختیار کر سکتی تھی مگر سنیاسی نہیں بن سکتی تھی۔ اس کے علاوہ بدھ نے اس بات کی بھی کھلی اجازت دیدی کہ ہر شخص خواہ وہ کسی ورن کا ہو سنیاسی بن سکتا ہے۔ اور سنیاسی بننے سے پہلے بان پرستھی زندگی کی پُر مشقت، عبادت گذارانہ اور پر از ریاضت زندگی لازمی نہیں۔ اور اس کے ساتھ عمر کی قید بھی اُڑادی۔ برہمنوں میں ایک خاص عمر تک سنیاسی بننا ناممکن تھا پھر مرد و عورت دونوں کے لئے سنیاسی آشرم کے دروازے کھول دئے گئے۔ ان وجوہات سے برہمنوں نے بدھ اور بدھ مت کو کبھی عزت کی نگاہ سے نہیں دیکھا۔ کیونکہ ان کے خیال میں یہ باتیں ہندو سوسائٹی میں تشتت و انتشار پیدا کرنیوالی تھیں۔

بدھ نے شادی بیاہ اور گرہست آشرم سے بھی اپنی نفرت کا اظہار کیا تھا۔ بطور ردِ عمل کے ہم دیکھتے ہیں کہ اس کے بعد کے تمام ہندو مصنفوں نے شادی پر خاص زور دیا ہے۔ منّو تو اس معاملہ میں سب سے آگے بڑھ گیا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ جس کے گھر میں اولاد نہ ہو گی اُس کی نجات ہی ناممکن ہے۔ اسی طرح منو سمرتی میں موریا خاندان کے قانون ارتھ شاستر پر جا بجا مخالفانہ لے دے کی گئی ہے، اور اسکی دفعات رد کر کے اُن کی جگہ نئی تھیوریاں پیش کی گئی ہیں۔

غرض منو سمرتی اُس وقت کی سیاسی۔ معاشری۔ مذہبی اور عمرانی تحریکوں کا نقشہ ہے، محض مجموعۂ قوانین ہی نہیں بلکہ اس کا مقصد مناظرانہ ہے اور اسمیں بدھ مت پر برہمنی مذہب کی فوقیت ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اور شودرونکی حکومت کے مقابلہ میں برہمنی حکومت کی خوبیاں بیان کی گئی ہیں۔ اشوک نے اپنے کتبوں میں

"دھرم کی فتح" پر زور دیا تھا "تلوار کی فتح" اس کے خیال میں ٹھیک نہیں تھی۔ اشوک سارے ہندوستان کا بلا شرکت غیرے فرمانروا تھا، وہ ایسی باتیں لکھ سکتا تھا، مگر جب یونانی سکیت پانچال اور متھرا کو فتح کر چکے ہیں، خود پاٹلی پتر خطرے میں ہو تو "دھرم کی فتح" (بدھ مت) کا گیت گانا اور "تلوار کی فتح" سے پہلو تہی کرنا حماقت کی انتہا اور خودکشی کے مترادف تھا۔ یہی وجہ تھی کہ لوگ موریا خاندان کے ان بودھ حکمرانوں سے تنگ آ کر نفرت کرنے لگے تھے۔ ایسی حالت میں پشیہ متر (برہمن) کا بروئے کار آنا اور ملک کو فاتحوں سے نجات دلانا لوگوں کی نظر میں بدھ مت کے ناکارہ اور عملی حیثیت سے ناکامیاب ثابت ہونے میں کوئی شک نہ رہا۔ چنانچہ وہی خیالات جو لوگوں کے دماغوں میں چکر لگا رہے تھے، وہی نفرت و مخالفت کے جذبات جو بدھ مت کے متعلق عوام کے دلوں میں جاگزیں ہو گئے تھے منو نے حوالۂ قلم کر دئے۔ اس میں منو کا کوئی قصور نہیں۔ ردِ عمل کی بدولت اس وقت عام قومی جذبات شودروں اور بودھوں وغیرہ کے خلاف مشتعل ہو گئے تھے۔ چونکہ موریا شودر اور بدھ مت کے پیرو تھے برہمنوں کے مبالغہ آمیز دعوے تسلیم کر لئے گئے، کیونکہ کم از کم اس وقت برہمن حقیقت میں "سب کا مالک" تھا۔ منوسمرتی کی غیر معمولی اہمیت کا راز بھی اسی میں پنہاں ہے پاتنجلی کے مہا بھاشیہ میں ہم کہیں منو کی اتنی عزت نہیں پاتے۔ مگر ایک صدی نہیں گذرتی کہ منوسمرتی دھرم شاستر کا درجہ حاصل کر لیتی ہے، کوئی عجب نہیں کہ سنگا خاندان نے منوسمرتی کو اپنا سرکاری مجموعۂ قوانین قرار دیدیا ہو۔ جیسا اس سے پیشتر ارتھ شاستر موریا خاندان کا سرکاری قانون تھا، کیونکہ اکثر ہوا ہے کہ راجوں، وزیروں، اور دیگر عمائد نے کتابیں لکھیں اور وہ مستند اور مسلّمہ تسلیم کر لی گئیں، اور حکومت وقت نے بھی انہیں مستند قبول کر لیا۔ اسیطرح بالکل ممکن ہے کہ منوسمرتی بھی سنگا خاندان کا مسلمہ مجموعۂ قوانین ہو۔

معاشی ترقی کا واحد طریقہ

حتی الامکان کفایت شعاری کیجئے اور بچائی ہوئی رقوم کو قومی وثائق پس اندازی حکومت حیدرآباد میں لگائیے جنکی خریدنے کی تفصیلات حسب ذیل ہیں۔

(۱) وثائق پس اندازی ٹپہ خانہ جات حکومت حیدرآباد سے خریدے جاسکتے ہیں۔

(۲) ہر شخص پندرہ ہزار روپے تک کی کوئی رقم جمع کرسکتا ہے۔

(دو اشخاص ملکر تیس ہزار روپیے تک جمع کرسکتے ہیں۔)

(۳) پانچ۔ دس۔ پچاس۔ سو۔ پانچسو۔ ہزار اور پانچہزار روپیے کی مالیت کے وثائق ملسکتے ہیں تھوڑی رقم بچانے والے چار چار آنے۔ آٹھ آٹھ آنے۔ اور ایک ایک روپیے کے سیونگ اسٹامپ خرید سکتے ہیں۔

(۴) ہر دس روپیے بارہ سال کے بعد پندرہ روپیے بن جائینگے گویا ۴½ فیصد سالانہ نفع ہوگا۔

(۵) اٹھارہ ماہ کے بعد ہر وثیقہ بھنایا جاسکتا ہے۔ (پانچ روپیے والے وثائق کی صورت میں بارہ ماہ کے بعد۔)

(۶) حکومت حیدرآباد نے پانچ اور سات سال کی مدت کے وثائق بھی ان ہی قیمتوں کے جاری کئے ہیں۔ ان کا منافع علی الترتیب ۳۔فیصد اور ۳½ فیصد ہے۔ اس کی خاص خوبی یہ ہے کہ یہ وثائق ہر وقت بھنائے جاسکتے ہیں۔

(۷) حکومت حیدرآباد اصل رقم اور نفع دونوں کی ادائیگی کی ضامن ہے۔

(۸) اس طرح حاصل کئے ہوئے منافع پر انکم ٹیکس ادا نہیں کرنا پڑے گا۔

مہ ہند

آزادیٔ ہند کی دوسری سالگرہ کا علمی پیشکش

ہندوستان میں سائنس

(از)

پروفیسر نصیر احمد صاحب عثمانی (ام، اے۔ بی، ایس سی)

ریڈر شعبۂ طبیعیات جامعۂ عثمانیہ

۱۵۔ اگست سنہ ۱۹۴۹ء

آج کل سائنس کا زمانہ ہے۔ ہر جگہ ہر کام میں سائنس کا قدم بڑھتا چلا جا رہا ہے۔ جو ملک اس میدان میں پیچھے رہ جائے اس کا مستقبل تاریک ہے۔ بعض ملک ایسے ہیں جن کے پیچھے کوئی ماضی نہیں ہے۔ اس کے برخلاف آج کی دنیا میں ایسے بھی ملک ہیں جن کا ماضی روشن رہا ہے گو انھوں نے نیا جنم لیا ہے۔ ایسے ہی ملکوں میں ہندوستان کا شمار ہے۔ ہندوستان کا ماضی شاندار رہا ہے اور مستقبل بھی شاندار ہو سکتا ہے بشرطیکہ صحیح راستہ اختیار کیا جائے۔ ایک صورت اس کی یہ ہے کہ سائنس کے میدان میں ہندوستان اپنے جوہر دکھائے۔

ہندوستان کے اندر جوہر موجود ہے۔ اس کو اجاگر کرنے کی ضرورت ہے۔ اب موقع ملا ہے اس لئے ہندوستان والوں سے بھی توقع ہے کہ اس موقع کو ہاتھ سے جانے نہ دیں گے۔

یہاں ہندوستان کے سارے کارناموں سے ہم کو بحث نہیں ہے۔ صرف سائنس کے میدان میں ہندوستان نے جو جو کام کئے ہیں اُن کا ایک سرسری خاکہ پیش کرنا یہاں ہمارا مقصد ہے۔ اور ہم یہاں پوری تاریخ بھی سائنس کی بیان نہیں کرنا چاہتے۔ لہٰذا مختصر طور پر پراچین ہندوستان کے کچھ کارنامے بیان کریں گے تاکہ آج کل ہندوستان جو کچھ کر رہا ہے اس سے مقابلہ کیا جا سکے۔

پراچین ہندوستان میں سائنس

آجکل جب ہم سائنس کا لفظ استعمال کرتے ہیں تو اس سے ہماری مراد فلسفہ اور ادب کے سوا تقریباً تمام علوم سے ہوتی ہے لیکن پرانے زمانے میں تمام قسم کے علوم گویا فلسفہ ہی میں شمار ہوتے تھے۔ اس لیے اس زمانے کے حالات میں ہم سائنس اور فلسفہ کو ملا جلا پاتے ہیں۔ اس لئے ہم یہاں سائنس کی مختلف شاخوں کی تفصیلات نہ بیان کرینگے بلکہ بہ حیثیت مجموعی پرانی سائنس پر ایک تبصرہ کرینگے۔

ایشیاٹک سوسائٹی بنگال کے سال نامہ برائے ۱۹۳۵ء میں ال۔ ال۔ فرمور نے پراچین ہندوستان میں سائنس کی ترقیوں کے متعلق یوں اظہار خیال کیا ہے:۔

"اسکندر اعظم کی فتوحات نے جب مشرق اور مغرب کو ملایا تو اس کا ایک اثر یہ ہوا کہ ہندوؤں نے علوم ریاضی کی طرف زیادہ توجہ کی۔ چنانچہ اس سلسلے میں ہم کو بھاسکرا کا نام ملتا ہے جس نے الجبرا میں اضافہ کیا۔ اس نام کو خاص طور پر میں نے اس لئے لیا ہے کہ آجکل یہی نام ہم کو حیدرآباد دکن کی رصدگاہ نظامیہ کے ناظم (مسٹر ٹی بی بھاسکرن) کے روپ میں ملتا ہے۔ بایہمہ یونانی اثر کے بعد سے ہی ہندو سائنس کی ابتدا ر چاہیے۔ کیونکہ ہماری سوسائٹی کے سامنے ڈاکٹر ایس ایل ہورا نے ایک مقالہ پڑھا تھا جس میں انھوں نے دکھلایا ہے کہ سسرتا سمہیتا (قریب ۳۰۰ ق م) کی ایک عبارت سے پتہ چلتا ہے کہ پراچین ہندوؤں کو مچھلیوں کے مسکنوں اور اُن کی حرکت کے طریقوں کا صحیح علم تھا۔ حرکت کے طریقوں سے متعلق امریکہ اور انگلستان کے حیوانیات کے

ماہر نے چند برس ادھر وہی پھر دریافت کیا جو اس زمانے میں دریافت ہو چکا تھا۔ سر پرفلا چندر رے کی کتاب "تاریخ ہندو کیمیا" سے پتہ چلتا ہے کہ طب اور کیمیا میں ہندوؤں کا درجہ بہت بڑھا ہوا تھا۔ قدیم سنسکرت اور پالی ماخذوں کے مطالعہ اور تحقیق سے ممکن ہے کہ سائنس کی بعض اور شاخوں کا پتہ چلے جن کا علم ہندوؤں کو تھا۔ بی این سیل نے " قدیم ہندوؤں کے اثباتی علوم " کے نام سے ایک کتاب لندن سے ۱۹۱۳ء میں شائع کی جس میں انھوں نے ایسے دعوے کئے ہیں جن کو سب لوگ قبول نہیں کرتے ......"

سنسکرت لٹریچر کی تاریخ ' مطبوعہ ۱۹۱۳ء میں اے اے میک ڈانل نے لکھا ہے کہ
" سائنس پر ہندوؤں کا سب سے بڑا احسان یہ ہے کہ انھوں نے ہندسے ایجاد کئے جو آج ساری دنیا میں استعمال ہوتے ہیں۔ ان ہی ہندسوں پر عشری نظام کی بنیاد ہے اور اس نظام نے نہ صرف ریاضی کی ترقی بلکہ عام تمدن کی ترقی میں جو حصہ لیا ہے اس پر جتنا زور دیا جائے کم ہے۔ آٹھویں اور نویں صدی (عیسوی) میں ہندوؤں سے حساب اور الجبرا عربوں نے سیکھا۔ اور ان سے مغرب کی قوموں نے لیا ....."

ایشیاٹک سوسائٹی بنگال کے صد سالہ ریویو (۱۷۸۴ء سے ۱۸۸۳ء) میں بی این بوس نے لکھا ہے کہ
" ہندوؤں کی ترقی اور تمدن کی تاریخ بارھویں صدی (عیسوی) کے خاتمہ پر ختم ہو جاتی ہے۔ اس صدی کے ختم ہونے سے پہلے ہر وہ کام

جس میں جدت حتی کیا جا چکا تھا۔"

"ہندوستان کی ثقافتی وراثت" میں ان آر دھار نے بارھویں صدی کے بعد ہندوستان میں ذہنی تنزل کا ایک سبب یہ بتلایا ہے کہ بدھ مت کو زوال ہوا۔ کیونکہ بدھوں کی مٹھوں کے ساتھ مدرسے اور شفا خانے ملحق رہتے تھے جن میں سائنس بالخصوص طب کو خاص ترقی دی گئی۔ پھر چونکہ برہمنیت دوبارہ زندہ ہوئی تو یہ نئے برہمن بدھوں کی مخالفت میں بہت سرگرم تھے۔ اس لئے بدھوں سے تعلق رکھنے والی ہر چیز سے منھ پھیر لیتے تھے۔ دوسرے اسباب بھی کام کر رہے تھے۔ ان سب کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستان سے گویا دماغ نکل گیا۔ پھر ہندو دماغ کی صلاحیتوں سے ہم انیسویں صدی میں دوچار ہوتے ہیں۔

۱۸ویں اور ۱۹ویں صدی میں سائنس

ہندوستان میں آجکل سائنس کی طرف جو رغبت ہے اس کو سائنس کا دوبارہ جنم سمجھنا چاہیے۔ اس کی ابتدا اٹھارویں صدی سے ہوئی اس کے دو بڑے سبب ہوئے۔ ایک تو سوسائیٹیوں کا قیام دوسرے حکومت ہند اور صوبائی حکومتوں کے سائنس داں عہدہ دار اور پیمائش کے محکمے۔ یہاں ہم تھوڑا تھوڑا حال ان دونوں کا لکھتے ہیں۔

سوسائیٹیاں:۔ رائل ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال

سنہ ۱۷۸۴ء میں سر ولیم جونس نے "ایشیاٹک سوسائٹی" کے نام سے ایک سوسائٹی قائم کی۔ اس کا نام بعد میں ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال ہوا۔ اور سنہ ۱۹۳۶ء میں اس کو "رایل ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال" کا نام دیا گیا۔

اس کے اغراض و مقاصد سے متعلق اس کے بانی کے الفاظ یہ تھے۔

"اگر یہ سوال کیا جائے کہ ان وسیع حدود کے اندر ہماری تحقیق سے مقصود کیا ہیں تو ہم جواب دینگے کہ انسان اور فطرت۔"

اپنی زندگی کے پہلے سو برسوں میں سوسائٹی نے اپنے وجود کا ثبوت اسطرح دیا کہ ایک وسیع عمارت تیار کی۔ ایک کتب خانہ قائم کیا۔ پرانے سکے، تمغے، تصویریں اور مجسمے جمع کئے۔ اثریات، ارضیات اور حیوانیات کے عجائب خانے قائم کئے۔ اس کے علاوہ مختلف علوم و فنون پر ۴۵۳ جلدیں شائع کیں۔

سائنسی موضوعات سے متعلق جو طویل فہرستیں سوسائٹی نے شائع کیں اور خود سوسائٹی کا جرنل (رسالہ) اس بات کی کافی شہادت ہیں کہ ہندوستان میں اس معزز ادارے کی بدولت سائنس کو دوبارہ جنم لینے میں کتنی مدد ملی۔

سائنس کی ہر شاخ میں سوسائٹی نے جو سرگرمیاں دکھلائی ہیں وہ اس قابل ہیں کہ ان کا تفصیلی تذکرہ کیا جائے۔ لیکن جگہ کی تنگی کے باعث ہم اسی پر اکتفا کرتے ہیں۔

۲۔ انڈین سائنس کانگریس ایسوسی ایشن ہندوستان میں سائنسی سوسائٹیوں کی کمی اور سائنس میں کام کرنے والوں کی انفرادیت نے مدراس کے پروفیسر جے ایل سائمنسن اور لکھنؤ کے پروفیسر پی ایس میکموہن کو ۱۹۱۱ء میں تحریک دلائی کہ "برطانوی انجمن ترقی سائنس" کے نمونے پر ایک ادارہ قائم کیا جائے۔ اس سلسلے میں دونوں نے ایک اپیل کی جس کا جواب امید افزا ملا۔ اور معلوم ہوا کہ ایسے ادارے کے قیام کے تقریباً سب لوگ آرزومند ہیں۔ چنانچہ ۱۹۱۲ء میں اس زمانے کے چوٹی کے ۱۰ سائنس دانوں کی ایک کمیٹی بنائی گئی تاکہ پہلے اجلاس کا

انتظام کیا جائے۔ ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال سے خواہش کی گئی کہ وہ انتظام اپنے ہاتھ میں لے۔ چنانچہ پہلا جلسہ ۱۵/۱۷/ جنوری ۱۹۱۴ء کو سر آشوتوش مکرجی کی صدارت میں بمقام کلکتہ ایشیاٹک سوسائٹی کی عمارت میں منعقد ہوا۔ کانگریس کے اس پہلے اجلاس میں ۶ شعبے قرار دئے گئے تھے۔ یعنی کیمیا، طبیعیات، ارضیات، حیوانیات، نباتیات، نسل نگاری اور ۳۵ تحقیقی مقالے اس میں پڑھے گئے۔ کانگریس کے اجلاس ایک ہفتہ تک ہوتے ہیں اور برطانوی انجمن ترقی سائنس کی ریس میں اجلاس کے مقام شہر۔ شہر بدلتے رہتے ہیں۔

کانگریس کا پہلا دور ۱۹۱۵ء تا ۱۹۲۰ء قرار دیا جاتا ہے۔ اسمیں دوسرے سے لیکر ساتواں اجلاس تک شامل ہے۔ یہ اجلاس مدراس، لکھنو، بنگلور، لاہور، بمبئی اور ناگپور میں ہوئے۔

دوسرا دور ۱۹۲۱ء سے ۱۹۲۷ء تک تھا۔ اس میں آٹھویں سے لیکر چودھویں اجلاس تک ہوئے۔ یہ اجلاس کلکتہ، مدراس، لکھنو، بنگلور، بنارس، بمبئی اور لاہور میں ہوئے۔

تیسرا دور ۱۹۲۸ء ۔ ۱۹۳۴ء تک تھا۔ اس میں اجلاس کلکتہ، مدراس، الہ آباد، ناگپور، بنگلور، پٹنہ اور بمبئی میں ہوئے۔

چوتھا دور ۱۹۳۵ء سے ۱۹۳۸ء تک تھا۔ اس میں اجلاس کلکتہ، اندور اور حیدرآباد میں ہوئے۔

۱۹۳۸ء میں کانگریس نے اپنا جشن سیمین (سلور جوبلی) منایا۔ یہ اجلاس کلکتہ میں ۳/ جنوری سے ۹/ جنوری تک ہوتا رہا۔ اس اجلاس میں ۱۳ شعبے قرار دئے گئے جو

حسب ذیل تھے :-

ریاضی اور طبیعیات، کیمیا، ارضیات، جغرافیہ اور ارض پیمائی، نباتیات،

حیوانیات، کرمیات، انسانیات، زراعت، طبی تحقیق، بیطاری تحقیق، فعلیات

اور نفسیات -

اس کے مقابلے میں ۱۹۱۴ء میں صرف ۶ شعبے تھے - اس وقت مقالے ۳۵

پڑھے گئے تھے تو ۱۹۳۸ء میں مقالوں کی تعداد ۸۰۰ تک پہنچ گئی - اس کے علاوہ ۱۰

مشترک مباحثے مختلف شعبوں کے ہوئے اور الگ الگ شعبوں میں ۲۲ مباحثے ہوئے -

یہ اجلاس انڈین سائنس کانگریس ایسوسی ایشن اور برٹش ایسوسی ایشن فار دی

اڈوانسمنٹ آف سائنس کا مشترکہ اجلاس تھا - برطانوی مجلس کا ایک نمائندہ وفد

جس میں سر جیمس جینس اور سر آرتھر ایڈنگٹن شامل تھے، اس اجلاس میں شریک ہوا -

اس کے علاوہ دوسرے ملکوں کے سائنس دان بھی اس میں شریک رہے - برطانوی

وفد حیدر آباد دکن سے ہو کر گزرا تھا - یہاں کے لوگوں کو سر جیمس جینس اور سر آرتھر

ایڈنگٹن جیسے مشاہیر سائنس کے لکچر سننے کا موقع ملا تھا - کلکتہ میں کانگریس کا یہ

اجلاس بہت کامیاب رہا -

سائنس کانگریس کی کامیابی کا اندازہ اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ ہندوستان

کے تمام حصوں سے سائنس کے شیدائی اس کے اجلاس میں شریک ہوتے ہیں اور اس

کے اجلاسوں کی جو رودادشائع ہوتی ہے وہ اب بہت ضخیم ہونے لگی ہے -

ابھی پچھلے دنوں یعنی جنوری ۱۹۴۹ء کے پہلے ہفتہ میں اس کانگریس کا چھتیسواں

اجلاس بمقام الہ آباد منعقد ہوا - اس کے مختلف شعبوں میں جو صدارتی خطبے پڑھے گئے

ان کی روداد بھی کافی ضخیم ہو گئی ہے۔

یہ مختصر کیفیت بھی اس امر کو اچھی طرح واضح کرتی ہے کہ اس کانگریس کی بدولت ہندوستان میں سائنس دانوں کے درمیان ایک ربط قائم ہو گیا ہے اور سائنس کو بھی خوب ترقی ہوئی ہے۔

۳۔ یونائیٹیڈ پراونسز اکاڈیمی آف سائنسز ہندوستان میں سائنس کی ترقی کا اندازہ اسی سے ہو سکتا ہے کہ کل ہند بنیاد پر سوسائٹیوں کے علاوہ صوبہ واری سوسائیٹیوں کی ضرورت محسوس ہوئی۔ چنانچہ ۱۹۳۰ء میں الہ آباد میں یونائیٹیڈ پراونسز اکاڈیمی آف سائنسز کی بنیاد ڈالی گئی۔ اس سے غرض یہ تھی کہ شمالی ہندوستان میں سائنس کی تمام شاخوں میں کام کرنے والوں کے لئے ایک مرکز قائم کیا جائے۔

۱۹۳۶ء میں اس کے کام اور اس کی ضرورتوں کا لحاظ کرتے ہوئے اس کا نام بدل کر نیشنل اکاڈیمی آف سائنسز، ہند کر دیا گیا۔

۴۔ انڈین اکاڈیمی آف سائنسز یہ اکاڈیمی بنگلور میں ۱۹۳۴ء میں قائم کی گئی۔ اس میں یہ بھی لحاظ رکھا گیا کہ سائنسی مقالے پڑھے جائیں اور ان پر مباحثہ ہو۔ اس کے لئے باقاعدہ جلسوں کا انتظام کیا گیا ہے۔ اس اکاڈیمی کی جو روداد شائع ہوتی ہے اس میں تحقیقی مقالے بلا تاخیر شائع ہوتے ہیں۔ یہ مقالے ہر مہینے دو حصوں میں شائع ہوتے ہیں۔ ایک حصہ طبیعیات اور ریاضی وغیرہ کا ہوتا ہے اور دوسرے حصے میں حیاتیاتی علوم ہوتے ہیں۔

۵۔ نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف سائنسز سائنس کی ترقی کے ساتھ ساتھ یہ محسوس ہوا کہ ملک بھر میں سرکاری سائنسی محکموں، سائنسی اداروں اور سوسائٹیوں وغیرہ میں جو کام ہوتا ہے ان میں ایک ربط پیدا کرنے کی ضرورت ہے انڈین سائنس کانگریس ایسوسی ایشن کے اجلاس بمبئی ۱۹۳۴ء میں ایک خاص کمیٹی اس غرض کیلئے بنائی گئی۔ اس کمیٹی نے ایک مفصل رپورٹ پیش کی جس میں کانگریس کے اجلاس کلکتہ منعقدہ ۱۹۳۵ء میں غور کیا گیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۷ جنوری ۱۹۳۵ء کو کلکتہ میں نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف سائنسز کی بنیاد ڈالی گئی۔

اس کے اغراض و مقاصد میں یہ پروگرام رکھا گیا:۔

(ا) ہندوستان میں علم طبعی کو ترقی دینا اور قومی بہبودی کے مسائل پر اس کا اطلاق کرنا۔

(ب) سائنسی اداروں، سوسائٹیوں اور اکاڈمیوں اور سرکاری سائنسی محکموں کے درمیان ربط پیدا کرنا۔

(ج) ہندوستان کے سائنس دانوں کے حقوق کی حفاظت کرنا اور بین قومی میدان میں ہندوستان کے سائنسی کام کی نمائندگی کرنا۔

(د) پبلک اور حکومت کی طرف سے پیش کردہ قومی اور بین قومی مسائل کی تحقیق کا انتظام کرنا۔

(ھ) حسب ضرورت روداد، رسالے، وغیرہ شائع کرنا۔

(و) سائنس اور ادب میں ربط قائم کرنا اور اس کو ترقی دینا۔

(ز) سائنس کی ترقی کے لئے فنڈ اور وقف قائم کرنا۔

(ح) وہ تمام امور انجام دینا جو مذکورہ بالا اغراض و مقاصد کی تکمیل
کے لئے ضروری ہوں۔

ان اداروں کے علاوہ اور بھی ادارے سائنس کی کسی نہ کسی شاخ سے متعلق قائم کئے گئے ہیں جو اپنے اپنے موضوع پر خوب کام انجام دے رہے ہیں۔

دوسری سوسائٹیاں

جن سوسائٹیوں اور اکاڈمیوں کا اوپر ذکر کیا گیا وہ کل ہند نوعیت کی ہیں۔ ان کے علاوہ اور سوسائٹیاں قائم ہوئیں بعض کا کام ختم ہو گیا اور بعض کا جاری ہے۔ اسلئے ہم صرف چند کا یہاں ذکر کرینگے:-

مدراس میں برطانیہ عظمیٰ اور آئرلینڈ کی رائل ایشیاٹک سوسائٹی کی ذیلی سوسائٹی کی حیثیت سے مدراس لٹریری سوسائٹی ۱۸۲۳ء میں قائم کی گئی۔ اس کی طرف سے ایک رسالہ "جرنل آف لٹریچر اینڈ سائنس" کے نام سے نکالا گیا۔ ۱۸۳۴ء میں اس کا نام "مدراس جرنل آف لٹریچر اینڈ سائنس" کر دیا گیا۔ لیکن یہ رسالہ بے قاعدگی سے نکلتا رہا اور بالآخر ۱۸۹۴ء میں بند ہو گیا۔

کلکتہ میں ۱۸۲۰ء میں "ایگریکلچرل سوسائٹی آف انڈیا" قائم کی گئی۔ ۱۸۲۳ء میں اس کا نام بدل کر "ایگریکلچرل اینڈ ہارٹیکلچرل سوسائٹی آف انڈیا" ہو گیا۔ اور بعد میں اسے بھی بدل کر "رائل ایگری ہارٹیکلچرل سوسائٹی آف انڈیا" کر دیا گیا۔ سوسائٹی کی روئداد اور کارروائیاں اس کے جرنل میں شائع ہوتی ہیں۔

بمبئی میں ۱۸۸۳ء میں نیچرل ہسٹری سوسائٹی قائم کی گئی۔ ۱۸۸۶ء سے سوسائٹی نے ایک جرنل بنام جرنل آف نیچرل ہسٹری نکالنا شروع کیا۔ جس کے ابتک پچاس

سے اوپر نمبر نکل چکے ہیں۔

ان سوسائیٹیوں کے جرنلوں میں سائنسی مقالے شائع ہوئے ہیں۔ ان سے سائنس

کی اشاعت میں بڑی مدد ملی کیونکہ مقالے ہندوستان کے مختلف حصوں سے وصول ہوتے رہے۔

ایسٹ انڈیا کمپنی کی ملازمت میں سائنس داں بحیثیت سائنسداں

سائنسی محکمے وغیرہ کے نہیں تھے۔ اسلئے سائنس کا کام انجام دینے والے طبی ڈاکٹر

رائل انجنیر، سول یا فوجی عہدہ دار تھے جن کو سائنس کا شوق تھا۔ یہ کام وہ اپنے

خانگی اوقات میں کیا کرتے تھے۔

پیشۂ طبابت میں ایسے کام کرنیوالوں کے پیشرو گبریل بوٹن، ولیم ہملٹن

جان ہالول، اور ڈبلو فلرٹن تھے۔ اپنے سیاسی، طبی یا ادبی کارناموں کی بدولت

ان میں سے ہر ایک نے ہندوستان کی تاریخ میں اپنا ایک مستقل مقام پیدا کر لیا ہے۔

۱۷۶۶ء کے بعد سے ولایت سے جو ڈاکٹر آتے تھے ان کو سول اور فوجی میں

تقسیم کر دیا جاتا تھا لیکن ایک کی جگہ دوسرا مقرر کیا جا سکتا تھا۔ اس سے پہلے ۱۷۶۳ء

سے بنگال، مدراس اور بمبئی میں طبابت کے محکمے قائم ہو چکے تھے۔ یہ اصلاً فوجی محکمے

تھے۔ لیکن ضرورت کم ہو جانے پر بہت سے ڈاکٹر سول کی طرف منتقل کر دئے گئے

چنانچہ انھوں نے ہسپتال، دواخانے، جیل اور پاگل خانے اپنی نگرانی میں لئے۔

طب کی تعلیم بھی ان ہی کے سپرد کی گئی۔ اور اس "سائنسی فوج" سے کیمیائی ممتحن

نباتیاتی، حیوانیاتی، اور سمندری پیمائش نیز محکمہ افیون اور ٹکسال کیلئے لوگ لئے گئے۔

ہندوستان میں طبی تحقیق کی تنظیم کی ابتداء ۱۸۶۶ء سے ہوتی ہے جبکہ ڈاکٹر

لیوس اور ڈاکٹر کننگھم حکومت ہند کے کمشنر حفظان صحت کے خصوصی مددگار مقرر کئے گئے۔

چنانچہ ہیضہ، ملیریا، بیری بیری، کالا آزار وغیرہ پر تحقیقات کا آغاز ہوا۔

۱۹۰۰ء میں محکمہ جرثومیات ہند کا قیام عمل میں آیا اور اس کے ساتھ تجربہ خانے کی سہولتیں مہیا کی گئیں۔ لیکن محکمہ کا کام ۱۹۰۶ء سے پہلے آغاز نہ ہو سکا تھا۔ بہرحال اس محکمہ نے طبی تحقیق کی بنیاد باقاعدہ ڈال دی۔

۱۸۰۰ء میں مثلثیاتی پیمائش جزیرہ نما ہند کا قیام عمل میں آیا۔ ۱۸۱۸ء میں اس کو مثلثیاتی پیمائش ہند قرار دیا گیا۔ آراضی اور مالگزاری پیمائشوں کو ۱۸۱۷ء میں سرویئر جنرل کے تحت کیا گیا۔ اور ۱۸۷۸ء میں مثلثیاتی پیمائش کو ملا کر محکمہ سروے آف انڈیا کہلایا۔

۱۸۵۱ء میں ارضیاتی پیمائش ہند کا محکمہ قائم کیا گیا۔ گو پیمائش کے سلسلے میں ماہر ارضیات ۱۸۱۸ء سے کام کر رہے تھے۔

۱۷۸۸ء میں باغ نباتات کلکتہ کی بنیاد پڑی۔ اب اس کو شاہی باغ نباتات کہتے ہیں۔ اس کی بدولت ہندوستان میں نباتیات کا مطالعہ کیا جا سکا۔ چنانچہ ۱۸۸۹ء میں نباتیاتی پیمائش ہند کا محکمہ قائم کیا گیا۔

۱۸۴۱ء میں ایشیاٹک سوسائٹی کے عجائب خانہ کا ناظم ایڈورڈ بلتھ کو مقرر کیا گیا۔ ہندوستان میں حیوانیات میں تحقیق کی ابتدا اسی وقت سے ہوئی۔ ۱۸۶۵ء میں جان اینڈرسن بلتھ کے جانشین ہوئے۔ اور جب ۱۸۶۶ء میں عجائب خانہ ہند قائم ہوا تو اینڈرسن اس کے پہلے مہتمم مقرر ہوئے۔ حیوانیات اور اثریات سے متعلق جتنے عجائبات تھے سب ان کی نگرانی میں دیدئے گئے۔ حیوانیاتی تحقیق اینڈرسن کے بعد ووڈ میسن، ایلکاک، اور اینینڈیل نے سرگرمی سے جاری رکھیں ۱۹۰۷ء میں

اینڈیل نے دو جرنل عجائب خانہ ہند کے نوشتے اور نوادر کے نام سے شائع کئے۔
۱۹۱۶ء میں عجائب خانے کے شعبۂ حیوانیات کو علٰحدہ کر کے حیوانیاتی پیمائش ہند کا محکمہ قائم کیا گیا۔

ایسٹ انڈیا کمپنی کے قیام سے لیکر ۱۸۳۲ء تک، جبکہ محکمۂ بحریہ ہند کی تنظیم کی گئی، بحری کام بمبئی کے محکمۂ بحریہ کے فرائض میں شامل رہا۔ بحری پیمائش میں نہ صرف بحر ہند کو لیا گیا بلکہ بحرِ قلزم، بحر خلیج فارس اور بحر چین کو بھی شامل کر لیا گیا۔
۱۸۶۲ء تک محکمۂ بحریہ ہی بحری پیمائش کا کام انجام دیتا رہا۔ اس سال اسے برخاست کر دیا گیا۔ پھر ۱۸۷۴ء تک بحری پیمائش کا کوئی کام نہیں ہوا۔ اس سال محکمہ بحری پیمائش ہند قائم کیا گیا۔

۱۸۷۱ء میں ایشیاٹک سوسائٹی کی کونسل نے حکومت ہند کو لکھا کہ بحری پیمائش کے سلسلے میں ضروری ہے کہ بحری حیاتیاتی پیمائش کا کام شروع کیا جائے چنانچہ ۱۸۷۵ء میں ساحلی پیمائش ہند کا محکمہ قائم ہوا اور اسی سال بحری پیمائش کے محکمہ میں سرجن نیچرلسٹ کی جگہ قائم کی گئی۔

۱۸۷۰ء میں ہندوستان اور برما کیلئے انسپکٹر جنرل سمکیات کی جگہ قائم کی گئی اور ایک طبی ڈاکٹر ایف ڈے کو اس جگہ پر مقرر کیا گیا۔ ۱۸۷۱ء سے ۱۸۷۴ء تک ڈاکٹر ڈے نے بلوچستان کے گوادر سے لے کر ٹنا سرم کے مرگوئی تک سارے ساحل پر بحری مچھلیوں اور ہندوستان کی دریائی مچھلیوں پر تحقیق کا کام جاری رکھا چنانچہ ۱۸۷۳ء میں تازہ پانی کی اور سمندری مچھلیوں پر دو رپورٹیں شائع کیں۔
۱۸۷۵ء سے ۱۸۷۸ء تک اس نے اپنی یادگار کتاب "ماہیانِ ہند"

مرتب کی۔ جب ڈاکٹر ڈے ملازمت سے علیحدہ ہوئے تو مرکزی حکومت نے محکمہ سمکیات توڑ دیا۔

۱۸۶۲ء میں سر الگزنڈر کننگھم کی زیر نگرانی محکمہ آثار قدیمہ قائم ہوا۔ شمالی ہندوستان کی یادگاروں اور آثار سے متعلق اس محکمہ نے بہت وسیع پیمائش انجام دی۔ اسی قسم کا کام احاطہ بمبئی اور احاطۂ مدراس میں انجام دیا گیا۔
۱۸۸۵ء میں تحقیق کا تفصیلی پروگرام شروع کیا گیا۔ لیکن ۱۸۸۹ء میں بعض وجوہ کی بناء پر یہ محکمہ ہی تخفیف کر دیا گیا۔ پھر ۱۹۰۲ء میں جا کر کہیں اس محکمہ کے تمام شعبوں میں کام کا آغاز ہوا۔

۱۷۹۲ء میں مدراس میں رصدگاہ قائم کی گئی۔ ۱۷۹۶ء سے اس رصدگاہ میں موسمی تغیرات کے مشاہدے کئے جانے لگے۔ کلکتہ میں دفتر پیمائش کی عمارت میں یہ مشاہدات ۱۸۲۴ء سے شروع ہوئے۔ علی پور کی رصدگاہ میں ۱۸۷۷ء سے اور بمبئی کی رصدگاہ کولابہ میں ۱۸۴۱ء سے ان کا آغاز ہوا۔ ۱۸۵۵ء میں ایشیاٹک سوسائٹی نے ایک کمیٹی مقرر کی جس نے ۱۸۶۲ء میں ایک اسکیم پیش کی کہ سارے ملک میں مشاہدہ کرنیوالوں کے کام میں ضبط اور یکسانیت پیدا کرنے کیلئے ضروری ہے کہ مرکزیت پیدا کی جائے چنانچہ ۱۸۷۵ء میں ایچ، ایف بلینفورڈ کو سارے ہندوستان کیلئے موسمی رپورٹر مقرر کیا گیا۔ محکمہ موسمیات کے صدر کا نام بعد میں بدلکر ناظم اعلیٰ رصدخانہ جات کر دیا گیا۔

اطلاقی سائنس کے ادارے زراعت کے سلسلہ میں صوبہ داری محکمے مالگزاری اور زراعت یا صرف زراعت کے انیسویں صدی کے آخر میں قائم ہوئے

چنانچہ بمبئی میں ۱۸۹۵ء میں، مدراس میں ۱۸۸۹ء میں، شلانگ میں ۱۸۹۴ء میں، الہ آباد اور ناگپور میں ۱۸۹۵ء میں اور بنگال میں ۱۸۹۶ء میں قائم ہوئے۔

۱۹۰۳ء میں پوسا میں ادارہ تحقیقات زرعی قائم کیا گیا جس کو بعد میں دہلی منتقل کیا گیا۔

علاج حیوانات میں ۱۸۹۰ء میں بمقام پونہ شاہی جرثومیاتی تجربہ خانہ قائم ہوا۔ ۱۸۹۳ء میں اسے گڈھ مکتیشر منتقل کر دیا گیا۔ ۱۹۲۵ء میں اس کا نام بدل کر شاہی ادارۂ تحقیق بیطاری کر دیا گیا۔

۱۸۹۹ء میں بمبئی میں ہافکن انسٹیٹیوٹ قائم ہوا۔ ادویہ کے سلسلہ میں یہ ایک مشہور ادارہ ہے۔ اس کی ابتدا تحقیق طاعون کے تجربہ خانے کی حیثیت سے ہوئی تھی۔ لیکن بعد میں فارمیکالوجی اور بائیوکیمسٹری کی تحقیق بھی اس کے دائرۂ عمل میں آ گئی۔

۱۸۷۶ء میں ڈاکٹر مہندر لال سرکار نے ادارۂ ترقی سائنس ہند، کلکتہ قائم کیا۔ اس صدی کے پہلے دہے کے ختم تک اس ادارے نے سائنس کی ترقی میں بڑا حصہ لیا۔ پبلک کے لئے لیکچروں کا انتظام ہوتا اور کالجوں میں درسوں کے علاوہ سائنس کی مختلف شاخوں میں توسیعی لکچر دیے جاتے۔ جب سے اس ادارے کو سرچندر شیکر وینکٹ رامن جیسے عالمی شہرت کے سائنسداں کی سرپرستی حاصل ہوئی ہے اس وقت سے اس ادارے کو چار چاند لگ گئے ہیں۔ چنانچہ ہندوستان میں طبیعیات کی تحقیق میں یہ ادارہ بہت پیش پیش ہے۔

ہندوستان میں سائنس کی تحقیق

ہندوستان میں بیسویں صدی کا آغاز کیا ہوا کہ سائنس کے کاموں میں تیزی پیدا ہو گئی۔ اس سے پہلے

یہ کیفیت تھی کہ سائنس کی تعلیم زیادہ تر طب اور انجینئرنگ کے کالجوں میں ملتی تھی یا پھر ایسے اداروں میں جن میں اساتذہ اور سامان مہیا ہوتے۔ لیکن ملک بھر میں سائنس کی طرف رغبت زیادہ ہو گئی تھی۔ اور تعلیم کی غرض سے جو ہندوستانی طلبا یورپ وغیرہ جاتے تھے ان میں سائنس کی کسی نہ کسی شاخ میں تعلیم حاصل کرنے والوں کی تعداد روز افزوں تھی حکومت کے محکموں میں سائنس کی تحقیق تیزی سے عمل میں آ رہی تھی۔ اور اس ذیلی براعظم میں سائنس میں کام کرنے والے "جغرافیائی تنہائی" بھی محسوس کرنے لگے تھے۔ بالخصوص وہ لوگ جو ایسی جگہ رہتے تھے جہاں سائنس داں مشکل سے دستیاب ہوتے تھے۔ اس کے ساتھ ہی کسی نہ کسی شاخ میں "تخصیص" کی وجہ سے بھی 'تنہائی' سی محسوس ہونے لگی تھی۔ اس ضرورت نے سوسائٹیوں اور دیگر اداروں کی بنیاد ڈالی۔ نتیجہ کے طور پر ہندوستان میں سائنس کی وہ ترقی ہوئی جو آج نظر آ رہی ہے۔

یہاں پر یونیورسٹیوں کا ذکر کچھ بے جا نہ ہوگا۔ انیسویں صدی میں کئی ایک جامعات یا یونیورسٹیاں قائم ہو چکی تھیں۔ لیکن وہ سب کی سب امتحان لینے والی جماعتیں تھیں۔ تدریس یا پڑھانے کا کام ان کے ذمہ نہ تھا۔ سنہ ۱۹۰۴ء میں "قانون جامعات" منظور ہوا تو اس کی شرائط کے تحت ایسی گنجائش نکل آئی کہ کئی ایک جامعات میں تدریسی کام شروع کر دیا گیا۔ بالخصوص پوسٹ گریجویٹ اور تحقیقی کام۔ سنہ ۱۹۰۶ء میں جب ملک بھر کے سرکاری کالجوں اور خانگی اداروں میں مختلف سائنسوں کے لئے کرسیاں قائم کی گئیں تو سائنس کی تعلیم میں بہت ترقی ہوئی۔

اس سلسلے میں جامعہ کلکتہ کا نام پیش پیش ہے۔ اس لئے ذرا تفصیل سے اس کا یہاں ذکر کیا جائے گا۔

سنہ ۱۹۰۹ء میں پوسٹ گریجویٹ تعلیم کے لئے انتظام کیا گیا سنہ ۱۹۱۷ء میں اس قسم کی تمام تعلیم کو کلکتہ میں مرکوز کر دیا گیا۔ بنگال کے دو مخیر حضرات سر تارک ناتھ پالٹ اور سر راش بہاری گھوش نے ایسے فنڈ قائم کر کے جامعہ کے حوالے کئے جنکا مقصد یہ تھا کہ سائنسی اور فنی تعلیم اور اشاعت کی ترقی میں اسے صرف کیا جائے۔ اس میں نظری اور اطلاقی سائنس دونوں کو شامل سمجھا گیا۔

ان عطیوں کی وجہ سے کلکتہ کے یونیورسٹی کالج آف سائنس نے سنہ ۱۹۱۶ء میں طبیعیات، کیمیا، اطلاقی ریاضی اور تجرباتی نفسیات میں پوسٹ گریجویٹ جماعتیں شروع کر دیں۔ سنہ ۱۹۱۹ء میں اطلاقی کیمیا اور اطلاقی طبیعیات کا اضافہ کیا گیا۔ کنور گرو پرشاد سنگھ کے وقف کی بدولت جامعہ نے پوسٹ گریجویٹ تدریس میں دو اور کرسیوں کا اضافہ کر دیا اور خود جامعہ کی مدِ محفوظ سے چند کرسیاں قائم کی گئیں۔ یہ سب کچھ سر آشوتوش مکرجی کے تدبر اور دانائی کا نتیجہ تھا کیونکہ جامعہ کلکتہ کو بلند سے بلند تر کرنے میں انھوں نے کسی مخالفت کی کبھی پرواہ نہیں کی۔

دوسری جامعات کو ایسے فنڈ اور ایسے وقف کم ملے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ان کا کام بھی کم ہے۔ سنہ ۱۹۱۹ء میں کلکتہ یونیورسٹی کمیشن کی رپورٹ شائع ہوئی اسکے بعد سے جو جامعات قائم ہوئیں وہ وحدانی قسم کی تھیں یعنی عام طور سے ان کا ایک مستقر ہوتا ہے جہاں درس و تدریس کے لئے وہ اساتذہ اپنی نگرانی میں مقرر کرتی ہیں پہلے جو یونیورسٹیاں الحاقی تھیں وہ بھی اب تدریسی فرائض انجام دینے لگیں۔ چنانچہ تقریباً سب میں کیمیا، طبیعیات، نباتیات اور حیوانیات کے شعبے ہیں۔ اور اب ارضیات کے شعبے بھی اکثر جگہ کھل گئے ہیں۔ چنانچہ یہ سب شعبے، جامعہ عثمانیہ (حیدر آباد دکن) میں بھی

موجود ہیں۔ اور اطلاقی سائنس کے شعبے بھی اب کھلنے لگے ہیں۔ حیدرآباد میں بھی یہ شعبہ موجود ہے۔ اکثر جامعات میں شعبۂ تحقیق بھی ہے۔ ان شعبوں سے تحقیق کے سلسلے میں جو کام شائع ہوا ہے وہ ہر لحاظ سے قابل قدر ہے۔

تحقیقی ادارے حکومت ہند نے تحقیق کے سلسلے میں کئی اہم تحقیقی ادارے قائم کئے۔ ۱۹۰۳ء میں "دی امپیریل ایگریکلچرل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ" کا قیام پوسا (بہار) میں عمل میں آیا۔ اس میں ایک فیاض امریکی مسٹر ہنری فلپس کے عطیہ کو بہت کچھ دخل ہے۔ اس ادارے کی طرف سے کوئمبتور (جنوبی ہند) میں تحقیق نیشکر کا ایک مرکز ۱۹۱۲ء سے کام کر رہا ہے۔

۱۹۳۴ء میں بہار میں جو زبردست زلزلہ آیا اس نے اس ادارے کو کافی نقصان پہنچایا۔ اس لئے ۱۹۳۶ء میں اس کو نئی دلی منتقل کر دیا گیا۔

۱۹۰۶ء میں "دی سنٹرل ریسرچ انسٹیٹیوٹ فار میڈیکل ریسرچ" کسولی میں قائم کیا گیا۔ اسمیں ملیریا کا شعبہ بھی رکھا گیا۔ جو آگے چل کر ملیریا سروے آف انڈیا بن گیا۔

اس سال دہرہ دون میں "دی فارسٹ ریسرچ انسٹی ٹیوٹ" قائم ہوا۔ تاکہ دودھ اور اس کے متعلقات کا انتظام مناسب طریقہ پر انجام پاسکے۔

۱۹۳۴ء میں کلکتہ میں "دی آل انڈیا انسٹیٹیوٹ آف پبلک ہلتھ اینڈ ہائجین" (کل ہند ادارہ صحت عامہ و حفظان صحت) قائم کیا گیا۔ اس کا وجود راکفیلر فاونڈیشن کی وجہ سے ہے کیونکہ اسی کی طرف سے زمین عمارت اور سامان کا انتظام کیا گیا۔ اور مرکزی حکومت کی طرف سے ملازموں کی تنخواہوں وغیرہ اور نگہداشت کا انتظام کیا گیا۔

صوبوں میں بھی اس قسم کے ادارے قائم ہیں۔ چنانچہ بمبئی کا ہافکن انسٹی ٹیوٹ کا ذکر اوپر گزر چکا ہے۔ طب کے سلسلے میں دوسرے ادارے قابل ذکر یہ ہیں:۔

انسٹیٹیوٹ آف پریونٹو میڈیسن، گوئنڈی، مدراس، ۱۹۰۳ء

پاسٹیور انسٹی ٹیوٹ آف سدرن انڈیا، کونور، ۱۹۰۷ء

کنگ ایڈورڈ دی سیونتھ پاسٹیور انسٹیٹیوٹ اینڈ مڈیکل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ شیلانگ؛ طبی تحقیق کے سلسلہ میں اس ادارے نے بڑی شہرت حاصل کر لی ہے۔

صوبہ داری ادارے بھی قابل ذکر ہیں۔ جہاں نہ صرف تدریسی کام ہوتا ہے بلکہ تحقیق بھی ہوتی ہے۔ چنانچہ وہ حسب ذیل ہیں:۔

اگریکلچر کالج اینڈ ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، کوئمبتور،

〃 〃 〃 〃 لائلپور (اب پاکستان میں ہے)

〃 〃 〃 〃 کانپور

۱۹۲۵ء میں آبپاشی کا مرکزی بورڈ (سنٹرل بورڈ آف ارگیشن) قائم کیا گیا۔ پونہ میں مرکزی حکومت کی طرف سے ایک تحقیقی تجربہ خانہ قائم ہے۔ وہ آبپاشی کے مرکزی بورڈ کے شعبہ تحقیق آبپاشی و ماحرکیات (ارگیشن اینڈ ہائڈروڈائینمک ریسرچ) کے لئے بھی کام میں لایا گیا ہے۔ ریلوے بورڈ، ٹیلیگراف، آل انڈیا ریڈیو، اور مرکزی اور صوبائی حکومتوں کے دوسرے فنی محکموں نے بھی اسی انداز پر اپنے تحقیقی مرکز قائم کر رکھے ہیں۔

یہاں بنگلور کے انڈین انسٹی ٹیوٹ آف سائنس کا ذکر ضروری ہے۔ یہ ادارہ سرجے، این، طاطا کی فیاضی کا مرہون منت ہے۔ ۱۹۱۱ء میں یہ ادارہ قائم ہوا۔

اخراجات کا سارا بار تقریباً ٹاٹا خاندان پر رہا۔ بعد میں حکومت ہند اور حکومت میسور نے امدادیں منظور کیں۔

۱۹۱۷ء میں سر جگدیش چندر بوس نے کلکتہ میں پوسٹ گریجویٹ تحقیق کیلئے بوس ریسرچ انسٹی ٹیوٹ قائم کیا۔

۱۹۲۴ء میں اندور میں انسٹیٹیوٹ آف پلانٹ انڈسٹری قائم ہوا۔

۱۹۳۱ء میں کلکتہ میں انڈین اسٹیٹسٹکل انسٹی ٹیوٹ قائم ہوا۔ تاکہ خالص اور اطلاقی اعداد و شمار کا مطالعہ کیا جاسکے۔ اور ان علوم کی نشر و اشاعت عمل میں آسکے۔

۱۹۲۵ء میں رانچی میں انڈین لاکھ ریسرچ انسٹی ٹیوٹ قائم ہوا۔

ہندوستان میں سائنس کے لئے بیسویں صدی میں گویا ایک نیا باب کھلا ہے۔ جہاں اور سرگرمیاں رہیں وہاں یہ بھی ہوا کہ اسپیشل سوسائٹیاں اور ادارے حکومت اور ملک کی طرف سے بکثرت قائم ہوئے۔ یہاں پر چند کا ذکر کر دینا نامناسب نہ ہوگا۔

پہلا ادارہ جو اس سلسلہ میں قائم ہوا وہ "دی مائننگ اینڈ جیالوجیکل انسٹی ٹیوٹ آف انڈیا" (ادارۂ ارضیات و معدنیات ہند) تھا جو ۱۹۰۶ء میں قائم ہوا۔

۱۹۰۷ء میں انڈین میتھمیٹکل سوسائٹی (انجمن ریاضیات ہند) بمقام پونا وجود میں آئی۔ اسوقت اسکو اینالیٹیکل کلب سے موسوم کیا گیا۔ بعد میں چلکر اسکا دفتر ناگپور منتقل ہوا لیکن اس کا رسالہ مدراس سے شائع ہوتا ہے۔

۱۹۰۸ء میں کلکتہ میتھمیٹکل سوسائٹی قائم کی گئی۔

پھر ۱۹۲۰ء میں انسٹی ٹیوشن آف انجینیرس (ہند) کا قیام عمل میں آیا۔ اس کا مستقر کلکتہ میں رہا اور دوسرے بڑے شہروں میں اس کی شاخیں قائم کی گئیں۔

۱۹۲۱ء میں انڈین بوٹینیکل سوسائٹی (انجمن نباتیات ہند) قائم کی گئی۔
اس کا صدر مقام گشتی رکھا گیا۔

۱۹۲۲ء میں کلکتہ میں انڈین سائکو اینالیٹیکل سوسائٹی (انجمن نفسیات تحلیلی ہند) قائم ہوئی۔

۱۹۲۴ء میں انڈین کیمکل سوسائٹی (انجمن کیمیا ہند) بمقام کلکتہ قائم ہوئی۔
اسی سال دی جیالوجیکل، مائننگ اینڈ میٹالرجیکل سوسائٹی (انجمن ارضیات معدنیات وفلزیات ہند) بھی قائم ہوئی۔

۱۹۲۵ء میں انڈین سائکولاجیکل ایسوسی ایشن (انجمن نفسیات ہند) کا قیام عمل میں آیا۔

۱۹۳۱ء میں سوسائٹی آف بایولاجیکل کیمسٹس (انجمن نباتیاتی کیمیا ہند)
اسی طرح ۱۹۳۴ء میں انڈین فزیکل سوسائٹی (انجمن طبیعیات ہند)
۱۹۳۵ء میں انڈین فزیالوجیکل سوسائٹی (انجمن فعلیات ہند) اور ۱۹۳۶ء میں
انڈین انیتھروپولاجیکل سوسائٹی (انجمن بشریات ہند) کلکتہ میں قائم ہوئیں۔
اس قسم کے ادارے اور انجمنیں قائم ہوتی رہیں لیکن یہ ضرورت محسوس ہونے لگی کہ ان سب کے کاموں میں ہم آہنگی اور تعاون پیدا کرنیکی ضرورت ہے۔
حکومت ہند نے ۱۹۰۲ء میں بورڈ آف سائنٹفک ایڈوائس (مجلس مشاورت سائنس) قائم کیا تھا۔ اس کے جلسے وقتاً فوقتاً ہوتے رہتے تھے جن کی روئداد سالانہ شائع ہوتی تھی۔ اسی کی رپورٹ سکریٹری آف اسٹیٹ کی معرفت رائل سوسائٹی آف لندن کو بھیجی جاتی تھی۔ وہاں سے بورڈ کو وقتاً فوقتاً مفید مشورے ملتے رہتے تھے۔

لیکن بورڈ کو ۱۹۲۴ء میں بند کر دیا گیا۔

اب دیکھا جائے تو کل ہند بنیاد پر کئی انجمنیں اور کانفرنسیں وغیرہ قائم ہیں جن میں سب سے زیادہ بااثر انڈین سائنس کانگریس ہے۔ جس کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے۔ ہندوستان کے آزاد ہونے کے بعد سے کانگریس اور دوسرے اداروں کی ذمہ داریاں بڑھ گئی ہیں جن کو پورا کرنے کی ہر ممکن کوشش کی جا رہی ہے۔

سائنس کی تعلیم

اس بیسویں صدی میں جب کہ جوہری بم (ایٹم بم) ایجاد ہو چکے ہیں سائنس کی اہمیت اور ضرورت کے متعلق کچھ لکھنا بیکار ہے کیونکہ سائنس کی ضرورت تو ہر ملک محسوس کرتا ہے۔ اس لئے اب مسئلہ یہی ہے کہ اس ضرورت کو پورا کس طرح کیا جائے۔

ظاہر ہے کہ اس مقصد کو پورا کرنے کے لئے سائنس کی تعلیم لازمی ہے۔ ہندوستان میں سائنس کی تعلیم انگریزوں کے زمانے سے شروع ہوئی۔ انیسویں صدی کے آخری دہے تک سائنس کی تعلیم نے کچھ زیادہ ترقی نہ کی تھی، چنانچہ اس زمانے میں ایم ایس سی کی جماعت میں عملی تجربے دو یا تین انجام دئے جاتے تھے۔ اس کے مقابل آج کل ایف اے کی جماعتوں میں کوئی سو کے قریب تجربے طالب علم خود انجام دیتے ہیں۔

سائنس کی تعلیم مدرسہ سے ہی شروع ہو جاتی ہے۔ عام طور پر ایم ایس سی پر ختم ہوتی ہے۔ اس کے بعد پوسٹ گریجویٹ تعلیم اور تحقیق کے میدان رہ جاتے ہیں۔

سائنس کی جن شاخوں کی تعلیم کا انتظام کالجوں وغیرہ میں کیا جاتا ہے ان میں طبعیات، کیمیا، حیوانیات، نباتیات، ارضیات، ریاضیات، طب، بیطاری، انجینیرنگ، وغیرہ شامل ہیں۔

عام طور پر اعلیٰ تعلیم کا انتظام جامعات (یونیورسٹیوں) میں ہوتا ہے۔ اور وہیں تحقیقی کام بھی انجام پاتا ہے۔

لیکن انگریزوں کے زمانے میں یہ کام خاص نوعیت کا ہوتا تھا۔ اس لئے ملک کو بہ حیثیت مجموعی زیادہ فائدہ نہ پہنچتا تھا۔ اب چونکہ ہندوستان آزاد ہو چکا ہے لہذا سب سے بڑا قومی مسئلہ تعلیم کا ہے، جس میں سائنس کی تعلیم بھی شامل ہے۔ اس کی اہمیت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ حکومت ہند نے سر رادھا کرشنن کی سرکردگی میں ایک کمیشن مقرر کیا جو تمام یونیورسٹیوں کا دورہ کر چکا ہے اور اگست یا ستمبر سنہ ۱۹۴۹ء تک اپنی رپورٹ پیش کر دے گا۔ توقع یہ کی جاتی ہے کہ ہندوستان کی تمام یونیورسٹیوں میں یکسانیت پیدا کر دی جائے گی۔

یہ تو خیر حکومت کا کام تھا لیکن اب آزادی کے بعد یہ کام ملک کے سرمایہ داروں کا ہے کہ وہ خود ایسے ادارے قائم کریں جہاں سائنس کی تعلیم بھی ہو اور وہاں طالب علم عملی تربیت بھی حاصل کر سکے۔ سائنس کی تعلیم جو لوگ حاصل کر چکے ہیں یا کر رہے ہیں انکی ہمت افزائی کی صورت یہی ہے کہ ملک کے کارخانے ان کو اپنے یہاں جگہ دیں اور اُن کی دماغی صلاحیتوں سے کام لیں۔ اور ان کارخانے والوں کو یہ اچھی طرح سے سمجھ لینا چاہیئے کہ ہندوستانی دماغ کسی سے پیچھے نہیں ہے۔ اور مساوی مواقع میں تو ہندوستانی اگر آگے نہیں تو کسی سے پیچھے بھی نہیں رہے گا۔ اور کیا عجب ہے کہ اب آگے نکل جائے۔ اس کی تائید میں ہم پچھلوں میں سے سر جگدیش چندر بوس اور پرفلا چندر رائے کے نام پیش کر سکتے ہیں اور موجودہ سائنسدانوں میں سر شانتی سروپ بھٹناگر، ڈاکٹر میگنا تھ سہا اور سرسی وی رامن کے نام نامی پیش کر دینا کافی سمجھتے ہیں۔

مہباہد

آزادیِ ہند کی دوسری سالگرہ کا علمی پیشکش

راجگان آندھرا

(از)

علامہ حکیم سید شمس اللہ قادری صاحب ماہر آثار قدیمہ

۱۵۔ اگست سنہ ۱۹۴۹ء

نینوا، اسیریا، خالدیہ، بابل، ایران، مصر، ہندوستان اور رومن امپائر کی قدیم تہذیبوں نے اپنے حسن کارانہ تمدن کے جو آثار موجودہ نسلوں کے لئے چھوڑی ہیں ان میں نقاشی، سنگتراشی اور قلمکاری کے بعض ایسے نمونے پائے جاتے ہیں کہ ہمارا ترقی یافتہ زمانہ بھی اس سے بہتر مثالیں پیش نہیں کر سکتا ہے۔

ان پرانے ذخیروں میں ہم کو چوبی نقاشی و گلکاری، سنگتراشی کے عظیم الجثہ بہرندی، غار، بتخانے، لاٹ اور ادبھری ہوئی نقش و نگار کے بعض قابل قدر نمونے نظر آتے ہیں، چہ جائیکہ بعض مجسموں اور تصویروں میں تو ایسا زور قلم صرف کیا گیا ہے کہ وہ ہو بہو اصلی معلوم ہوتے ہیں بلکہ انسانی مجسموں سے زیادہ ان میں اصلیت کا مظاہرہ ہوتا ہے، ظاہر ہے کہ یہ ید طولی طویل اور محتاط مشاہدۂ فطرت ہی کے بعد حاصل ہو سکتا ہے۔

ان قدیم تہذیبوں کے دوش بدوش، ہندوستان بھی اپنی بلند پایہ ثقافت کی منزلیں طے کرتا رہا ہے لیکن یہاں تاریخی ریکارڈ کا فقدان ایسا رہا کہ قابل وثوق طریقہ سے تاریخ کے تعین میں دشواریوں کا سامنا رہتا ہے، ہندوستان کی تعمیراتی تاریخ کا آغاز راجہ چندرگپت کے پوتے یعنی خاندان موریہ کے مشہور راجہ اشوک کے عہد سے ہوتا ہے، جو حضرت مسیح کی پیدائش سے ڈھائی سو سال قبل کا ٹھیاواڑ سے کٹک اور گنجام تک، پنجاب سے افغانستان تک اور جنوب میں میسور تک حکمران رہا ہے،

جو ستون اور لاٹ اس راجہ نے نصب کرائے تھے، وہ آج تک برقرار ہیں، چنانچہ بہار ہمت سانچی اور بدھ گیا کے ستون نما جنگلے اسی زمانے کی یادگاریں ہیں۔

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ ہندی طرز تعمیر کی تمام صلاحیتیں مندروں کے بنانے میں صرف ہوتی رہی ہیں، اسی وجہ سے اس ملک میں مندروں اور عبادت گاہوں کی بہتات ہے، اس ثقافتی املاک کو اس قدر اہمیت حاصل ہے کہ آنیوالی نسلوں کے لئے ایک مقدس میراث کی حیثیت سے ہمیشہ کیلئے یہ قابل تحفظ ہیں۔ قدیم ذخائر کا یہ خزینہ، جو مجسموں، نقش و نگار اور تصاویر کے اشکال میں ہم تک پہنچا ہے، قوم کے ذوق و شعور کی تربیت اور تعلیم کے لئے نادر مواقع فراہم کرتا ہے۔

ہندوستان کا گوشہ گوشہ وشنو، شیو اور ہنومان نیز دیگر اوتاروں کے مندروں اور شوالوں سے معمور ہے، اہل ہنود کے تمام فرقے شیو، وشنو اور برہما کے پرستار ہیں، اور اگرچہ برہما بقیہ دو اوتاروں سے زیادہ طاقت ور مانے جاتے ہیں مگر برہما کے نام کا ہندوستان میں مشکل سے کوئی مندر ملے گا، انہیں ظاہری شکل و صورت میں پیش کرنے کے بجائے ایک ایسی غیر مادی آتما کی حیثیت سے مانا جاتا ہے جو ساری مخلوق کو زندگی بخشتا ہے، برخلاف اس کے شیو اور وشنو کے بے حساب اوتار اور مجسموں سے ہندوستان کے مناور پٹے پڑے ہیں، شیو کے خصوصیات میں پیدا کرنا، فنا کرنا، بلکہ تبدیل ہیئت کرنا ہے اور ان کی امتیازی علامت لنگ ہے جس پر نذر و نیاز اور قربانیاں کی جاتی ہیں، ان میں تخریب و تخلیق کی ساری طاقتیں مجتمع سمجھی جاتی ہیں اور شیو ہی ہندوستان کے حقیقی دیوتا ہیں، ان کی جنس لطیف پاربتی یا کالی مائی ہیں، جنہیں موت و حیات کی دیوی مانا جاتا ہے، انہی کی بدولت کائنات کا وجود ہوا

اور بالآخر یہی اس کو نگل جائینگی، شیو کا تسلط عقل و ادراک پر رہتا ہے اور وشنو
دل کے مالک ہیں اسی لئے انہیں محبت کا دیوتا بھی مانا جاتا ہے۔

ہندوستان کے منادر، مادی علامات اور مورتیوں سے اس لئے معمور رہتی ہیں کہ اہل ہنود ان چیزوں کے بڑے شایق ہیں، خصوصیت کے ساتھ لنگ اور یونی یعنی مردانہ و نسوانی علامات ان مندروں میں پائی جاتی ہیں۔ بنارس، جگنا تھ اور جنوبی ہند کے یاترا دن میں ہر سال لاکھوں پرستاروں کا مجمع ہوا کرتا ہے۔ اب ہم بعض مشہور منادر کا ذکر کرینگے۔

۱۔ جگنا تھ (پوری) ہندوستان میں جگنا تھ سے بڑھکر کوئی اور مقام یاترا کے لئے مشہور نہیں ہے۔ یہ اڑیسہ کے ساحل پر واقع ہے اور اس مندر کی تعمیر راجہ اننگا بھیما نے پندرہ لاکھ طلائی ہون کے صرفہ سے ۱۱۹۸ء میں چودہ برس کی مدت میں کرائی تھی۔ مندر ایک مربع احاطہ میں جس کا طول (۶۵۲) اور عرض (۶۴۴) فیٹ پر واقع ہے اس کی غلام گردش کی بلندی (۲۲) فیٹ ہے۔ اس مندر میں وشنو (جنہیں یہاں جگنا تھ سے موسوم کیا گیا ہے) اور شیو دونوں کی پرستش ہوا کرتی ہے اس کا گا ؤدم مینار (۱۹۲) فیٹ بلند اور نقش و نگار سے معمور ہے۔ اس پر چکر کے علاوہ وشنو کا پھریرا لہراتا رہتا ہے۔ جس صحن میں یاتری جمع ہوا کرتے ہیں اس میں ایک ڈال کا خوبصورت سنگی ستون نصب ہے۔ مندر کا اندرونی حصہ چار کمروں پر مشتمل ہے ایک سے دوسرے کمرے میں جانیکا راستہ ہے۔ سب سے اندر کی عبادت گاہ میں جگنا تھ کے علاوہ ان کے بھائی بل بھدر اور ان کی بہن سو بھدرا کی مورتیاں ہیں۔

۲۔ بودھ گیا گیا گوتم بودھ اور ان کے بودھی درخت کی وجہ سے کافی شہرت رکھتا ہے وہ ابتدائی مندر جس کو راجہ اشوک نے بنوایا تھا، اب موجود نہیں ہے البتہ مندر کے اطراف جو سنگی جنگلہ نظر آتا ہے بس اشوک کے زمانہ کی بچی کھچی یہی ایک علامت باقی رہ گئی ہے، اب جو مندر ہے حکومت بنگال نے ۱۸۷۷ء میں اس کی تعمیر کرائی تھی۔ وشنو پادادیول یہاں سب سے زیادہ مقدس مانا جاتا ہے جس میں وشنو کے پاؤں کا نشان بنا ہوا ہے۔ گیا کی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ یہاں بزرگوں کے شرادھ کے مراسم بڑی عقیدت کے ساتھ انجام پاتے ہیں۔

۳۔ کاشی (بنارس) کاشی کے بارہ میں یہ عقیدہ ہے کہ اس کی تعمیر شیو کے ترسول کے ایک گوشہ پر ہوئی تھی۔ بنارس صدیوں تک بودھ مت کا مرکز رہا ہے۔ ہنود کا یہ کہنا ہے کہ لوگ جسے بودھا کے نام سے یاد کرتے ہیں وہ حقیقت میں وشنو تھا۔ شنکر آچاریہ جو آٹھویں صدی عیسوی میں گزرے ہیں انھوں نے بنارس میں شیو پوجا کو بہت فروغ دیا۔ یہاں مندروں کی بہتات کی وجہ سے بنارس کو مندروں والا شہر کہتے ہیں، یہ گنگا ندی کے کنارے واقع ہے، پرستاروں کا عقیدہ یہ ہے کہ یہاں آنے سے ضمیر کو سکون اور نجات کا یقین حاصل ہو جاتا ہے، عموماً یہاں کے مندر پتھر کے بنے ہوئے اور نقش و نگار سے آراستہ ہیں، شیو کے مندروں پر ترسول اور ایک ڈنڈے پر پھریرا لہرایا کرتا ہے۔

یہاں کے تین قابل ذکر مندروں کی تفصیل درج کی جاتی ہے۔

۱۔ بسیسور طلائی مندر شیو کو یہاں بسیسور کے نام سے پکارا جاتا ہے یعنی خالق ارض و سما۔ یہ مندر اندور کی رانی اہلیا بائی کا

بنوایا ہوا ہے جو ایک چوگوشیہ چبوترہ کے وسط میں واقع ہے اس کی چھت پر گنبد، مینار اور کلس بنا ہے۔ مینار (۵۱) فیٹ اونچا ہے جو دھوپ کے وقت دمکتا رہتا ہے، مہادیو کے صحن میں ایک چبوترہ پر متعدد مورتیاں رکھی ہوئی ہیں۔ گنبد کے نیچے نو گھنٹے لٹکے ہوئے ہیں جن میں سے ایک نقشی ہے، اس کو راجہ نیپال نے چڑھایا تھا، اس مندر میں بشیسور کی علامت لنگ ہے، دالان کے مشرقی گوشہ میں سات فیٹ اونچا ایک نندی بیل پتھر میں تراشا ہوا ہے۔

۲۔ بھیرو ناتھ بھیرو ناتھ کو شہر بنارس اور شیو کا کوتوال کہا جاتا ہے، اس کے ہاتھ میں ایک چار فیٹ کا سنگی گرز ہے۔ اس مندر میں تین گھنٹے آویزاں ہیں اور ایک گوشہ میں پوجاری مورچل ہاتھ میں لئے بیٹھا رہتا ہے۔

۳۔ درگا یہ سنگی مندر نقش و نگار سے بھرا ہوا ہے، اس میں داخلہ نوبت خانہ کیطرف سے ہوتا ہے جہاں پر ایک بڑا سا نقارہ رکھا ہے اس پر دن رات میں صرف تین مرتبہ چوب لگائی جاتی ہے جس سے سارا محلہ گونج جاتا ہے، داخلہ کے بعد دو چھوٹے مندروں کے درمیانی حصہ میں قربانگاہ اور ایک کھونٹا گڑا ہوا ہے، جس میں قربانی کے جانور باندھے جاتے ہیں، دھلیز کے پاس دو ترشے ہوئے ببر بنے ہیں، وہ اس طریقہ سے جھکے ہوئے کھڑے ہیں کہ جب کبھی درگا مائی کا جی چاہے ان پر سوار ہو جائیں، بعض مختصر عمارتیں گنیش اور مہادیو سے منسوب ہیں، وسطی عمارت کے اندرونی حجرے میں درگا کی مورتی ہے، صحن میں اور متصلہ عمارتوں کی چھت پہ بندروں کا کثرت سے مجمع رہتا ہے، ہنومان جی سے نسبت رکھنے کی وجہ سے عام طور پران کا احترام کیا جاتا ہے۔

۴۔ متھرا و بندرابن

متھرا جو جمنا ندی کے مغربی کنارے پر واقع ہے بڑا قدیم شہر ہے، سنہ ۴۰۰ء میں چینی سیاح فاہیان نے اس مقام کا تذکرہ بدھ مت کے مرکز کی حیثیت سے اپنے سفرنامہ میں کیا ہے۔ یہاں بھی گلی کوچوں میں بندروں کی افراط رہتی ہے اور یہاں ندی میں کچھوے کثرت سے پائے جاتے ہیں، گوکل جو جمنا کے مشرقی ساحل پر متھرا سے چھ میل دور واقع ہے، وہ مقدس مقام ہے جہاں کرشن جی کا بچپنہ گزرا تھا، اسی کے پاس مہابن میں نند جی کا محل بنا ہے، کرشن جی کا جھولا بھی یہیں ہے اور ان کے طفولیت کی ایک نیلگوں مورت بنی ہے، ان کی دودھ ماں جسودہ جس مٹکی سے مسکہ نکالا کرتی تھیں وہ بھی یہیں دکھائی جاتی ہے، بسنتی کپڑے پہنے ہوئے وشنو کے ہزاروں پرستار ہر سال یہاں درشنوں کو آیا کرتے ہیں۔

بندرابن کا فاصلہ متھرا سے چھ میل ہے، یہ بھی بڑا مقدس مقام مانا جاتا ہے، مندر یہاں بھی کثرت سے ہیں، گوبند دیو کا مندر جسکی تعمیر سنہ ۱۵۹۰ء میں ہوتی تھی، بلحاظ طرز تعمیر سب سے بہتر سمجھا جاتا ہے اس پر ایک خوبصورت گنبد ہے، اسکے علاوہ گوپی ناتھ، جوگل کشور، اور مدن موہن کے تین مزید گنبد اسی زمانہ کے بنے ہوئے ہیں۔ ایک جدید بڑا مندر سنہ ۱۸۵۱ء میں بنایا گیا ہے جس کے بیرونی دیوار پر (۸۰) اسی فٹ کی تین برجیاں ہیں، مورتی کے محاذی ساٹھ فیٹ اونچا ایک سی لاٹ کھڑا ہے۔

۵۔ تیلی کا مندر۔ گوالیار

یہ بلند اور خوش وضع عمارت ساٹھ فیٹ مربع میں بنائی گئی ہے، اس کو ایک متمول تیلی نے دسویں یا گیارہویں صدی کے اوائل میں بنوایا تھا۔ پہلے یہ مندر وشنو سے منسوب تھا مگر اب شیو کی پرستش

کے لئے مخصوص ہے' جس محنت اور کارگری سے یہ بنوایا گیا ہے اس کا کچھ اندازہ اس کی تصویر سے ہو سکیگا۔

۶۔ **ناسک** ناسک، کو مغربی ہند کا بنارس سمجھا جاتا ہے' یہاں گوداوری کو وہی تقدس حاصل ہے جو گنگا کو بنارس میں ہے' ناسک کی اہمیت اس وجہ سے بھی ہے کہ یہاں رامچندرجی کے بن باس کا زمانہ گذرا ہے' اس دیول کا نام پنچاوتی اسوجہ سے ہے کہ اس پر ہروقت پانچ برگد کے درخت سایہ ڈالے رہتے ہیں' جس مندر کا نام سندر نرائن ہے اسکی تعمیر بیسویں صدی کے اوایل میں ہوئی تھی' یہاں کا سب سے پرانا مندر کا پلیشور ہے' جو شیو سے منسوب ہے' اس مندر تک پہنچنے کے لئے پچاس سیڑھیاں طے کرنی پڑتی ہیں اور اس کی تعمیر چھ سو پچاس برس پہلے ہوئی تھی' یہاں کا سب سے سندر دیول بالارام کا ہے' جس کا احاطہ مستطیل وضع کا ہے اور اس میں (۹۶) کمانیں (۲۶۰) فیٹ لانبی اور (۱۲۰) فیٹ چوڑی ہیں' اس کو تعمیر ہوکر ڈیڑھ سو برس ہوئے ہیں۔

۷۔ **پنڈھر پور** یہ مشہور دیول وٹھوبا سے منسوب ہے' اس کا طول (۳۵۰) فیٹ اور عرض (۱۷۰) فیٹ ہے۔ جی جوری کے مندر میں کھنڈوبا کی پرستش ہوتی ہے جو شیو کا اوتار مانا جاتا ہے۔

۸۔ **ہردوار** یہ مقام گنگا کے کنارے واقع ہے' وشنو کے پرستار اس کو ہری دوارہ (وشنو کا دروازہ) اور شیو کے معتقد ہرادوارہ (شیو کی دھلیز) کہتے ہیں' جو چیز سب سے زیادہ جاذب توجہ ہے' وہ یہاں اشنان کا گھاٹ اور اس سے ملحقہ مندر گیانہ دوارہ ہے۔ جس پتھر پر وشنو کے پاؤں کا نشان بنا ہے وہ بہت متبرک مانا جاتا ہے' یاتریوں کا اجتماع یہاں بیساکھ کے مہینے کی پہلی تاریخ یعنی شمسی سال

کے آغاز کے دن ہوا کرتا ہے، ہر بارہویں سال یہاں کنبھ میلا ہوتا ہے جس میں خلقت کا بڑا اژدہام رہتا ہے، ہر یاتری کی یہی کوشش رہتی ہے کہ وہ گھاٹ میں سب سے پہلے چھلانگ مارے۔

۹۔ کالی گھاٹ

کہا جاتا ہے کہ کلکتہ کے نام کی وجہ تسمیہ یہی کالی گھاٹ کا مندر ہے، یہ شیو کی زوجہ کالی مائی سے منسوب ہے، کالی نرمی اور غضبناکی کی دو گونہ صفتوں سے متصف ہے، اس مندر میں کالی کی پرستش آخر الذکر خصوصیت کے تحت کی جاتی ہے یہاں جو کالی کی نیلگوں سیاہی مائل مورتی بنی ہے وہ چار ہاتھ والی ہے، اس کے ایک ہاتھ میں تلوار اور دوسرے میں اس دیو کا سر ہے جو ان کا کشتہ ہے، بقیہ دو ہاتھوں سے وہ اپنے پرستاروں کو آنے کی دعوت دے رہی ہیں، ان کے گلے میں مُنڈ مالا اور زبان ہونٹوں کے باہر نکلی ہوئی ہے، موجودہ مندر کی عمر ساڑھے تین سو برس کی ہے۔

۱۰۔ ایلورہ

یہ غار اورنگ آباد کے شمال مغربی جانب (۱۶) میل کے فاصلہ پر واقع ہیں، ان میں بدھ مت، برہمنی اور جینی طرز تعمیر کے بہترین نمونے نظر آتے ہیں، ان غاروں کو پہاڑ کے ڈھلوان حصوں کو تراش کر بنایا گیا تھا، بدھ مت کے بارہ غار جنوب میں برہمنی سترہ غار درمیانی حصہ میں اور پانچ جینی غار شمال میں واقع ہیں، کیلاش کی تعمیر ایک بڑے پہاڑ کو گہرا تراش کر کی گئی ہے، اور اس کو "شیو کی جنت" کے طرز پر بنایا گیا ہے، اس کی دیواروں پر آٹھ دس فیٹ لانبی مورتیں کھودی گئی ہیں، جنہیں اعضاء کے تناسب کے ساتھ ان کا پیچ و خم بھی بڑی صفائی سے نمایاں کیا گیا ہے، اس کے علاوہ ہاتھی، ببر، بارہ سنگھے، قازاور بیل جا بجا بنے ہوئے ہیں، اسی میں ایک سو

نیٹ گہرا صحن نکالا گیا ہے، جس کا طول و عرض اندر سے (۱۵۰ × ۲۷۰) نیٹ ہے۔
اس صحن کے وسط میں یہ مندر واقع ہے جس کے اندر لنگ بنا ہے۔

برہمنی مندروں میں "راون کی کہانی" مشہور مندر ہے۔ اس میں درگا، لکشمی، شیو اور پاربتی کے سوانح حیات پتھر پر کندہ کئے گئے ہیں۔

سب سے قدیم بودھی غار (۱-۳-۷) نمبر کے ہیں، (۲-۵) ساتویں صدی عیسوی کے غار ہیں، اجنتہ کے غاروں کی کھدائی کے اختتام کے بعد ایلورہ کے غاروں کی کھدائی کا آغاز ہوا تھا۔

۱۱۔ نرپتی جب (۳۱) کُنڈ طے کرلئے جائیں اس وقت نرپتی کے مندر تک رسائی نصیب ہوتی ہے۔ داخلہ کے دروازہ کے بعد بہت سی سیڑھیاں طے کرکے وشنو کی سات فیٹ بلند پتھر کی مورتی دکھائی دیتی ہے جو چار ہاتھ والی ہے۔ مندر کے اطراف سنگ بست تہرا حصار بنا ہے۔ بیچ میں جو گنبد ہے وہ معمولی طرز کا ہے، حصار کی اندرونی گنجائش (۱۳۷ × ۹۷) گز ہے۔

۱۲۔ کنجی ورم یہ ہندوستان کے سات مقدس مقامات میں سے ایک ہے، یہاں منڈپ کے ساتھ ہزار ستون کا ایک دالان بنا ہے جس میں نفیس سنگتراشی کی گئی ہے، یہ شیو کا مندر ہے، دوسرا مندر جو وشنو سے منسوب ہے اس کے دالان کے ستونوں کو مختلف جانوروں کے سروں پر تراشا گیا ہے۔

۱۳۔ چدمبرم یہاں کا بڑا مندر شیو اور پاربتی سے منسوب ہے، اسکا رقبہ (۳۹) ایکڑ ہے اور اس کے گرد (۳۰) فیٹ اونچی دوھری دیواریں بنی ہیں، گنیش کے مندر میں جو مورتی ہے وہ ہندوستان بھر میں سب سے زیادہ اونچی

سمجھی جاتی ہے، یہاں کی خصوصیت یہ ہے کہ ایک ڈال پتھر کو لیکر اس سے سلسل (۲۷) فیٹ کی ایک زنجیر تراش کر بنائی گئی ہے جو اپنی آپ نظیر ہے۔

۱۴۔ تنجور اس بڑے دیول میں پہنچنے کے لئے دو صحن طے کرنا ضروری ہے، پہلا صحن (۲۵۰) فیٹ مربع اور دوسرا (۵۰۰×۲۵۰) فیٹ ہے، یہاں کے سڈول گنبد کا شمار ہندوستان کے حسین گنبدوں میں کیا جاتا ہے، اس دیول کی جو شیوسے منسوب ہے ۱۳۳۰ء میں تعمیر ہوئی تھی، یہاں کا نندی جو ایک ڈال پتھر سے تراشا ہوا ہے سولہ فیٹ لانبا اور بارہ فیٹ اونچا ہے، اس مندر میں وشنو اور شیو کو اس طرح سمو دیا گیا ہے کہ مخروطی برجیوں پر کی سنگتراشی، وشنو مت سے تعلق رکھتی ہے اور صحن کے نقش و نگار شیو سے نسبت رکھتے ہیں۔

۱۵۔ سری رنگم اس جزیرہ میں پہنچنے کے لئے ایک لانبے (۳۲) کمانوں والے پل کو طے کرنا پڑتا ہے، یہاں کا مندر وشنو سے منسوب ہے اور ہندوستان کے بڑے مندروں میں اس کو شمار کیا جاتا ہے، مندر کے احاطہ کے اندر کا رقبہ (۹۶۰×۸۲۵) گز ہے، دوسرا احاطہ (۲۵۰×۱۵۰) فیٹ ہے، اس کے بعد (۱۵) بڑے گنبد نما مندروں کا نظارہ بڑا شاندار معلوم ہوتا ہے، گنبد کے اطراف چمن بندی بھی بھلی معلوم ہوتی ہے، اس کو ویکنٹھ (وشنو کی جنت) کے نمونے پر بنایا گیا ہے، سری رنگم کی شہرت، ادویتہ فلسفہ کے موجد شری راما نوجا کی بدولت ہے، ان کی عمر ایک سو بیس سال کی ہوئی اور ۱۱۳۷ء میں وہ فوت ہوئے انکی سمادھی بھی یہیں بنی ہے۔

۱۶۔ مدورا مدورا کا شمار ہندوستان کے قدیم اور مشہور عبادت گاہوں میں کیا جاتا ہے، پانچویں صدی قبل مسیح میں یہ پانڈوں کا مستقر تھا،

ان کی سلطنت کا خاتمہ گیارہویں صدی عیسوی میں ہو گیا۔

یہاں کا بڑا مندر، جو سندریشور اور ان کی زوجہ مینا کشی سے منسوب ہے، (۲۸۲ × ۲۲۵) گز طویل و عریض ہے، اس کی نو برجیاں ہیں، یہاں ہزار ستون والا دالان سنہ ۱۵ء میں تعمیر ہوا تھا، گنبد کے پیچھے جو کنڈ بنا ہے وہ بڑا خوبصورت منظر پیش کرتا ہے، مندر کے اندرونی نقش و نگار صنعت کاری کا بہترین نمونہ ہیں

۱۔ سات پگوڈا ضلع چنگل پٹ کے مہابلی پورم میں سات پگوڈا کو خاص شہرت حاصل ہے، شیو کے مندر پر پالوا خاندان کے سنسکرت کتبے منقوش ہیں، جتنے غار نما مندر ہیں، وہ زمین دوز بنے ہیں، ان کے سنگی ستون خوشنما ہیں، ایک ڈال پتھر کی بہت سی رتھیں بنی ہیں، جہاں ابھرے ہوئے نقش و نگار ہیں ان کا انداز حسن کارانہ ہے۔

یہاں کی خصوصیت یہ ہے ایسا دکھائی دیتا ہے کہ ایک ڈال کا بڑا سا پہاڑ زمین سے نکل آیا ہے، جس کا قطر شمال سے جنوب کی طرف نصف میل طویل مشرق سے مغرب کی سمت ربع میل عریض ہے، اس کی بلندی ایک سو فیٹ ہے صناعوں نے اس پہاڑ کے اوپر نیچے، بلکہ ہر ہر گوشے میں سنگتراشی کے قابل دید نمونے چھوڑے ہیں، اس پہاڑ کے ارد گرد جس قدر گنڈ ملے ان میں مندر تراش دئے گئے ہیں، صناعوں کے خوش ذوقی لائق داد ہے کہ اس پہاڑ کا مشرقی رُخ جو سمندر کی جانب ہے تمام اہم یادگاریں اسی سمت میں تراشی گئی ہیں، پہاڑ کے مغربی جانب جس قدر غار نما مندر ہیں وہ وشنو، شیوا اور پاربتی سے منسوب ہیں، بہت اختصار کے ساتھ ان (۲۵) یادگاروں کا اس ضمن میں تذکرہ کیا جائے گا۔

(۱) دھرم راج کے منڈپ میں جو پہاڑ کے جنوبی دامن میں ہے، برہما، وشنو اور شیو کی مورتیاں ہیں، پہلے یہ صرف شیو کا مندر تھا، چنانچہ جو سنسکرت کتبہ وراندہ کی جنوبی دیوار پر کندہ ہے، اس میں درج ہے کہ یہ اتیشور (شیو) کا مندر تھا (۲) کوٹی کال منڈپ (۳) شیو مندر (۴) ترہ مورتی مندر (۵) دروپدی کی رتھ (۶) ارجن کی رتھ (۷) سہادیو کی رتھ (۸) بھیم کی رتھ، اس کی تصویر کے مشاہدہ سے ان رتھوں کے جو ایک ڈال پتھر کی بنائی گئی تھیں، ناظرین کو صحیح اندازہ ان کے محنت طلب طرز تعمیر کا ہو سکیگا۔ (۹) دھرم راج کی رتھ (۱۰) ولاینکتائی کی رتھ (۱۱) پڈاری کی رتھ (۱۲) گنیش کا رتھ نما دو منزلہ مندر (۱۳) واراہا مندر (۱۴) مہیشا سورا منڈپ (۱۵) راما نوجا منڈپ (۱۶) پنچ پانڈو کا منڈپ (۱۷) کرشنا منڈپ (۱۸) ارجن کی پراشچت (۱۹) ارجن کی پراشچت (مکرر) (۲۰) ہاتھی، بیل، بندر اور مور کا مجموعہ (۲۱) مہیشا سورا کی چٹان (۲۲) شیر کی گوی (۲۳) شیو کا مندر (۲۴) درگا کی چٹان (۲۵) واراہا منڈپ ایک مختصر سا خوبصورت غار نما مندر ہے، اس میں وشنو کی مورتی نہیں ہے، مندر کے سامنے ایک چھوٹا سا کنڈ ہے، اس کی چھت پر کنول کے پھول اور بھرے ہوئے تراشے گئے ہیں، اس کی دیوار پر چار سنگی تصاویر ایسی ترشی ہوئی ہیں جن کی تفصیل اس مقام پر مناسب معلوم ہوتی ہے۔

۱۔ واراہا اوتار اس گروپ کے بیچ میں وشنو خنزیر نما روپ میں کھڑے ہیں، ان کے چار ہاتھوں میں سے ایک میں چکر دوسرے میں سنکھ تیسرے اور چوتھے سے یہ دھرتی کو سہارا دیے ہوئے ہیں جنہیں انھوں نے دریا کی گہرائی سے نکالا ہے، وشنو کا جو پیر اٹھا ہوا ہے اس کے نیچے ایک پھن دار ناگ اس چیز کو

ظاہر کرتا ہے کہ نیچے پانی ہے، وشنو کے اونچے ہاتھ پر چار ہاتھ اور تین سر والے برہما ہیں جن کے ہاتھ میں ایک پانی کی بوتل ہے، اور ایک ڈاڑھی والا شخص انکے پاس کھڑا ہے، وشنو کے داہنی ہاتھ کی طرف ایک مرد دوسری عورت دونوں ہاتھ جوڑے کھڑے ہیں، اسی طرف کے گوشہ میں سورج کا دیوتا ہاتھ جوڑے ہے اسکے چہرہ کے گرد ہالہ بنا ہے۔

۲۔ وامن اوتار

اس میں وشنو بونے کے اوتار لئے ہیں، ان کے آٹھ ہاتھ ہیں اور ان کا بایاں پیر آکاس کی طرف اس لئے اٹھا ہوا ہے کہ اندرا کی خاطر وہ اپنے تین مشہور قدم اٹھانا چاہتے ہیں جس میں انھوں نے راجہ بلی کو پاتال میں پہنچا دیا تھا، اپنے آٹھ ہاتھوں میں وہ چکر، سنکھ، خنجر، تلوار، ڈھال اور کمان لئے ہوئے ہیں، اوپر کا ایک ہاتھ کائنات کی چھت پر لٹکا ہوا ہے اور دوسرے سے وہ برہما کی طرف اشارہ کر رہے ہیں جو کنول کے سنگھاسن پر بیٹھے ہوئے ہیں، برہما کے بھی چار ہاتھ اور تین چہرے ہیں، وہ ایک ہاتھ سے وشنو کے پیر کو اور دوسرے سے ان کی اٹھی ہوئی انگلی کو احتراماً چھو رہے ہیں، برہما کے سر کے پاس ایک شخص جس کا منھ سگتے کا سا ہے، مصروف پرواز ہے، اس شخص کا بایاں ہاتھ برہما کیطرف ہے اور اس کے داہنے ہاتھ میں ایک مختصر سا ڈھولک ہے، ایک اور دیوی چار ہاتھ والی، کنول کے تخت پر براج رہی ہے، سیدھی جانب ایک شخص اوندھا گرتا ہوا دکھائی دیتا ہے، یہ راجہ بلی ہے جو وشنو کا تیسرا قدم ان کے سر پر پڑنے کی وجہ سے پاتال کا رخ کر رہا ہے، جو چار اشخاص نیچے بیٹھے ہیں یہ بلی کے مصاحب ہیں، جو اپنے راجہ کے انجام پر متحیر ہیں کہ ایک پست قامت برہمن نے، ترِی وِکرم کا روپ لے کر

کس طرح بلی کو تحت الثریٰ تک پہنچا دیا۔

۳- لکشمی (زوجہ وشنو) اس میں دیوی کو عریاں بنایا ہے جس کے دو ہاتھ ہیں، وہ ایک ایسے کھلے ہوئے کنول کے تخت پر بیٹھی ہے، جو سمندر سے نکلا ہے، لکشمی کے دونوں ہاتھوں میں کنول کی کلیاں ہیں اور سر پر مکٹ مخروطی شکل کا ہے، چار برہنہ گوپیاں، لکشمی کے ساتھ کنول کی کلیاں اور پانی کے ظروف لئے کھڑی ہیں، پیچھے دو ہاتھی دیوی کے سر پر پانی ڈالنے کے لئے سونڈھ نکالے ہوئے ہیں۔

۴- درگا اس تصویر میں درگا مائی کا مجسمہ تیر کی طرح سیدھا کھڑا ہے، اس کے چار ہاتھ ہیں اور وہ ایک کنول نما تپائی پر، چتر کے نیچے کھڑی ہے، اسکے ہاتھوں میں سنکھ اور چکر ہے، لکشمی کے دونوں طرف جو چار انسان نما پرندے اڑ رہے ہیں، ان میں سے ایک کے ہاتھ میں گگری ہے، داہنی طرف ہرن کا سر اور بائیں طرف ببر کا سر نظر آتا ہے، آخر الذکر درگا کی سواری کا جانور ہے، داہنے اور بائیں دو مرد پرستار بیٹھے ہیں، بائیں طرف والا تلوار سے اپنے سر کے کیس کاٹ رہا ہے تاکہ وہ دیوی کو نذر چڑھائے، داہنی طرف والا اپنا سیدھا ہاتھ نمسکار کیلئے اٹھائے ہوئے ہے۔
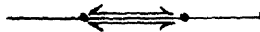
دی حیدرآباد آلوین میٹل ورکس لمیٹڈ

ہم مضبوط فولادی سامان کے صناع ہیں۔ اس کے علاوہ دفتر کا سامان مثلاً تجوریاں اور بنک لاکرس بھی ہمارے یہاں تیار ہوتے ہیں۔ نیز ہم اسٹرانگ روم۔ ڈورس اور کٹلری وغیرہ کا سامان بھی تیار کرتے ہیں۔ ہم نے بس کے ڈھانچے تیار کرنے بھی شروع کر دئے ہیں جو استعمال ہونے شروع ہو چکے ہیں۔ رفریجریٹر بھی تیار کئے جاتے ہیں اور عام استعمال کی دیگر اشیا بھی تیار ہو رہی ہیں۔

کارخانہ:۔ انڈسٹریل ایریہ اعظم آباد ——— ٹیلیگرام:۔ آلون۔ فون نمبر (۲۵۴۱)

دی حیدرآباد کیمیکلس اور فرٹیلائزرس لمیٹڈ

ہندوستان میں سب سے بڑی ریاست کے اندر ہماری کیمیاوی اشیا، اور فرٹیلائزر تیار کرنیوالی فرم جو ذیل کے اشیاء مہیا کرتی ہے۔

ایسڈ:۔ سلفورک۔ نائٹرک۔ ہائیڈروکلورک۔ فرٹیلائزرس: سوپر فاسفیٹ اور مکسڈ فرٹیلائزر

سالٹس:۔ سوڈیم سلفیٹ۔ سلفیٹ آف الومینا۔ فیرس سلفیٹ۔ ایم فیرک۔ ایسم سالٹ۔ گلوبر سالٹ

کارخانہ۔ بلم پلی۔ ریلوے سرکار عالی ——— ٹیلیگرام۔ کیمیکل

دی حیدرآباد ابسٹس سمنٹ پراڈکٹس لمیٹڈ

ابسٹس سمنٹ کے جملہ اشیاء کروگیٹیڈ شیٹ۔ فلاٹ شیٹ۔ چانلس پائپس رڈجس۔ ٹائلز وغیرہ وغیرہ

مینجنگ ایجنٹس:۔ خان بہادر احمد علاءالدین کمپنی

رجسٹرڈ آفس ۲۱۶ بی توپ کا سانچہ
حیدرآباد دکن

ہماری

آزادیٔ ہند کی دوسری سالگرہ کا علمی پیشکش

سنسکرت زندہ زبان ہے!

۱۵۔ اگست سنہ ۱۹۴۹ء

ہندوستان کے آزاد ہونے سے قبل یہ خیال عام تھا کہ سنسکرت مردہ زبان ہے اور مدت ہوئی کہ اس کے بولنے والے دنیا سے اُٹھ گئے۔ اب اس کی ہستی فقط ویدوں اور شاستروں ہی میں مقید ہے، اسے زندہ زبانوں میں شمار کرنا واقعیت سے انکار کرنا ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ سنسکرت مردہ نہیں بلکہ زندہ جاوید زبان ہے اور پُرانی زبانوں میں یہی ایک ایسی زبان ہے جو اس وقت تک تمام دنیا کے علمی حلقوں میں مقبول عام ہے۔

سنسکرت کی فصاحت بیان نہایت ارفع اور بلاغت کلام بہت بلند ہے۔ اس کی لطافت سب سے شاندار اور شستگی عدیم المثال ہے۔ سنسکرت لٹریچر کی جامعیت اور وسعت دنیا کی ادبیات میں سب سے نرالی ہے۔ خیال اور معاشرت کا کوئی شعبہ اس سے علیحدہ نہیں رہا۔ اس کی قدامت ارباب تحقیق کے تجسس اور دماغ سوزی کے لئے ایک دلچسپ مسئلہ بنی ہوئی ہے۔ یونانی اور لاطینی جو اس کی بیٹیاں سمجھی جاتی ہیں عرصہ ہوا نیست و نابود ہو چکی ہیں، ان کے بولنے والے مدت ہوئی دنیا سے اُٹھ گئے مگر سنسکرت کے بولنے اور ویدوں کی رچائیں روایتی طریقہ سے پڑھنے والے نہ صرف سرزمین ہند ہی میں پائے جاتے ہیں بلکہ دنیا کے تمام مہذب ملکوں میں سنسکرت کے شائق طلبا اور استاد موجود ہیں سنسکرت کا چرچا آج بھی ایسا ہی ہے

جیسا سکندرِ اعظم کے حملۂ پنجاب کے وقت تھا۔ اُس نے ہزاروں انقلابات دیکھے، قومیں قعرِ ضلالت سے نکلیں، اقبال کے ساتویں آسمان پر سرفراز ہوئیں، کبر و نخوت کا تماشا دکھایا، پھر عدم آباد کو سدھار گئیں سلطنتیں سربلند ہوئیں، اغیار کو پامال کیا، زوال سے دوچار ہوئیں، پھر ہمیشہ کے لئے مٹ گئیں، مگر سنسکرت اپنی جگہ پر بدستور قائم ہے۔

اس کا ستارۂ اقبال ابھی تک آسمانِ شہرت پر چمک رہا ہے۔ مغرب اور مشرق کی تمام یونیورسٹیوں میں اس کا بڑا چرچا ہے ہزاروں طلبا بڑے شوق سے اس کی تحصیل میں مشغول ہیں۔ صدہا استاد نہ صرف اعلیٰ تعلیم گاہوں ہی میں اس کی تعلیم دینے میں مصروف ہیں بلکہ بڑی دماغ سوزی اور سینہ کاوی سے اس کی تحقیقاتیں کر رہے ہیں ہندوستان میں اس کا چرچا سب سے زیادہ ہے۔ برہما۔ سیام۔ چین۔ جاپان۔ فلپائن جاوا۔ آسٹریلیا کی یونیورسٹیوں نے اس کے ہزاروں ماہر پیدا کئے۔ اس وقت بھی سنسکرت کے پُرانے قلمی نسخوں کی نقل اور اشاعت کا کام صدہا کتب خانوں میں ہو رہا ہے اور استادان سنسکرت کی تحقیقات کے نتائج انگریزی، فرانسیسی اور جرمن زبانوں میں شائع ہوتے ہیں۔ قابل قدر پرانی کتابوں کے ترجمے دنیا کی تمام علمی اور ترقی یافتہ زبانوں میں ہو رہے ہیں۔ مستند کتابوں کے مختلف نسخوں کا مقابلہ بڑی احتیاط سے کر کے صحیح اور مستند اڈیشن مرتب کئے جاتے ہیں۔ سال بہ سال سنسکرت کے مطالعہ اور تحقیقات سے دلچسپی بڑھتی جاتی ہے۔ پُرانے نسخوں کی تلاش میں بڑی سرگرمی ظاہر ہو رہی ہے اور ان کے حصول میں دولت صرف کی جاتی ہے۔ اور اس میں ذرا بھی کلام نہیں ہے کہ مہذب دنیا کے اربابِ تحقیقات السنہ کی جتنی تعداد سنسکرت کے کام میں مصروف ہے یونانی، لاطینی وغیرہ پُرانی زبانوں کے کام میں اس کا

عشر عشیر بھی نہیں ہے۔ جن نازک خیال اور بالغ خردرشیوں نے ویدمنتر بنائے تھے اور جو قواعد انھوں نے ان کی صحیح قرأت کے مرتب کئے تھے، ان کی اولاد میں ہزارہا پنڈت ایسے موجود ہیں جو آج بھی اپنے ابتدائی بزرگوں کی طرح اور انہیں کے انداز کے مطابق ویدمنتر پڑھتے رہتے ہیں۔ ایلیڈ اور آڈیسے (یونانی) اور ورجل (لاطینی) کی رزمیہ نظمیں صحت و درستی سے پڑھنے والا ایک بھی نہیں ہے۔ یعنی مغرب کی ان تینوں مقبول عام رزمیہ تصنیفات کے مصنفوں کے ہم قوم اور ہم زبان عرصہ ہوا کہ دنیا سے رخصت ہو گئے۔ اس وجہ سے یورپ کے مختلف ملکوں کے علمائے یونانی و لاطینی اپنے اپنے میلان طبع کے مطابق تلفظ کرتے ہیں۔ لیکن وید، ویدانگ، براہمن، گرنتھ درشن اور دھرم شاستر صحت سے پڑھنے اور درست تلفظ سیکھنے کے واسطے ہزار ہا آدمی غیر ممالک سے ہند کے پنڈتوں اور وِدوانوں کے پاس آتے ہیں۔

مغرب کے مشہور مستشرقین کی آرا سے یہ واضح ہوتا ہے کہ سنسکرت ایک زندہ جاوید زبان ہے۔ پروفیسر اے، اے۔ میکڈانل آکسفورڈ یونیورسٹی کے نہایت ممتاز ماہر سنسکرت تھے انھوں نے سنسکرت کے تعلق سے لکھا تھا کہ:۔

> "فی زمانہ سنسکرت ہزاروں براہمنوں کی زبان ہے، جو اس سے بلا تکلف اظہار خیال کا کام لیتے ہیں۔ علمی مطالب اسی کے ذریعہ سے ادا ہوتے ہیں۔ رسالے اور کتابیں بھی اسی زبان میں طبع ہوتی ہیں۔ بڑے بڑے کتب خانوں میں پرانی قلمی کتابوں کی نقل ہو رہی ہے۔ زمانہ قدیم بعید کی طرح وید اس وقت بھی حفظ ہوتے ہیں اور پرانے دستور کے مطابق اچارن کئے جاتے ہیں۔ اگر کسی آفت سے تمام مطبوعہ وید

تلف ہو جائیں تو پنڈتوں کے حافظہ سے از سر نو مرتب ہو سکتے ہیں"۔
پروفیسر میکڈانل ایک سے زائد مرتبہ ہندوستان آئے تھے مختلف صوبوں میں،
نامی پنڈتوں سے ملے تھے، تبادلۂ خیال کیا تھا اور چشم دید کوائف حوالۂ قلم کیے۔ ملک

آسٹریا کے مشہور ماہر سنسکرت ڈاکٹر ویٹر نٹیس کی استادانہ رائے بھی پڑھنے کے قابل ہے۔

"کوئی صاحب خود سنسکرت کو مردہ زبان قرار نہیں دے سکتا۔ اسوقت
کئی رسالے ملک ہند میں شائع ہوتے ہیں۔ معرکتہ الآرا مسائل پر بحث
وتحیص ان ہی رسائل کے وسیلہ سے ہوتی ہے۔ مہا بھارت بر سر
عام بآواز بلند پڑھی جاتی ہے، جو اس امر پر دال ہے کہ سامعین میں
بعض لوگ اُسے تھوڑا بہت سمجھتے ہیں جب میں نے شانتی نکیتن مدرا
راکشش اور رام چرت کے پرانے ڈرامے ٹھیٹھ سنسکرت میں دیکھے جو
وہاں کے طلبا نے مردوں اور عورتوں کے ایک شاندار مجمع میں دکھائے
تھے تو مجھے یہ دیکھکر مسرت آمیز حیرت ہوئی کہ سامعین سنسکرت کے مکالمہ
کا لطف اُٹھاتے اور اس کا اظہار کرتے ہیں۔ اب بھی سنسکرت میں قصیدے
کہے جاتے ہیں، کتابیں لکھی جاتی ہیں۔ بڑے بڑے ودوان اسی
زبان میں نازک اور پیچیدہ مسائل پر بحث کرتے ہیں"۔

ماہر موصوف بھی اور ممتاز ماہروں کی طرح ہندوستان کے ہر صوبہ میں سیاحت کر چکے
ہیں۔ جو کچھ آپ لکھتے ہیں وہ ذاتی تجربہ کی بنا پر لکھتے ہیں، اس وجہ سے ان کی رائے
بہت وقیع ہے۔

علاوہ بریں یہ بات بھی قابل لحاظ ہے کہ اس وقت، ہندوستان میں ہر سال

سنسکرت کی سیکڑوں کتابیں شائع ہوتی ہیں۔ دھرم شاستر، ویاکرن، ڈراما، ادبیات اور فلسفہ پر مستند کتابیں چھاپی جاتی ہیں سنسکرت کی ترقی کے واسطے امن وسکون کی فطری ضرورت ہے، اگر اس کی تاریخ پر نگاہ ڈالی جائے تو ظاہر ہوتا ہے کہ قدیم الایام سے سنسکرت کی تمام معرکتہ الآرا اور غیر فانی کتابیں ایسے زمانہ میں تصنیف ہوئی تھیں جب ملک میں چاروں طرف امن کا دور دورہ تھا۔

یہ بات بھی غور کرنے کے لایق ہے کہ زبان سنسکرت کے جتنے قلمی نسخے اس وقت ملک ہند اور دوسرے ملکوں میں پائے جاتے ہیں۔ دنیا کی باقی متروک ومہذب زبانوں کی کتابیں مجموعی طور پر اس کا پاسنگ بھی نہیں ہوں گی۔ اس سے ایک طرف تو سنسکرت کی زیست اور ہمہ گیری ظاہر ہے اور دوسری طرف اسلاف ہند کی علم پرستی اور ذوق شُستہ عیاں ہوتا ہے۔ اس جگہ ضرور پرانے قلمی نسخوں کا مختصر ذکر کیا جاتا ہے۔ جو دنیا کے بڑے بڑے کتب خانوں میں موجود ہیں۔ یہاں پر اس بات کا ذکر کرنا غیر موزوں نہ ہوگا، کہ ایشیائے وسطی کے وحشیوں نے جن میں ہُن سب سے بڑھے ہوئے تھے نہ صرف شاندار مندر اور سربفلک محل مسمار اور منہدم کرکے اپنی فطری وحشت کا اظہار کیا تھا بلکہ کتب خانے بھی جلادئے تھے اور بیش بہا کتابیں ضائع کردی تھیں جن کے حوالے دوسری کتابوں میں ملتے ہیں، اس کے باوجود لاکھوں کتابیں تباہی وغارتگری سے بچ گئی تھیں جو اب دنیا کے شاندار کتب خانوں کی مایۂ ناز ہیں۔ ہزارہا کتابیں اغیار لے گئے۔ انگریز مؤرخ وی۔ اے اسمتھ رقمطراز ہے کہ ۶۴۵ء میں مشہور چینی سیاح ہیون تسانگ چھ سوستاون قلمی نسخے کئی اونٹوں پر لاد کر ملک چین کو لے گیا۔ یہ غالباً بودھ مت کی کتابیں تھیں، لیکن ان کے مثنیٰ

تلاش کرنا محال ہے اسی طرح ایک اور انگریز کا بیان ہے کہ" لاسا پایہ تخت کے بڑے لامہ کے کتب خانے میں سنسکرت کی ہزارہا قلمی کتابیں موجود ہیں۔ جو ملک ہند کے بودھ پرچارک، پدم سم بھب اور اس کے ساتھیوں کی وساطت سے وہاں پہنچا گئی تھیں"۔ چین کے عالم عرصہ دراز سے علوم ہند سے بے حد دلچسپی ظاہر کرتے چلے آتے ہیں، اس وجہ سے وہاں پر ہزارہا کتابیں سنسکرت کی موجود ہیں۔ علاوہ ازیں جاپان ہندچینی سیام اور جاوا و سماٹرا کے کتب خانوں میں بھی کئی ہزار قلمی نسخے پائے جاتے ہیں۔ مہابھارت اور راماین اور گیتا کی کتھا خاص تقریبوں پر کی جاتی ہے کئی ماہروں کا بیان ہے کہ جاوا و سماٹرا میں جو مشہور دھارمک کتابیں اب پائی جاتی ہیں وہ ملک ہند کی مستند پرانی کتابوں سے کچھ مختلف ہیں۔ گویا ملک ہند کے علاوہ قرب وجوار کے ایشیائی ملکوں میں بھی سنسکرت کے ہزاروں قلمی نسخے پائے جاتے ہیں۔ مگر ان کی معتبر فہرستیں موجود نہیں ہیں۔ البتہ ملک ہند اور یورپ کے مشہور کتب خانوں کے سنسکرت کے نسخوں کی فہرستیں مرتب ہو گئی ہیں۔ ذیل کے اعداد انہیں فہرستوں سے ماخوذ ہیں۔

یورپ کے جن عالموں نے بھارت سنسکرت کے واسطے دُور و نزدیک شہرت حاصل کر رکھی تھی ان میں میکس مولر کا نام سب سے ممتاز اور بہت وسیع ہے۔ اس نے ۱۸۵۹ء میں آکسفورڈ کے طلبا کے سامنے ہندوؤں کے علمی کارناموں پر لکچر دیتے ہوئے یہ بیان کیا تھا کہ" سنسکرت کے قلمی نسخوں کا شمار دس ہزار ہے جو یونانی اور اٹلی کی پرانے زمانہ کی کتابوں کے مجموعہ سے کہیں زیادہ ہیں"۔ یعنی میکس مولر کے زمانہ میں سنسکرت کی پرانی کتابوں کی تعداد یونانی اور لاطینی زبانوں کی قلمی کتابوں سے بیسوں گنا زیادہ تھی۔ یہ نو دس سال پہلے کی کیفیت ہے۔ اس کے بعد بہت وسیع

تحقیقات ہوئی بیسوں آدمی دنیا کے بڑے بڑے کتب خانوں کی طرف سے نادر الوجود
قلمی نسخوں کی تلاش میں ملک کے ہر حصے میں مارے مارے پھرتے ہیں۔ اسی طرح
ہزار ہا نرالی کتابیں دستیاب ہو چکی ہیں۔ جن کی ہستی کا میکس مولر کے زمانہ میں
گمان بھی نہ تھا۔ برسوں کی تلاش و تحقیقات سے یہ ظاہر ہے کہ ملک میں لاکھوں قلمی
کتابیں مختلف کتب خانوں میں بحفاظت رکھی ہیں۔ آج سے اٹھارہ سال پہلے
پنجاب یونیورسٹی کے کتب خانہ کے شعبۂ سنسکرت میں چھ ہزار تین سو قلمی کتابیں موجود
تھیں۔ ڈی۔ اے۔ وی کالج لاہور کی سنسکرت لائبریری میں چھ ہزار چار سو نسخے تھے۔
کوئن کالج بنارس کا کتب خانہ دنیا میں سب سے بڑا ہے جہاں پینتالیس ہزار قلمی
کتابیں موجود ہیں، اور یہ ہندوؤں کے مشہور مقدس شہر کے شایانِ شان ہے کہ
وہاں ادبیات سنسکرت کا سب سے بڑا ذخیرہ ہے۔ سارے ملک کے طلبا دوہاں
علمی پیاس بجھانے کو جاتے ہیں۔ ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ کے کتب خانے میں ہر قسم کے
علوم کی سنسکرت کی قلمی پرانی کتابوں کی تعداد چھبیس ہزار ہے۔ سنسکرت ساہتیہ پریشد
کلکتہ میں پانچ ہزار نسخے تھے۔ بریندر ریسرچ سوسائٹی راج شاہی کے کتب خانے میں
بھی پانچ ہزار قلمی کتابیں موجود تھیں۔ اورنٹیل لائبریری مدراس کے شعبۂ سنسکرت میں
تیس ہزار پرانی کتابیں ہیں۔ تنجور کے شاہی کتب خانے میں بارہ ہزار، تریونڈرم کے
شاہی کتب خانے میں دس ہزار، میسور کے شاہی کتب خانہ میں سولہ ہزار، بھنڈارکر
انسٹی ٹیوٹ پونا کے کتب خانے میں تیس ہزار، یونیورسٹی لائبریری بمبئی کے شعبۂ سنسکرت
میں دو ہزار، ایشیاٹک سوسائٹی بمبئی کے کتب خانہ میں آٹھ ہزار، کتب خانہ دربار
بڑودہ میں سولہ ہزار قلمی کتابیں موجود ہیں۔ علاوہ ازیں دربار لائبریری بیکانیر میں

پانچ ہزار، اور الور میں چھ ہزار، اور دربار لائبریری جموں میں بارہ ہزار قدیم قلمی کتب ہیں۔ اس کے سوا جے پور، اودے پور، جودھ پور اور دیگر ریاستوں کے سرکاری کتب خانوں میں بھی ہزار ہا پرانی قلمی کتابیں موجود ہیں۔ مگر مذکورہ صدر کتب خانوں کی کتابوں کا شمار بھی ڈھائی لاکھ کے قریب ہے۔ دربار نیپال کے کتب خانے میں ہزار ہا پرانی کتابیں بھوج پتر، چرم اور تاڑ کے پتوں پر لکھی ہوئی موجود ہیں۔ ۱۹۰۵ء میں وزیر اعظم نیپال نے پانچ ہزار جلدیں آکسفورڈ یونیورسٹی کی نذر کی تھیں۔ علم دوست رؤسا اور امرا، نیز پنڈتوں کے پاس ہزار ہا پرانی قلمی کتابیں مختلف علوم و فنون پر موجود ہیں جو ہمارے شمار سے باہر ہیں۔ اگر ملک ہند میں سنسکرت کی قلمی کتابوں کا شمار پانچ سات لاکھ کے درمیان سمجھا جائے تو راستی سے بعید نہ ہوگا۔

265

یورپ کے کتب خانوں کا حال یہ ہے کہ مشہور عالم سنسکرت کول برک نے بڑی کوشش اور تندھی سے ایک لاکھ روپیہ خرچ کر کے شاندار کتب خانہ مہیا کیا تھا جسے وہ پنشن لینے کے بعد ولایت لے گیا اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے حوالہ کر دیا۔ اس ذخیرہ میں بہت نایاب اور قابل قدر کتابیں تھیں جو وزیر ہند کے کتب خانہ کے شعبۂ سنسکرت میں شامل ہیں، ان کا شمار بیس ہزار ہے۔ عجائب خانہ برطانیہ کے شعبۂ سنسکرت میں چار ہزار اور آکسفورڈ یونیورسٹی کے کتب خانہ میں اٹھارہ ہزار قلمی نسخے ہیں۔ کیمبرج یونیورسٹی کے کتب خانہ میں پانچ ہزار پرانی نایاب کتابیں سنسکرت کی موجود ہیں۔ پیرس کا کتب خانہ بہت شاندار ہے جس کے شعبۂ سنسکرت میں دس ہزار نسخے موجود ہیں۔ مگر یورپ میں پرانی سنسکرت کتابوں کا سب سے بڑا ذخیرہ برلن (پایۂ تخت جرمنی) میں ہے جہاں تیس ہزار قلمی نسخے موجود ہیں۔ ان میں بہت سی

دستی کتابیں ایسی ہیں جو آج کل کُلیتہً نایاب ہو گئی ہیں۔ اس سے یہ ظاہر ہے کہ جرمنی کے ارباب تحقیقات علوم ہند سے کتنی دلچسپی لیتے تھے۔ میونک اور کیمبرک کی یونیورسٹیوں میں دو دو ہزار پُرانی قلمی کتابیں پائی جاتی ہیں۔ پایہ تخت روس کے سرکاری کتب خانے کے شعبۂ شرقیہ میں دس ہزار نسخے سنسکرت کے موجود ہیں۔ وائنا صدر آسٹریا کے کتب خانے میں چار ہزار قلمی کتابیں بیان کی جاتی ہیں۔ اٹلی۔ ہالینڈ۔ بلجیم کی تعلیم گاہوں کے کتب خانوں میں بھی بہت سی سنسکرت کی کتابیں پائی جاتی ہیں۔ لیکن جن بڑے بڑے کتب خانوں کا اوپر ذکر آیا ہے اُن کے ذخائر سنسکرت کی فہرستیں مرتب ہو چکی ہیں جن کا مجموعی شمار ایک لاکھ سے زیادہ ہے۔ اب یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ملک ہند اور یورپ کے کتب خانوں میں ساڑھے تین لاکھ قلمی کتابیں موجود ہیں۔ امریکہ کی یونیورسٹیوں کے کتب خانوں میں جو ہزار ہا سنسکرت کی کتابیں پائی جاتی ہیں اُن کا کوئی حساب نہیں ہے اور نہ دنیا کی اور یونیورسٹیوں کے ذخائر سنسکرت کا کوئی مناسب تخمینہ مرتب کیا گیا ہے۔ ہمارے خیال میں ملک ہند، ایشیا، یورپ، امریکہ اور دیگر ملکوں کی یونیورسٹیوں کے کتب خانوں میں ہر قسم کی قلمی سنسکرت کی کتابیں آٹھ لاکھ کے قریب ہوں گی۔ اور یہ بات دعوے کے ساتھ بیان کی جا سکتی ہے کہ زبان سنسکرت کی ہمہ گیری جیسا کہ اس کے ان گنت قلمی نسخوں سے ظاہر ہوتا ہے اپنی نظیر آپ ہے۔ دُنیا کی کوئی پُرانی زبان اس لحاظ سے سنسکرت کی برابری کا دعویٰ کرنے کی جرأت نہیں کر سکتی۔

اس کے علاوہ علوم جدیدہ پر بھی سنسکرت کے بے حد احسانات ہیں، اس کا ثبوت بھی مشہور ماہران مغرب کے اقوال ذیل سے ملے گا۔ جو اس انقلاب عظیم کو بہ خوشی

تسلیم کرتے ہیں جو مغرب میں علوم سنسکرت کی اشاعت کے طفیل میں رونما ہوا ہے۔

تاریخ تمدن کے دور جدید کا آغاز علوم ہند کے انکشاف سے ہوتا ہے جس سے ارباب تحقیق کے تمام مسلمہ تصورات تہ و بالا ہوگئے ہیں اور کئی نئے علوم کی بنیاد پڑی ہے اضلاع متحدہ کے ماہر سنسکرت پروفیسر ایم۔ بلوم فیلڈ اس انقلاب عظیم کی نسبت جو سنسکرت کے طفیل میں اقلیم سائنس میں واقع ہوا ہے۔ لکھتے ہیں کہ

"جب سے یونانی اور لاطینی زبان اور اُن کی ادبیات کا مطالعہ اور تحقیقات شروع ہوئی ہے تاریخ تمدن میں ایک بھی ایسا معرکۃ الآرا واقعہ پیش نہیں آیا ہے۔ جیسا اٹھارویں صدی کے آخری حصے میں علوم سنسکرت کا انکشاف ہے۔ لسانیات اور تاریخ کا کوئی شعبہ ایسا نہیں ہے جس پر علوم سنسکرت کا انقلاب خیز اثر نہ پڑا ہو۔ علوم ہند قدیم کے مطالعہ اور تحقیقات سے ہند و یورپی تاریخ کے ابتدائی زمانہ پر بہت گہری روشنی پڑی ہے السنہ اضافی کا نظریہ اسی کی بدولت معرض وجود میں آیا ہے۔ لسانیات وصنمیات نسبتی، مذاہب اصنافی قانون۔ مختلف شعبہ جات تاریخ و فلسفہ یا تو اسی سے برآمد ہوئے ہیں یا اس کی تحقیقات کے قابل قدر نتائج سے ان کی قلب ماہیت ہوئی ہے۔ اور ان پر مستقل اثر رونما ہوا ہے۔"

برطانیہ کے ماہر سنسکرت پروفیسر رالپسن کا قول ہی قابل لحاظ ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ

"انیسویں صدی کے ارباب تحقیق نے زبان سنسکرت کو لاطینی۔ یونانی فارسی اور دیگر یورپی زبانوں کا مبدء قرار دیا تھا۔۔۔۔ اسکی بدولت

ہند یورپی قوموں کی جو چینی ترکستان سے ائر لینڈ تک آباد ہیں، تاریخ
تمدن کے ابتدائی زمانہ پر معتد بہ روشنی پڑتی ہے، کیونکہ مشابہت زبان
اور معاشیات اور معتقدات کی نوعیت اس سے ظاہر ہوتی ہے۔ سنسکرت
کے مطالعہ سے انسان کی زبان کا تصور کہنہ قطعاً بدل گیا ہے۔ علوم ہند
قدیم کے مطالعہ سے پرانے زمانہ کے تمدنی حالات منکشف ہوتے ہیں۔
ان کا اثر اہل مغرب کی عقلی زندگی اور ان کے ذہنی مشاغل پر بھی بہت
گہرا پڑا ہے۔"

مغرب کے یہی دو ماہر ایسے نہیں ہیں جو سنسکرت کے مطالعہ کے معرکۃ الآرا نتائج
کے قائل ہیں بلکہ مشہور پروفیسر اے۔ اے۔ میکڈانل اسکے معترف تھے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں

"احیاء العلوم کے بعد تاریخ تمدن میں ایسا کوئی واقعہ عالمگیر اہمیت کا
واقع نہیں ہوا جیسا کہ علوم سنسکرت کا انکشاف ہے۔ السنہ، مذاہب،
عقلی مشاغل کے کوائف اور پرواز فکر کے کارنامے اسی زبان کی کتابوں
میں بھرے پڑے ہیں۔ ہندوؤں کا سارا تمدن اسی میں مقید ہے۔
علم سنسکرت سے السنۂ اضافی کی اور ویدوں کی زبان سے صنمیات
نسبتی کی بنیاد پڑی ہے۔ گو اس انقلاب اہم کا اثر علوم کے تمام شعبوں
میں رونما ہو رہا ہے۔ مگر سب سے بڑی تبدیلی فلسفہ اور مذاہب میں
نمایاں ہوئی ہے۔"

ڈاکٹر ونیٹرنیٹس ایک، بلند مرتبہ مستشرق اور پراگ یونیورسٹی (بوہیمیا) کے مشہور
استاد سنسکرت تھے، آپ کی رائے یہ ہے۔

"ملک ہند کے قدیم ادبیات کے مطالعہ سے پُرانی اور نئی زبانوں کی مناسبت باہمی واضح ہوئی، جس سے تاریخ تمدن کے دورِ جدید کا آغاز ہوتا ہے۔ اس کے وسیلہ سے قوموں کے مقدم التاریخ تعلقات بخوبی ظاہر ہوتے ہیں۔"

ان مشاہیر استادوں نے سنسکرت اور علوم جدیدہ پر عرصہ کی جامع ومانع تحقیقات کے بعد اپنی مُسلّمہ رائے کا اظہار کیا ہے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ سنسکرت لٹریچر کے مغرب میں مشتہر ہونے سے اقلیم سائنس میں بہت بڑا انقلاب رونما ہوا۔ السنۂ اضافی ومذاہب نسبتی صنمیات اور دیگر علوم کی ترقی وتوسیع کو سنسکرت سے بہت مدد ملی۔ پروفیسر اے۔ اے۔ میکڈانل کی ایک اور رائے کو یہاں پیش کرنا ضروری ہے جس سے سنسکرت کا احسان جو اس نے تاریخ آدم پر کیا، ظاہر ہوتا ہے۔ عالی دماغ اور مستقل مزاج ماہران علوم سنسکرت کی دماغ سوزیوں اور عرق ریزیوں سے ہندو تمدنی کمالات کی ۳ ہزار سالہ صحیح اور معتبر تاریخ برآمد ہو کر مرتب ہوگئی۔ السنہ۔ مذاہب۔ ادبیات۔ علوم وفنون اور اسلاف ہند کے صدہا سال کے معاشرتی حالات اور رسم ورواج کا مسلسل احوال صحت ودرستی سے قلمبند کیے جانے کا مواد بہم پہونچ گیا۔ ادبیات سنسکرت کی چھان بین سے تاریخ ہند قدیم پر بھی بہت مفید اثر پڑا ہے اس کے اوراق پریشاں کی صحیح ترتیب کا بہت کارآمد مسالہ بہم پہونچ گیا ہے۔ اب سے چالیس سال پہلے جو تاریخ نصاب میں شامل تھی اس کا سب سے پُرانا اور معتبر واقعہ سکندر اعظم کا حملۂ پنجاب تھا۔ جو ۳۲۶ ق۔م کا واقعہ ہے۔ مگر پچھلے چالیس پچاس سال کے عرصہ میں جو تحقیقات ادبیات سنسکرت اور پالی زبان کی کتابوں کی ہوتی چلی آئی ہے۔ اس سے بیش قیمت

نتیجہ مرتب ہوا ہے کہ "معتبر تاریخ ہند کا زمانہ" ماہران تاریخ ہند نے اتفاق رائے سے سن عیسوی سے چھ سو برس پہلے قرار دیا ہے۔ "کیمبرج ہسٹری آف انڈیا" جلد اول (ہند قدیم) مطبوعہ سنہ ۱۹۲۲ء میں ممتاز مستشرقین نے ہند قدیم کے متعلق متفرق مضامین شائع کئے ہیں جن کی معلومات کلیتہً سنسکرت ادبیات، پالی کتب اور کتبہ جات و سکہ جات کہنہ سے ماخوذ ہیں۔ جن سے تحقیقات جدیدہ کی جامعیت اور قدر و قیمت بخوبی آشکارا ہے۔ پروفیسر بی۔ اے کیتھ (ایڈنبرا) نے نظام تمدن پر جس میں ذات پات کی ابتداء اور جمہور کے مشاغل، معاشرت اور فلسفہ کی ابتدا اور علاقۂ وسطی (مدھ دیش) میں آریہ تمدن کی اشاعت پر تازہ اور نرالے معلومات کی وسعت کے ساتھ بحث کی ہے۔ پروفیسر کارپنٹر (اپسالہ یونیورسٹی ناروے) نے جین مت پر، اور پروفیسر ریس ڈیوڈس نے بدھ مت کی تاریخ اور ملکی حالات، اور مہاتما بدھ کے زمانہ کے اقتصادی حالات اور چندر گپت اعظم کے عہد حکومت کے کوائف قلمبند کئے ہیں۔ امریکہ کے ماہر سنسکرت پروفیسر ای ڈبلو۔ ہاپ کنس نے رزمیہ نظموں اور سوترون سے تمدنی اور پولیٹیکل حالات اور راعی و رعایا کے تعلقات اور معاشرت پر قابل قدر روشنی ڈالی ہے۔ اسی قسم کے اور سودمند مضامین بھی اس قیمتی کتاب میں پائے جاتے ہیں۔ "کیمبرج ہسٹری آف انڈیا" میں جین مت اور بدھ مت کے بانیوں کا زمانہ نہایت معتبر تسلیم کیا گیا ہے۔

مغربی استادوں ہی پر کیا موقوف ہے، ملک ہند کے ارباب تحقیق جنھوں نے مغربی استادوں سے اور نیز مغربی تعلیم گاہوں میں تعلیم پائی ہے۔ سنسکرت لٹریچر کی چھان بین بطور خود کر رہے ہیں انھوں نے ان ہندو حکمرانوں کے حالات مرتب کرنیکی کوشش کی جن کی روایات مہابھارت اور پرانوں میں پائی جاتی ہیں، جین مت کے

بانی سے پہلے جو جو کشتری اقوام مختلف حصوں میں حکمران تھیں ان کے حالات بڑی دماغ سوزی اور تحقیقات سے مرتب کئے ہیں۔ اقتصادیات ہند قدیم فن حکومت اور دیگر مسائل پر معرکتہ الآرا کتابیں تالیف و شائع کی گئی ہیں۔ پروفیسر ابناش چندر داس نے اپنی جامع تحقیقات کا مضمون سب سے نرالا مقرر کیا تھا۔ جو ویدک شائستگی کی ابتدا سے تعلق رکھتا تھا انھوں نے دو معرکتہ الآرا کتابیں شائع کر کے علمی حلقوں میں تہلکہ مچا دیا تھا۔ ماہر موصوف کی جامع تحقیقات سے بنی آدم کی تاریخ سلف کے اوراق منتشر مرتب کرنے کا قابل قدر مواد بہم پہونچ گیا۔ کلکتہ یونیورسٹی کے محقق اس مبارک کام میں اور صوبوں کے ماہروں سے نسبتاً بہت آگے رہے۔ قصہ کوتاہ سنسکرت کے انکشاف سے نہ صرف تاریخ ہند قدیم کے ابتدائی دور ہی کے معلومات مہیا ہوئے بلکہ بنی نوع انسان کی تاریخ قدیم وبعید کے اوراق گم شدہ بھی دستیاب ہوگئے جو بجائے خود ایک نہایت شاندار کارنامہ ہے۔ جو انکشافات سنسکرت کی بدولت مرتب ہوا، اگر زبان سنسکرت کی بہت پرانی کتابوں کا علم حاصل نہ ہوتا۔ تو بنی آدم کی تاریخ تمدن کا دورِ اولین نا بلقدر اور معتبر معلومات سے سراسر ناآشنا رہتا، اور یہ کمی کسی اور وسیلہ سے پوری نہ ہوسکتی تھی، اور انسان کی ترقی تمدن کے نہایت پرانے اور معتبر حالات بہم نہ پہونچ سکتے تھے۔ مشہور ماہر سنسکرت میکس مولر کا یہ قول ہے کہ" وید بنی آدم کے کتب خانے میں سب سے پرانی کتابیں ہیں"۔ اسی وجہ سے ان کی قدر و قیمت کا کما حقہٗ اندازہ ناممکن ہے۔

سنسکرت میں جن علوم و فنون کا ذکر پایا جاتا ہے۔ وہ زمانۂ حال کے ماہران علم تمدن کے نزدیک کیا حیثیت رکھتے ہیں، یہ ایک دلچسپ سوال ہے، جس کا جواب ماہران زمانۂ حال ہی کی زبان سے مناسب ہوگا۔

ماہران وارباب فکر میں بی۔ کڈ نے اپنی زندگی تمدن کے ارتقا اس کے معانی اور لوازمہ کی تشریح کے واسطے مخصوص کر رکھی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ " تمدن کا اطلاق علوم و فنون، طرز حکومت، نظام معاشرت اور با ہمہ گرشائستگی عمل پر ہوتا ہے۔ شائستگی اور تعلیم بھی اسی کے ذیل میں شمار ہوتی ہے۔ اس سے وہ لوازم اور خصوصیات مراد ہوتے ہیں جن کے باعث ہم وحشیوں سے برتر اور ممتاز شمار ہوتے ہیں"۔ پروفیسر جے۔ ایس میکنزی علم تمدن کے مشہور ماہر کی رائے بھی قابل غور ہے:۔"جب انسان ان اغراض سے تحریک پذیر ہوتا ہے جو انانیت اور شائستگی کے متبائن ہوتے ہیں۔ تو ایثار علی النفس کی اہلیت ظہور میں آتی ہے، اور یہ تعلیم کے مترادف ہے جس کے جامع ترین معنی فطرت انسانی کی تکمیل اور پاکیزگی ہے .... ادبیات میں سائنس اور صناعیوں (آرٹ) کے اغراض انتہائی شامل ہیں۔ فن شاعری، مذہب اور شائستگی کا سرتاج فلسفہ ہے جس کا مقصود اولی عالم کے نشیب و فراز پر جامع ومانع نگاہ ڈالنا ہے۔ اس کے طفیل میں شاعری اور مذہب کے اعلیٰ ترین تخیلات میں ربط پیدا ہوتا ہے"۔ پروفیسر میکنزی کے خیال میں ادبیات کے اعلیٰ ترین مقاصد میں سائنس، صنّاعیاں، مذہب اور فلسفہ کے ادق ترین خیالات شامل ہیں۔ شاعری اور مذہب بغیر فلسفہ کے بے جان ہے۔ اب ایک تیسرے نامی ماہر ڈاکٹر جے۔ بی، کروزر کا قول ناطق ہے:"عقل ارادت سے، ارادت تصور سے اور تصور خواہشات اور جذبات سے منسلک اور مربوط ہے .... تمدن مذہب اور فن حکومت پر حاوی ہے سائنس اس کا جزو لاینفک ہے۔ اور ان تینوں کا جو نیک اور سودمند اثر معاشرت پر پڑتا ہے۔ وہ بھی تمدن ہی کے ذیل میں شمار ہوتا ہے .... مذہب کے وسیلہ سے اخلاقی۔ نفسیاتی اور عقلی زندگی میں موافقت اور موانست

پیدا ہوتی ہے، جو اس کے اظہار استمراری کے واسطے لابدی ہے۔ مذہب کی بدولت اضطراب قلبی اور ہیجان باطنی رفع ہوتا ہے۔ اس سے کائنات کی علت حقیقی کی تحقیقات میں ہدایت اور تحریک نصیب ہوتی ہے . . . اس کے وسیلہ سے روح پاکیزگی اور خدا ترسی کی بہترین زندگی بسر کرنے کی قوت اور صلاحیت حاصل کرتی ہے"۔ اور بڑے بڑے ماہروں کے آراء کے اقتباسات بھی پیش ہو سکتے ہیں، مگر ہمارے موجودہ مقصد کے واسطے اسی قدر کافی ہیں۔ اگر مغرب کے مشہور ارباب فکر اور ماہران علم تمدن کے مسلّمہ معیار کی رو سے ادبیات سنسکرت پر گہری نگاہ ڈالی جائے تو یہ واضح ہوتا ہے کہ اہل سنسکرت کے علمی کارنامے جو ایسے زمانہ میں انجام پذیر ہوئے تھے جب زمانہ حال کی متمدن قوموں کے اجداد لوازم شائستگی سے محروم اور ضروریات تمدن سے بیگانہ تھے تو ان کارنمایاں کے واسطے سوائے تحسین و آفرین کے اور کیا زبان سے نکل سکتا ہے! مغرب کے مشہور ماہران معاشیات اور استادان (لسانیات) کا اس امر پر اتفاق ہے کہ مذہب ہر قسم کی ترقیوں کا محرک اعظم ثابت ہوا ہے۔ پرانے زمانہ کے آریہ ہندوؤں کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے مذہب ایجاد کیا تھا جو رگ وید میں مذکور ہے۔ فلسفیانہ تخیلات بھی اسی پرانی اور مقدس کتاب میں پائے جاتے ہیں۔ نہ صرف یہی ان کا بہترین کارنامہ ہے بلکہ انھوں نے دنیا کی نہایت کامل شستہ اور جامع زبان بھی اختراع کی جو ان کے بیش بہا خیالات کی حامل بنی۔ انھوں نے ان خیالات کو پاکیزگی کے ساتھ پردۂ شعر میں ظاہر کیا۔ گویا بہترین زبان کے ساتھ فن شاعری کے بھی وہی موجد ہوئے۔ ویدوں کی رچاؤں کے پڑھنے کے قواعد بھی بنائے صرف و نحو کا کمال سب سے نرالا ہے۔ پانینی سے بڑھکر عالی دماغ کوئی موجد گرامر

دنیا میں نہیں گزرا، اگر سنسکرت کے دینوی علوم و فنون کے لٹریچر پر نگاہ ڈالی جائے تو ظاہر ہوتا ہے کہ اسلاف ہند قدیم کی ہمہ گیر قابلیت سے کوئی بات اور کوئی مسئلہ باقی نہ رہا۔ وہ ریاضیات اور فلکیات کے تمام شعبہ جات پر حاوی تھے، طب اور خواص الادویہ (جس میں جانوروں کے امراض و علاج کا طریقہ بھی شامل ہے) اور فن دوا سازی، فن شاعری کے تمام نمونے اور ہر قسم کے ڈرامے اور قصے موجود ہیں۔ ادبیات پر خواہ کتنی ہی جامع دماغ نگاہ ڈالیئے، سنسکرت لٹریچر ہر ایک کسوٹی پر پورا اترتا ہے۔ زمانۂ قدیم بعید کے ہندوؤں نے لوازم تمدن ایجاد کیئے ان کی اشاعت میں سرگرمی دکھائی، ہندوستان کے باہر لنکا، جزائر جاوا و سماٹرا، ملایا، سیام، ہند چینی، چین، تبت، ترکستان وغیرہ ملکوں میں ہندو تمدن کا اثر اب تک نمایاں ہے۔ اکثر ممتاز ماہرین کا خیال ہے کہ ایران، بابل، ایشیائے کوچک، یونان کا تمدن پرانے ہندو آریہ تمدن سے مستعار لیا گیا تھا۔ اس لحاظ سے اہل سنسکرت علمبرداران تمدن کہلانے کے ہر طرح مستحق ہیں۔ ہندو آریہ بزرگوں کا سب سے بڑا کمال تمدنی و ویدک شائستگی اور سنسکرت کا عجیب و غریب لٹریچر تھا جس نے علوم جدیدہ کی کایا پلٹ دی تھی۔

مبارک

آزادئ ہند کی دوسری سالگرہ کا علمی پیشکش

ہندوستان کے آثار قدیمہ

(از)

مسٹر غلام یزدانی (ام اے) سابق ناظم آثار قدیمہ

۱۵- اگست سنہ ۱۹۴۹ء

آریائی تہذیب کی جھلک ہم کو ان کی مقدس کتابوں میں ملتی ہے ۔ اس نسل کے لوگ ہندوستان میں کوئی دو ہزار سال قبل از مسیح سے لے کر پندرہ سو سال قبل از مسیح تک یا اس کے بعد بھی آتے رہے ۔ یہ لوگ نہایت ذہین تھے اور مذہبی اور علمی میلان رکھتے تھے ۔ زندگی نہایت سادہ تھی ۔ کھیتی باڑی کرتے تھے اور مویشی چراتے تھے اور گھاس پھوس یا مٹی کے مکانات میں رہتے تھے جیسا کہ اب تک دیہات میں پائے جاتے ہیں ۔ آریائی نسل کے لوگوں کے آنے سے کئی ہزار برس پہلے ہندوستان میں دراوڑی نسل کے لوگ بھی داخل ہو چکے تھے ۔ موجودہ تحقیق کے لحاظ سے ان کا اصلی وطن بحیرۂ روم کے کنارے خیال کیا جاتا ہے ۔ اور ہندوستان میں یہ سندھ کے راستے سے داخل ہوئے تھے کیونکہ بلوچستان میں ایک زبان براہوئی نامی اب تک بولی جاتی ہے جو دراوڑی زبان سے ملتی جلتی ہے ۔ اس نسل کے لوگ آریاؤں کے آنے سے پہلے غالباً ہندوستان کے تمام حصص میں پھیلے ہوئے تھے ۔ لیکن آریاؤں کے آنے کے بعد یا تو بہ حیثیت ادنیٰ پیشہ وروں کے ان کے اطاعت گزار بن گئے یا سمٹ کر جنوبی ہند چلے آئے ۔ جہاں جغرافی رکاوٹوں کی وجہ سے آریائی اثر بہت دیر میں اور بہت کم ہوا ۔

اس موقع پر یہ بیان کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ سندھ کی تہذیب جب پھیلی تو اس وقت غالباً وہاں دراوڑی نسل کے لوگ آباد تھے ۔ اس نظریہ کے باور کرنے

کے وجوہ یہ ہیں کہ سندھ میں جو اس زمانے کی قدیم قبور دریافت ہوئی ہیں وہ دکن اور جنوبی ہند کی قبور سے جہاں دراوڑی قومیں اب تک آباد ہیں ملتی جلتی ہیں۔ علاوہ ازیں بعض صنعت کی چیزیں بھی مثلاً منکے اور ان پر ایک خاص قسم کے سفیدے کا کام دکن اور جنوبی ہند کے قدیم مقامات کی کھدائی میں بکثرت پایا جاتا ہے۔ اور سندھ میں بھی اس قسم کے منکے اور سفیدے کا کام پایا گیا ہے۔ سر جان مارشل اور ان کے لائق رفقاء کو سندھ کی کھدائی میں ایک قسم کے لاجورد کے مثلث نما منکے بھی ملے ہیں جو دکن کی کھدائی میں بھی پائے گئے ہیں۔ قدیم زمانے کے حقائقی اوزاروں میں بھی بے حد مماثلت موجود ہے منکوں کی صنعت کے لئے تو دکن ابتدائی تاریخی زمانہ میں مشہور تھا۔ چنانچہ یونانی مورخین نے قدیم شہر پائیتھن Paithan اندھرا بادشاہوں کی راجدھانی کا جب ذکر کیا ہے تو یہ بھی لکھا ہے کہ قیمتی پتھروں کے منکے بطور رسا در غیر ممالک کو جاتے تھے۔ فادر ہیراس نے تو موہن جوداڑو کے تمام کتبات کی تعبیر بھی دراوڑی زبان کی مدد سے کر دی ہے۔

فادر ہیراس کے نظریہ کے صحیح اور غلط ہونے کا حال تو آئندہ تحقیقات سے معلوم ہوگا لیکن اس میں شک نہیں کہ جو قوم اُس وقت سندھ میں آباد تھی اس کے مذہبی عقائد، رسوم اور صنعتیں قدیم دراوڑی قوموں کے عقائد رسوم اور صنعتوں سے مشابہ ہیں۔

آریاؤں کی نسبت فرگسن نے یہ رائے ظاہر کی ہے کہ فن عمارت میں اس نسل کے لوگوں نے کسی ملک میں بھی کمال حاصل نہیں کیا۔ یہ رائے ایک حد تک درست معلوم ہوتی ہے۔ کیونکہ ایک ہزار سال قبل مسیح سے لیکر پانچ سو سال قبل از مسیح تک کے زمانہ کو اگر ہم دیکھیں تو مذہب، فلسفہ، شاعری اور بہت سے علوم میں ہندوستان کے آریائی نسل کے لوگوں کا کمال درجہ اعلیٰ پر نظر آتا ہے۔ لیکن جب انکے مکانات

کی تلاش کرتے ہیں تو سوائے گھاس پھوس کے جھونپڑوں کے یا مٹی کے گھروندوں کے پختہ اینٹیں بھی ہم کو مسیح سے چار سو سال پہلے کی نہیں ملتیں۔

ہندوستان کے فن تعمیر اور متعلقہ صنعتوں کی تاریخ کی تدوین میں بدھ مت کا آغاز خاص اہمیت رکھتا ہے۔ کیونکہ ابتدائی زمانہ کی جو عمارتیں موجود ہیں یا دریافت ہوئی ہیں وہ سب اسی مذہب یا اس کے پیرودں سے تعلق رکھتی ہیں۔ برہمنوں کے مذہبی فلسفہ کی گہرائی اور ذات پات کے امتیازات ایسی اقوام کو جو آریائی نہ تھیں ضرور شاق گذرتے ہوں گے۔ گوتم کی تعلیم کا اس وقت کی ہندو مت کی تعلیم سے مقابلہ کرنا تو علما اور ماہرین کا کام ہے۔ لیکن اتنا ضرور ہے کہ یہ مذہب اپنی انسانیت، ایثار اور وسعت نگاہ کی وجہ سے بہت مقبول ہوا اور اس کا عالم گیر اثر ہندوستان اور اسکے متصلہ ممالک میں جلد پھیل گیا۔ خود گوتم کا زمانہ چھٹی اور پانچویں صدی قبل از مسیح سمجھنا چاہئے۔ شمالی ہندوستان میں اس وقت سیسیو ناگا خاندان کے راجہ حکومت کرتے تھے جنکی راجدھانی ضلع گیا کی پہاڑیوں میں راجگیر تھی۔ پنجاب کا شمال مغربی حصہ اور سندھ ایران کی حکومت میں داخل تھے۔ اس زمانہ کے شمالی ہندوستان کے آثار میں راجگیر کے بڑے بڑے پتھروں کی دیواریں ہیں جو جنوبی ہندوستان میں بھی ضلع رائچور میں دریافت ہوئی ہیں اور بحیرۂ روم سے متصل ممالک میں بھی بکثرت موجود ہیں اور جن کو پتھروں کے غیر معمولی وزن اور مساحت کے لحاظ سے عفریتی دیوار Cyclopean Wall کہا جاتا ہے۔

اب اس امر کا فیصلہ کہ راجگیر کی عفریتی دیوار دراوڑی نسل کے لوگوں کی بنائی ہوئی ہے یا آریائی نسل والوں کا کارنامہ ہے، اس طرح ہو سکتا ہے کہ دیکھا جائے کہ اس قسم کی تعمیر شمالی ہند میں جہاں آریاؤں کا زیادہ دور دورہ رہا ہے عام ہے یا جنوبی ہند میں۔

مسئلہ پر غور کرنے سے پہلے سیسوناگا خاندان کی نسل کے بارے میں بھی جن کے عہد میں یہ دیوار تعمیر ہوئی غور کر لینا چاہئے۔ ونسنٹ سمتھ اور بعض مورخین کی یہ رائے ہے کہ سیسوناگا خاندان آریائی نسل کا نہ تھا جنوبی ہند میں بڑے بڑے پتھروں کا استعمال اول تو زمانہ ماقبل تاریخ کی قبور ہیں جن کو Dolmen اور Cairn وغیرہ کہا جاتا ہے۔ عام سے پایا جاتا ہے۔ علاوہ ازیں تاریخی زمانہ کے قلعوں میں بھی جنوبی ہند کے معماروں نے بڑے بڑے پتھروں کے استعمال میں ایسا کمال دکھایا ہے کہ حقیقت میں عفریتوں کا کارنامہ کہلائے جانے کا مستحق ہے۔ مثلاً قلعہ راچور کی قدیم دیوار میں ایک پتھر کی سل ۴۱ فٹ ۸ اینچ لمبی نصب ہے۔ اتنی بڑی سل دنیا کی کسی عفریتی دیوار میں نہیں ہے شمالی ہند میں اس قسم کی دیواریں نادر ہیں اس لئے یہ نتیجہ بدیہی ہے کہ راجگیر کی قدیم دیوار جو سیسوناگا خاندان کے راجاؤں کے عہد میں تعمیر ہوئی دراوڑی نسل کے لوگوں کی بنائی ہوئی ہے۔

۳۲۶ سال قبل از مسیح سکندر نے پنجاب پر حملہ کیا۔ اس حملہ کا یہ نتیجہ ہوا کہ ہندوستان کے شمال مغرب میں ایرانی اثر کے علاوہ یونانی اثر بھی قائم ہو گیا۔ سکندر کے حملہ کے تھوڑے ہی عرصہ بعد مغربی ایشیا کے یونانی بادشاہ سیلوکس نے پھر ہندوستان پر حملہ کیا لیکن اس وقت مگدھ میں موریا خاندان کا بادشاہ چندرگپت راج کرتا تھا۔ اور اس کی حکومت تمام شمالی ہند پر پھیلی ہوئی تھی۔ یونانیوں کو اس مرتبہ زیادہ کامیابی نہ ہوئی۔ اور صلح جن شرائط پر ہوئی ان میں ایک شرط کے تحت سلوکس کی بیٹی کی شادی چندرگپت سے ہو گئی۔ سلوکس نے چندرگپت کے دربار میں مگاستھنیز نامی ایک سفیر بھی بھیجا۔ پاٹلی پتر اس زمانہ میں دارالخلافہ تھا۔ مگاستھنیز نے اس شہر کے مدافعی استحکامات کی ضمن میں لکھا ہے

"چاروں طرف لکڑی کا ایک مستحکم حصار تھا۔ بادشاہ کا محل بھی لکڑی کا بنا ہوا تھا" اور کھدائی سے جو نشانات اور آثار اب حال میں برآمد ہوئے ہیں ان کے متعلق ڈاکٹر سپونر مرحوم کی یہ رائے تھی کہ پرسی پولس کے ایرانی بادشاہوں کے محل کی نقل تھا اور ایرانی صناعوں نے ہی اس کو تعمیر کیا تھا۔ چندر گپت کی عملداری کابل، ہرات، اور قندھار تک پھیل گئی تھی اور چونکہ یہ علاقے پہلے ایرانی حکومت کے ماتحت تھے۔ اس لئے ایرانی صناعوں اور معماروں کا وہاں طلب کیا جانا کوئی غیر معمولی بات تصور نہیں کیا جا سکتا۔ علاوہ ازیں یونانی بادشاہ سیلوکس سے بھی دوستانہ تعلقات قائم ہو چکے تھے۔ اور مغربی ایشیا اور ہندوستان میں اس وقت آمد و رفت اور تجارتی تعلقات کی بہت سی دلیلیں موجود ہیں۔ ایرانی تہذیب کے اثر کی ایک اور مثال کھروشتی طرز تحریر سے بھی نمایاں ہے جو آرمیکی خط کی ایک قسم ہے۔

چندر گپت کے زمانہ کی عمارتوں کا حال جہاں تک کہ میگا ستھینیز کی تحریرات سے معلوم ہوتا ہے۔ یا کھدائی سے جو آثار برآمد ہوئے ہیں اُن سے ظاہر ہے کہ بادشاہ کے محلات اور اہم عمارتیں لکڑی کی ہی بنتی تھیں۔ اور سنگین عمارتوں کا رواج نہ تھا۔ بعض اوقات ستونوں کے نیچے استحکام کی غرض سے یا دیمک کے اثر سے عمارت کو محفوظ رکھنے کے لئے پتھر کی بندش دیدیا کرتے تھے۔

چندر گپت کے پوتے راجہ اشوک کا عہد ہندوستان کے آثار قدیمہ کی تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہے گا۔ کیونکہ اسی کے عہد سے سنگین عمارتوں کا آغاز ہوا۔ اشوک کے زمانہ کی بہترین یادگار وہ لاٹھیں ہیں جو اس نے اپنی مملکت میں جا بجا قائم کیں۔ اول تو یہ لاٹھیں اپنے طول کے لحاظ سے جو چالیس پچاس فیٹ تک ہے اس زمانہ کے فن تعمیر کا عمدہ نمونہ ہیں علاوہ ازیں حیرت ہوتی ہے کہ کس طرح ان کی نقل و حرکت اور

نصب کرنے کا انتظام کیا جاتا ہوگا۔ ان لاٹھوں کو اس صفائی سے تراشا گیا ہے اور ایسی جلا دی گئی ہے کہ سنگتراشی کے فن میں کمال مشاق معلوم ہوتی ہے۔ بعض لاٹھوں کے بالائی حصے پر جانوروں کی مورتیں اور نقش و نگار بھی ہیں چونکہ ان میں اور قدیم ایرانی تماثیل اور نقوش میں بے حد مماثلت پائی جاتی ہے اس لئے بعض ماہرین کا خیال ہے کہ لاٹھوں کو ایرانی صناعوں ہی نے بنایا ہوگا۔ اشوک کی مملکت کی وسعت اور بدھ مت کے عام رواج کے لحاظ سے ایرانی صناعوں کا بڑے بڑے تعمیری کاموں میں شریک ہونا کوئی تعجب خیز امر نہیں ہے لیکن ساتھ ہی یہ خیال بھی رکھنا چاہئے کہ ان ہی نقوش میں بعض ایسی خصوصیات بھی ہیں جو ایران میں نہیں ہیں۔ اس لئے گمان غالب یہی ہے کہ لاٹھوں کی تعمیر صرف ایرانی لوگوں سے ہی عمل میں نہیں آئی بلکہ اہل ملک بھی اس میں شریک تھے۔ لاٹھوں کے علاوہ اس زمانہ کی یادگار بارابار کے غار اور سارناتھ کا سنگین کٹہرا ہے جو ایک ڈال کا تراشا ہوا ہے۔ بارابار کے غاروں کی دیواروں کی جلا اس غضب کی ہے کہ ہاتھ رکھنے سے پھسلتا ہے۔ ایرانی اثر ثابت کرنے والے اشوک کے کتبوں کو بھی استدلال میں پیش کرتے ہیں کہ یہ ہخامنشی Achaemenian بادشاہوں کے چٹانوں پر کندہ کئے ہوئے احکام کی نقل ہیں۔ علاوہ ازیں اشوک کے بعض منادات میں زرتشت کے کلام کا بھی انداز پایا جاتا ہے۔ ایرانی اثر سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ تاہم کافی قرائن موجود ہیں کہ ہندوستان میں بطور خود سنگتراشی کا فن کافی ترقی کر چکا تھا۔ لیکن ماہرین چونکہ دراوڑی نسل کے لوگ تھے اس لئے ابتدا میں مذہب اور رنگ کے قیود کی وجہ سے کوئی اعلیٰ پیمانہ پر کام کرنے کا موقع نہیں ملا۔ اور بدھ مت کی رواداری نے جب ان کو اپنی مقدس سنگتوں کے آغوش میں لے لیا تو

ان کے کمال کے جوہر چکے۔ سرجان مارشل کی رائے ہے کہ سنگتراشی سے پہلے زرگری اور ہاتھی دانت پر منبت کاری کی صنعتیں فروغ پا چکی تھیں اور سنگتراشی میں جو نمونے ہمیں ملتے ہیں وہ ان دونوں صنعتوں سے نقل کئے ہوئے معلوم ہوتے ہیں علاوہ ازیں ہندوستان کی ابتدائی سنگتراشی میں ایک قسم کی صفائی اور دیدہ ریزی ایسی موجود ہے جو دوسرے ملکوں کے سنگتراشی کے نمونوں میں ہم کو نہیں ملتی۔

اشوک کا زمانہ تیسری صدی قبل از مسیح کا وسطی حصہ سمجھنا چاہئے۔ اشوک کی وفات کے بعد مگدھ کی سلطنت میں بہت ضعف آگیا۔ اور شمال غرب اور پنجاب میں یونانی، سیتھی، اور ایرانی حکومتیں قائم ہوگئیں۔ لیکن بدھ مت سلطنت کے ضعف کے بعد بھی ترقی پذیر رہا۔ اور دوسری صدی قبل مسیح کی عمارتوں میں سانچی اور برہوت کے اسٹوپا خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ اسٹوپا کی تعمیر میں تو فن کے لحاظ سے کوئی خاص اہمیت نہیں کیونکہ مٹی کے ایک مدور تودے کو اینٹ یا پتھر کی چنائی سے بند کر دیتے تھے۔ لیکن اس کے گرد جو سنگین کٹہرے اور دروازے نصب کئے گئے ہیں ان کی سنگتراشی قابل تعریف ہے۔ برہوت کا استوپا مسمار ہو چکا ہے لیکن اس کے بعض حصص کلکتہ کے عجائب خانہ میں محفوظ ہیں۔ سانچی کا استوپا البتہ قائم ہے اور اس کی مرمت ریاست بھوپال کی جانب سے سرجان مارشل کی نگرانی میں نہایت عمدہ طور سے عمل میں آئی ہے۔ ان دونوں اسٹوپاؤں کے کٹہروں اور دروازوں پر بدھ کی زندگی کے قصے، اصلی اور خیالی جانوروں کی تصویریں مذہبی علامات اور شاید بانیوں کے مجسمے بھی کندہ ہیں۔ انسانی صورت میں ناگا قوم کے لوگ نمایاں ہیں جو دراوڑی نسل کے تھے۔ برہوت کے اسٹوپا پر براہمی کتبوں کے علاوہ کھروشتی رسم خط کے کتبے بھی ہیں۔ مزید برآں ایسی

حیوانی تماثیل اور نقش و نگار موجود ہیں جن سے ایرانی اور یونانی اثر بھی نمایاں ہوتا ہے۔ فن کے لحاظ سے دونوں جگہ کے کام کی نوعیت مختلف ہے۔ برہوت کا کام ابتدائی معلوم ہوتا ہے۔ مثلاً مجسموں کے نیچے کے حصہ میں ٹانگوں کو ٹیڑھا کر دیا ہے۔ تناسب کی بھی کمی ہے۔ اور ایک قسم کا بھدا پن ہے۔ اس کے مقابل میں سانچی کی سنگتراشی میں صفائی اور حسن بدرجہ کمال موجود ہے اور جو مناظر مثبت کئے گئے ہیں ان میں تماثیل کی جسامت، حرکت اور احساسات کا اظہار نہایت خوبی کے ساتھ کیا گیا ہے اور ترتیب بھی نہایت عمدہ ہے۔ سانچی کے جنوبی دروازہ پر جو صنعت کے لحاظ سے بہترین سمجھا جاتا ہے ایک کتبہ آندھرا خاندان کے بادشاہ مری سات کرنی کا ہے جس کا زمانہ اس راجہ کے اور مقامات کے کتبوں کے لحاظ سے دوسری صدی قبل از مسیح مانا گیا ہے۔ سانچی کے کتبے میں سات کرنی کی مملکت کے کاریگروں کا ذکر ہے۔ یہ کتبہ ہندوستان کی فنون لطیفہ کی تاریخ میں بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ کیونکہ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دوسری صدی قبل از مسیح میں دکن میں، جہاں دراوڑی قومیں آباد تھیں سنگتراشی ایسے کمال کو پہنچ گئی تھی کہ وہ شمالی ہند کے صناعوں کے کام پر غالب تھی۔ اجنٹا کے دس نمبر کے غار میں جو بائیں جانب کی دیوار پر تصاویر ہیں، ان پر بھی ایک کتبہ دوسری صدی قبل از مسیح کا ہے اور تصاویر میں جو انسانی شکلیں دکھائی گئی ہیں وہ ناگا قوم کی ہیں جن کے لباس اور زیور سانچی کے ناگاؤں کے لباس اور زیور سے ملتے جلتے ہیں۔ سانچی اور برہوت دونوں جگہ کے ستوپاؤں اور نیز اجنٹا کی ابتدائی تصاویر میں ناگاؤں کا خصوصیت سے دکھایا جانا اس امر کی دلیل ہے کہ بدھ مت کے پیرو ابتدا میں زیادہ تر دراوڑی نسل

کے لوگ ناگا وغیرہ تھے اور سنگتراشی اور نقاشی کے فنون میں ان کو دوسری صدی قبل از مسیح میں مہارت تامہ حاصل ہو گئی تھی۔ بدھ مت کی عمومیت یا سیاسی اقتدار کی بنا پر اگر یونانی ایرانی اور سیتھی اثرات کو تسلیم بھی کر لیا جائے تب بھی خود ہندوستان کے فن و کمال کے لحاظ سے بیرونی اثر کو صرف آٹے میں نمک سمجھنا چاہیئے۔

میں نے تھوڑی دیر ہوئی آپ کے سامنے بارا بار کے غاروں کا ذکر کیا تھا۔ پہاڑوں میں قبور بنانے کی رسم مصر میں کئی ہزار برس پہلے عام تھی اور مصری اثر کے ذریعہ ایشیائے کوچک پہنچی جہاں سے ایرانیوں نے اس کو حاصل کیا۔ دارا اور ہنجامنشی بادشاہوں کے پہاڑوں میں تراشے ہوئے مقبرے اب تک نقش رستم اور پرسی پولس میں موجود ہیں۔ ایرانیوں کی بدولت پہاڑوں میں مکانات تراشنے کا رواج راجہ اشوک کے زمانہ میں یا اس سے قبل بہار میں شروع ہوا لیکن دکن اور مغربی ہند میں دراوڑی نسل کے لوگوں نے اپنی معابد اور خانقاہوں کی تعمیر میں اس کو ایسا رواج دیا اور ایسے کمال پر پہنچا دیا جو اس قسم کی تعمیر کو نہ مصر میں کبھی حاصل ہوا تھا اور نہ ایران میں ہوا۔ مثال کے طور پر ابتدائی زمانہ کی تعمیر میں بھاجا، پتیل کھورا، اجنتا، بیدسا، ناسک اور کارلی کے معابد ہیں اور قرون وسطیٰ کی تعمیر میں بادامی، ایلورہ اور ایلی فنٹا کے دیول ہیں۔ میں ان عبادت گاہوں کا ذکر ان کی اہمیت کے لحاظ سے ذرا تفصیل سے کروں گا۔

پہلے میں آپ کو ذرا بدھ مت کی مقدس عمارتوں کی نوعیت سے روشناس کراتا ہوں۔ یہ تین قسم کی ہیں۔ اول ستوپا۔ یہ ابتدا میں وہ مدور مدفن تھے جہاں بدھ کی ہڈیاں یا دانت وغیرہ بطور یادگار دفن کئے گئے تھے اور جو بعد میں پرستش گاہ بن گئے۔ ستوپا کی ابتدا ہیئت کے لحاظ سے زمانۂ ما قبل تاریخ کی قبور سے معلوم ہوتی ہے جن کو Cairn

کہا جاتا ہے۔ کیونکہ Cairn کے وسط میں بھی مٹی کا ایک مدور تودہ ہوتا ہے اور چاروں طرف بڑے بڑے پتھر نصب ہوتے ہیں۔ استوپا میں صرف اتنا فرق ہے کہ مدور مٹی کے ڈھیر کو اینٹوں یا پتھروں سے محصور کر دیتے ہیں اور اردگرد بڑے بڑے پتھروں کی جگہ سنگین کٹہرے بنا دئے جاتے ہیں بدھ مت کی دوسری قسم کی مقدس عمارتیں چیتیا Chaitya کہلاتی ہیں یہ خالص عبادت گاہیں ہیں اور ان میں سرہانے کی جانب استوپا کی ہیئت پرستش کے لئے ہوتی ہے۔ چیتیاؤں کا سطحی نقشہ یورپ کے قدیم معبدوں سے جن کو Bacilica کہتے ہیں ملتا جلتا ہے۔ یعنی پچھلا حصہ مدور ہوتا ہے اور سامنے کا حصہ مستطیل۔ بدھ مت چیتیا کے اور یورپ کی قدیم عبادت گاہوں کے سطحی نقشوں کا ماخذ بحر روم کے قدیم معابد کے نقشے ہیں۔ یہ معابد حال میں مالٹا میں دریافت ہوئے ہیں اور سطحی نقشے کے لحاظ سے ان کے دو حصے ہیں۔ ایک حصہ جو بتوں کے لئے مخصوص تھا اور دارالاصنام یا خانۂ خدا کہلاتا تھا' مربع ہے۔ اور دوسرا حصہ جو مذبح کہلاتا تھا نیم دائرے کی شکل میں ہے یا قوس نما ہے۔ اور چونکہ دونوں حصے ایک دوسرے سے ملحق ہیں اس لئے Bacilica کے سطحی نقشہ کی صورت پیدا ہو گئی ہے۔ آپ کو شاید معلوم نہ ہو کہ مسلمانوں کے خانۂ خدا یعنی کعبہ کا سطحی نقشہ بھی یہی ہے۔ یعنی حطیم جو کسی زمانہ میں مذبح ہوگا نیم دائرہ کی شکل میں ہے اور کعبہ مستطیل اور دونوں مل کر مالٹا کے قدیم معابد سے مشابہ ہو جاتے ہیں اور اس طرح مسلمانوں کا کعبہ کو بیت عتیق یعنی خدا کا سب میں پرانا گھر سمجھنا بالکل بجا اور درست ہے۔ خیر یہ تو جملہ معترضہ تھا۔ دراوڑی نسل کے لوگوں کا چونکہ ابتدائی مسکن بحیرۂ روم کے ساحل کے ممالک تھے' اس لئے ان کا اس قسم کے معابد سے واقف ہونا کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔ اور بدھ مت کے پیروؤں

میں بھی چونکہ دراوڑی نسل کے لوگوں کا عنصر غالب تھا اس لئے چیتیا کا سطحی نقشہ بحیرۂ روم کے قدیم معابد سے مماثل ہونا قرین قیاس ہے۔

بدھمت کی تیسری قسم کی مقدس عمارتیں وہارا Vihara یعنی خانقاہ کہلاتی ہے۔ ان کی ہئیت عام طور سے یہ ہے کہ بیچ میں ایک مربع جگہ بیٹھنے کے لئے ہوتی ہے اور چاروں طرف بھکشوؤں کے رہنے اور مراقبہ وغیرہ کے لئے حجرے۔ بعد میں سرھانے کی جانب ایک حجرے میں بدھ کی مورت بھی ہوتی تھی تاکہ بھکشوؤں کو توجہ اور استغراق میں مدد ملے۔

مٹی اور گھاس پھوس کے جھونپڑوں کے بعد ہندوستان میں چونکہ بانس اور لکڑی کے مکانات کا رواج ہوا اس لئے بدھمت کے معابد اور خانقاہیں جب پہاڑوں میں تراشی گئیں تو لکڑی کے مکانات کی تعمیر کا تتبع کیا گیا۔ مثلاً چھتوں کی وضع بانسوں کے ٹھاٹر کی سی ہے پہاڑ میں گول مڑے ہوئے بانسوں کی شکل کو نمایاں کیا گیا ہے۔ جب بانس کو گول موڑا جائے تو اس کے زور کو روکنے کے لئے ظاہر ہے کہ لکڑی کے ستونوں یا تھونیوں کو بجائے سیدھا عمودی طور پر قائم کرنے کے ذرا ڈھلوان سلامی نما قائم کیا جاتا ہوگا۔ پہاڑ میں ترشے ہوئے ابتدائی معابد میں ستونوں کی یہی وضع ہے۔ بعض چیتیاؤں کے سامنے کا حصہ لکڑی ہی کا بنا ہوا تھا۔ جس کے آثار امتداد زمانہ کے باوجود بھاجا اور کونڈانہ میں اب تک موجود ہیں۔

پہاڑ میں تراشے ہوئے مندروں کی تعمیر کا سلسلہ ایک ہزار برس سے زیادہ جاری رہا۔ ان میں ساتویں صدی عیسوی تک تو زیادہ تر بدھمت کے معابد ہیں۔ لیکن چھٹی صدی عیسوی سے برہمنی مذہب کی عبادت گاہیں بھی تعمیر ہونی شروع ہوگئیں۔

انہی کے تقریباً ہم عصر جین مذہب کے معابد ہیں۔ بدھ مذہب کے معابد میں دوسری تیسری صدی عیسوی تک سوائے مذہبی علامات کے کسی قسم کی تزئین نہیں کی گئی۔ تاہم چھت اور ستونوں کی بلندی اور اندرونی ایوان کی وسعت کے لحاظ سے ایک خاص عظمت اور شوکت پائی جاتی ہے جو تعمیر کی عام سادگی سے مل کر دیکھنے والے کے دل پر عجب سکون اور مذہبی کیف پیدا کر دیتے ہیں۔ لیکن چوتھی صدی سے تزئین اور آرائش کا سلسلہ شروع ہو کر پانچویں اور چھٹی صدی عیسوی میں یہ کمال پر پہنچ گیا اور اجنٹا کے غار نشان ایک اور دو اور سولہ اور سترہ اور انیس اور چھبیس اس تزئین کاری کے بہترین نمونے ہیں۔ در اور دیوار اور روکاروں کو منبت کاری سے اس طرح سجایا ہے کہ صنعت کی صفائی، باریکی اور نفاست کو دیکھ کر عقل حیران ہوتی ہے۔ سنگتراشی کی اس صنعت میں پھول پتوں اور پھلوں، جانوروں اور خیالی اشکال کے علاوہ انسانی پیکر بھی نہایت خوبی سے بنائے گئے ہیں۔ جن میں صحیح ہیئت تناسب اور اندرونی احساسات کے دکھانے کا خاص التزام کیا گیا ہے۔ ان پیکروں سے صناع کی اعلیٰ ذہنیت اور بلند خیالی نظر آتی ہے۔ اجنٹا کے غاروں میں سنگتراشی کے علاوہ نقاشی کے کمال کے بھی بہترین نمونے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ پانچویں صدی عیسوی میں ہندوستان فنون لطیفہ کے لحاظ سے تمام دنیا کے ممالک میں پیش پیش تھا۔ یہ دعویٰ اور مستحکم ہو جاتا ہے اگر میں آپ سے بیان کر دوں کہ کالی داس کے ڈرامے بھی اسی صدی میں لکھے گئے۔ سنگتراشی اور نقاشی کے اس کمال کے اسباب میں اول تو بدھ مذہب کی تعلیم تھی جس نے انسانی ہمدردی اور ایثار اور کائنات کی ہم آہنگی کی تعلیم دے کر امنگ اور جوش میں جو فنون لطیفہ کے لئے ضروری ہے ایک خاص لطافت

سکون اور وقار پیدا کر دیا تھا علاوہ ازیں دوسری صدی قبل از مسیح سے پانچویں صدی
بعد از مسیح تک ہندوستان میں مختلف بیرونی اقوام کی چھوٹی چھوٹی حکومتیں قائم ہو گئی

تھیں۔ مثلاً یوانا، ساکا، کشان، شاہرات اور ہن ان بیرونی اقوام نے ہندوستان
میں بسنے کے بعد بدھ مت اختیار کر لیا اور ان کے فنی کمال اور ذہنیت کی
آمیزش اور تصادم نے دراوڑی نسل کی ذہنیت کے لئے ترقی کے راستے کھول دئے۔
علاوہ ازیں اس عروج میں آریائی نسل والوں کی بلند خیالی دقت نظر اور تراقی
طبع بھی کام آئی۔

مختلف اقوام کی آمیزش کا نتیجہ خود بدھ مت کے لئے اچھا نہیں ہوا اصلی
سادگی خلوص اور ایثار باقی نہ رہا اور مذہب رسوم قصوں اور روایتوں کے لفافے میں
لپٹ گیا۔ یہ کمزوری چھٹی صدی سے شروع ہوئی ساتویں صدی میں مذہب بالکل بیجان
ہو گیا۔ اور آٹھویں صدی کے آخر تک ہندوستان سے قریب قریب غائب ہو گیا۔
بدھ مت کے انحطاط کے آخری زمانہ میں برہمنی مذہب کو دوبارہ عروج دینے کے لئے
شنکراچاری اور رام نوج کی تعلیم مفید ہوئی۔ بدھ مت تو ہندوستان سے بے شک غائب
ہو گیا لیکن اتنا اثر اس کا مٹتے مٹتے ہوا کہ ہزاروں بیرونی اقوام کے لوگ جو بدھ مت
کے پیرو تھے اس کے زائل ہونے کے بعد برہمن چھتری اور ویش بن گئے۔ یہ کایا پلٹ
کاٹھیاواڑ، مالوہ صوبہ جات متوسط برار اور دکن میں بہت زیادہ ہوئی۔ اس ضمن میں
ڈاکٹر ڈی۔ بی۔ بھنڈارکر کی تحقیقات نہایت دلچسپ ہیں جنھوں نے مرہٹوں، گوجروں
جاٹوں وغیرہ کو ان بیرونی اقوام کی نسل سے ثابت کیا ہے۔ مدراس کے برہمنوں کا
بھی اپنے کو آریہ تصور کرنا اسی قبیل میں داخل ہے۔

برہمنی مذہب کا دوبارہ عروج جس جوش وخروش، قوت اور استقلال، بلند خیالی اور الوالعزمی سے ہوا اس کے شاہد اس زمانہ کے مذہبی مجسمے ہیں جن کی بہترین مثال ہم کو ایلورہ اور ایلیفنٹا میں ملتی ہے۔ شیوا کا کیف انگیز ناچ، وشنو کا ایک ہی ڈگ میں دھرتی کو طے کر کے آکاش کی خبر لینا، بھیرو ل کی خون کی پیاس نہ بجھنا، راون کا کیلاش تک کو ہلا دینا، سنگتراشی کے ایسے نمونے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ انسانی قوت آسمان زمین دونوں کو تسخیر کرنے پر تلی ہوئی تھی۔ اس مذہبی ہیجان اور ولولہ اور جوش کا کارنامہ تعمیر کی شکل میں ایلورہ کا کیلاش نامی مندر ہے جو آٹھویں صدی عیسوی میں راشٹر کوٹا خاندان کے راجا کرشنا کے حکم سے پہاڑ میں تراشا گیا۔ ایک انگریزی مصنف لکھتا ہے کہ ایتھنز کے پارتھینن Parthenon یا روم کے سینٹ پیٹر کو بنا لینا آسان ہے۔ کیونکہ کام کی نوعیت اور تقسیم کا اندازہ کیا جا سکتا ہے لیکن پہاڑ کے جگر میں بیسیوں برآمدے متعدد ایوان اور ہزاروں پتلے بنانا عقل کو دنگ کرتا ہے۔ کیونکہ سارا کام صرف ہتھوڑی اور چھینی کا ہے اور اگر ایک کاریگر کا بھی ہاتھ بہک جاتا تو پھر اس حصہ کا درست ہونا ناممکن تھا۔ مساحت کے لحاظ سے اس عظیم الشان مندر کا طول ۲۵۰ فیٹ، عرض ۱۵۰ فیٹ اور بلندی ۱۰۰ فیٹ ہے۔ وسطی حصہ میں جو ایوان ہے اس کے فرش کی جلا ستونوں کے نقش و نگار اور موزونیت ہندوستانی کمال اور ذوق کی بہترین مثالیں ہیں۔ اسی صدی کا دوسرا کارنامہ ایلیفنٹا کی تری مورتی ہے۔ میں اس کے دیکھنے سے پہلے مصری رومانوی اور یونانی مجسموں کو دیکھ چکا تھا۔ لیکن اس میں جو عظمت و شکوہ جلال و قہر اور جمال و سکون کی مختلف شانیں مورت کے تینوں چہروں میں دکھائی گئی ہیں وہ میری ناقص رائے میں دنیا کے کسی مجسمے میں نہیں۔ یونانی پیکروں میں جسمانی رعنائیاں

ضرور ہیں لیکن یہ روحانی شان کہاں۔ رومانی پتلون میں صرف حیوانی قوت اور زور ہے اور مصری مجسمے بھی بہیمیت کا مظاہرہ کرتے ہیں۔

۲۹۰

پہاڑ کے تراشے ہوئے مندروں میں بہت سے جین مذہب سے بھی متعلق ہیں لیکن ان کا رتبہ تعمیری حیثیت سے پست ہے اور نقش و نگار اور تماثیل میں بھی محض نقالی پائی جاتی ہے۔ بلند خیالی اور تخلیقی قوت Creative effort معدوم ہیں۔

پہاڑ میں مندر تراشنے کا سلسلہ جیسا کہ میں پہلے بیان کر چکا ہوں ایک ہزار برس سے زیادہ جاری رہا اور اس عرصہ میں سنگین دروازے، چوکھٹیں، ستون، دالے، سرولین بنانے میں کمال مہارت ہو گئی۔ اور جب کھلے میدانوں میں عمارتیں بنانی شروع کیں تو ان میں یا تو قدیم لکڑی کی عمارتوں کا تتبع کیا یا پہاڑ میں تراشے ہوئے مندروں کا۔ چنانچہ ہندوستان میں مسلمانوں کے آنے سے پہلے کی ضمنی عمارتیں ہیں ان کو اس طرح بنایا گیا ہے جیسے بچے لکڑی کے مکعب ٹکڑوں کا گھر بناتے ہیں۔ بڑے بڑے پتھروں کو نہایت صفائی سے تراش کر ایک دوسرے کے اوپر جمایا گیا ہے اور اسی طرح چوکھٹوں اور دروازوں کو قائم کیا گیا ہے اور چھتوں کی سلوں کی بھی ترتیب دی گئی ہے لیکن چونکہ بنیاد اور وزن کا خیال نہیں رکھا گیا اور پتھروں کے بیچ میں مسالہ بھی نہیں ہے اس لئے جہاں کہیں بالائی حصہ زیادہ وزنی ہو گیا ہے سرول فوراً تڑخ گئی ہے۔ یا جہاں کہیں بنیاد دب گئی ہے عمارت کی دیواریں شق ہو گئی ہیں۔ ہمارے سررشتہ کو ان عمارتوں کے تحفظ کے لئے جو تدابیر اختیار کرنی پڑتی ہیں ان سب میں بنیاد کو پانی کے اثر سے محفوظ رکھنے اور مزید زمین میں دھنسنے سے بچانے کی کوشش کرنی پڑتی ہے اور چھتوں کے وزن کو سہارنے

کے لئے ستون اور تھونیاں قائم کرنی پڑتی ہیں اور پرانی سرولوں کو یا تو بدل دیتے ہیں یا نئی اور نصب کرکے ان کو تقویت دیدیتے ہیں۔

فن تعمیر کے ان نقائص کے علاوہ ہندوستان کے معماروں نے اپنے فن میں آٹھویں صدی عیسوی سے لے کر بارھویں صدی عیسوی تک بے حد ترقی کی۔ اجارے سے لے کر کنگنی تک عمارت کے ہر حصہ میں اتنا تنوع پیدا کیا کہ ان کی بوقلمونی پر عقل حیران ہوتی ہے۔ بعض محققین نے ہندوستان کے اس زمانہ کے معابد کی تقسیم ان کی برجیوں کی ہئیت کے لحاظ سے کی ہے مثلاً شمالی ہند۔ جہاں برجیوں کی ہئیت ذرا لمبوتری بیرونی رخ پر گولائی لئے ہوئے ہوتی ہے، اور چنائی کے سلسلے عمودی طور پر نمایاں ہوتے ہیں ہندی آریائی کہا ہے، اور جنوب میں جہاں مندروں کے بالائی حصے اہرامی وضع کے ہوتے ہیں اور چنائی کے سلسلے افقی قائم کئے جاتے ہیں۔ دراوڑی کہا ہے۔ اور دکن میں جہاں برجیوں کی وضع بین بین ہے وہاں کے طرز تعمیر کو چالوکیا کہا ہے۔ یہ سب تقسیمیں محض اعتباری ہیں شمال اور جنوب دونوں جگہ کی برجیوں کا ماخذ اصل میں رتھوں کی برجیاں ہیں۔ جو شمالی ہند میں عام طور سے لمبوتری ہوتی ہیں اور جنوبی ہند میں چھتری کی طرح گول۔

اس زمانہ کی شمالی ہند کی بہترین عمارتوں میں بھبنیشور، کنارک، کھجراؤ اور آبو کے مندر خاص طور پر قابل ذکر ہیں اور دکن میں ان کے ہم عصر ورنگل، رامپا، اوندھا اور اگنگی کے دیول ہیں جن کی صنعت اور خوبی اُسی پایہ کی ہے۔ جنوبی ہند میں اس زمانہ کے معابد میں ہالی بید بیلور کانجی درم، سری رنگم اور تنجور کی عمارتیں ہیں جن سے فن تعمیر کی ابتدا ترقی اور عروج سب کا پتہ واضح طور پر چلتا ہے۔ اب میں ان عمارتوں

میں سے بعض کی خصوصیات پر مختصر طور سے تبصرہ کروں گا۔

بھینشور میں کبھی سات ہزار دیول تھے اور اب بھی کئی سو کے آثار باقی ہیں۔

ان میں سے بعض چھٹی صدی کے بھی ہیں لیکن بڑا دیول جو لنگا راجہ کے نام سے مشہور ہے غالباً آٹھویں یا نویں صدی کی تعمیر ہے اور اس کے سامنے کے حصہ میں جو ناٹ منڈپ اور بھوگ منڈپ ہیں وہ شاید اس کے بھی بعد کے ہیں یعنی گیارھویں اور بارھویں صدی کے ہیں۔ مندر کا برج تقریباً ۱۸۰ فیٹ بلند ہے۔ وضع لمبوتری ہے لیکن اس کو شمالی ہند سے مخصوص نہ کرنا چاہیئے کیونکہ اسی قسم کے برج عالم پور ضلع رائچور میں بھی موجود ہیں۔ برج کے اس قدر حجم کے باوجود کوئی جگہ ایسی نہیں جو سنگتراشی کے کام سے خالی ہو۔ کام کی وضع نہایت نفیس ہے۔ بالائی حصہ پر ایک کمرکی گنبد بارہ شیبروں کے مجسموں پر قائم کیا گیا ہے جس سے عمارت کی عظمت اور شان اور بھی بڑھ گئی ہے۔ لنگا راجہ کے برج کے پاس ہی ایک اور برج ہے جس کی تعمیر میں چنائی کے سلسلے افقی ہیں جن کو فرگسن نے جنوبی ہند کی خصوصیت بیان کیا ہے۔ میں ابھی آپ سے عرض کر چکا ہوں کہ اس وقت کی تعمیر لکڑی کی تعمیر پر مبنی تھی اور برجوں کا گول یا لمبوترا بنایا جانا چنائی کے سلسلوں کا عمودی یا افقی ہونا محض عارضی امر ہیں۔

کام کی نفاست کے لحاظ سے کنارک کا سوریا کا مندر بھینشور کے مندر سے بھی بہتر ہے۔ یورپین ماہرین کی کتابوں میں اس کا ذکر Black Pagoda سیاہ دیول کے نام سے کیا گیا ہے۔ مندر کی تعمیر سورج دیوتا کے رتھ کی صورت میں کی گئی ہے۔ چنانچہ حال میں جو کھدائی ہوئی ہے اس سے رتھ کے پہیئے اور گھوڑے برآمد ہوئے ہیں۔ اس مندر میں اگرچہ فحش تصاویر کندہ کی گئی ہیں لیکن منبت کاری نہایت اعلیٰ

درجہ کی ہے۔ تعمیر میں بھی تناسب کا بدرجہ اتم خیال رکھا گیا ہے۔ اس مندر کے برج میں بالائی حصہ کے استحکام کے لئے آہنی شہتیر بھی نصب کئے گئے تھے، جو پٹے ہوئے لوہے کے تھے۔ اگر برج کو نویں دسویں صدی کی بھی تعمیر مان لیا جائے تب بھی آہنی شہتیروں کا استعمال کچھ تعجب کی بات نہیں دہلی اور دہار میں اس زمانے سے قبل کی لوہے کی لاٹیں موجود ہیں۔ دکن میں لوہے کا استعمال بہت قدیم ہے اور روایت تو یہ ہے کہ اہرام مصری کے لئے بھی لوہے کے کنڈے ہندوستان ہی سے گئے تھے۔ یہ صحیح ہو یا غلط لیکن عرب کے جاہلیت کے شاعر تو ہندی تلوار کی تعریف کرتے ہیں۔ اور ایران وغیرہ میں بھی ہندی لوہے کا جانا زمانۂ قدیم سے ثابت ہے۔

کھجراؤ میں بے شمار دیول ہیں۔ یہ مقام آج کل چھتر پور کی ریاست میں ہے۔ لیکن یہ نہایت قدیم بستی ہے اور چینی سیاح ہیون چوینگ نے بھی اس مقام کا ذکر کیا ہے۔ کھجراؤ میں تیس مندر ہیں اور سوائے دو تین کے باقی سب دسویں یا گیارہویں صدی کے وسط کے بنے ہوئے ہیں۔ تعمیری لحاظ سے ان مندروں کی کرسی بہت بلند ہے۔ سطحی نقشہ بھی بھینشور اور کنارک کے مندروں کے نقشہ سے بدلا ہوا ہے، یعنی پہلے داخلی حصہ Porch ہے۔ پھر بیچ کا منڈپ اور آخر میں مورت کا کوٹھا بھینیشور اور کنارک کے دیولوں میں داخلی حصہ Porch مندر کی اصلی عمارت میں اس طرح شامل نہیں ہے۔ سنگتراشی کا کام نہایت نفیس ہے اور آرائشی کام [illegible] مجسموں کی افراط ہے۔ آٹھ سو سے زیادہ پتلے جن کی ساخت انسانی قد و قامت سے نصف کے قریب ہے صرف کندریا (شیو) کے مندر میں موجود ہیں۔ اس دیول کے بالائی حصہ میں برجیوں کے متعدد ہونے سے ذرا بے عنوانی پیدا ہو گئی ہے اگر ایک

برج ہوتا تو دیکھنے والے کو خلجان نہ ہوتا اور آنکھ برج کی ساخت اور اس کی نفیس سنگتراشی کا لطف اٹھا سکتی۔ کھجراؤ کے دیول شیوا اور وشنو عقائد کے علاوہ جین مذہب سے بھی تعلق رکھتے ہیں۔ لیکن ان کی ظاہری ہئیت میں کوئی تفاوت نہیں ہے۔ آبو کے مندر بھی جین مت سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان میں سے ایک معبد جس میں آدی ناتھ کی مورت ہے گیارہویں صدی کا بنا ہوا ہے اور دوسرا جس میں نیم ناتھ کا پتلا ہے تیرہویں صدی کا ہے دونوں عمارتیں سر سے پیر تک سنگ مرمر کی بنی ہوئی ہیں اور سنگتراشی کا کام ایسا نازک اور نفیس ہے کہ پتھر کو موم کر دیا ہے۔ ستون، پرکالے چوکھٹیں، سردلین چھت سب نقش و نگار اور مورتوں سے آراستہ ہیں اور چپہ بھر جگہ ایسی نظر نہیں آتی جہاں سنگتراشی کا کمال نہ دکھایا گیا ہو۔ آدی ناتھ کے مندر کے بیچ کے منڈپ کی چھت گنبد نما ہے اور ستونوں کے بیچ میں بھی ٹوڈے **Bracket** دیکر حلقہ دار محراب کا اثر پیدا کیا گیا ہے۔ اس زمانہ کی تعمیر میں چھت کے بنانے کے دو طریقے تھے۔ معمولی طور پر تو چار چار ستون قائم کرکے چھت کی تقسیم کر لی جاتی تھی اور سلیں پاٹ دی جاتی تھیں۔ لیکن جہاں مربع حصوں کا طول اور عرض زیادہ ہوتا تھا اور خوشنمائی پیدا کرنی بھی منظور ہوتی تھی وہاں مربع جگہ کے چاروں کونوں پر آڑی سلیں رکھ کر ایک اور چھوٹا مربع بنا لیتے تھے اور اس کو ایک سادہ یا منبت پتھر سے ڈھانک دیتے تھے۔ بعض مقامات پر جہاں مزید آرائش منظور ہوتی تھی مربع کو آڑی سلوں سے دو دو تین تین بار چھوٹا کرتے تھے اور آخر میں ایک ایسی سل جس کا بیچ کا حصہ گول گنبد نما تراشا ہوا ہوتا تھا وسط میں نصب کرتے تھے جس سے چھت میں گنبدی اثر پیدا ہو جاتا تھا۔ گنبدی چھت بنانے کا ایک اور بھی طریقہ رائج تھا۔ وہ یہ تھا کہ پہلے سولہ یا چوبیس

ستونوں کو حلقہ کی شکل میں قائم کر لیتے تھے۔ اور پھر تراشیدہ پتھروں کے سلسلے سر دلوں پر اس طرح پر قائم کرتے تھے کہ اوپر کا حصہ بتدریج چھوٹا ہوتا جاتا تھا۔ پھر ایک دوسرے سے چولوں اور کنڈوں سے پھنسے ہوئے ہوتے تھے۔ آدی ناتھ کے منڈپ کی چھت بھی اسی طرح گنبدی بنی ہوئی ہے اور چونکہ اس کی منبت کاری نہایت نفیس ہے اس لئے تعمیری دلفریبی اور بھی بڑھ گئی ہے۔ ہندوستان میں جین مت کے معابد میں یہ دونوں مندر سنگتراشی اور تعمیری صنعتوں کے بہترین نمونے ہیں۔

دکن کی عمارتوں میں سطحی نقشہ اور زیادہ دلکش نظر آتا ہے یعنی دیولوں میں داخلہ کا انتظام تین جانب سے رکھا گیا ہے۔ اس لئے دہلیزیں یا داخلی حصے Porches تین جانب بنائے ہیں اور چوتھی جانب توازن قائم رکھنے کے لئے مورت کا کوٹھا اور اسکا اگلا حصہ Anti-Chamber ہوتا ہے۔ وسط میں حسب معمول منڈپ ہے لیکن وسعت کے لئے اس کے چاروں طرف ایک غلام گردش Gallery بنا دی ہے۔ ان لوازمات کی وجہ سے نقشہ باہر کے کسکوں سے مل کر بالکل ستارہ نما ہوگیا ہے۔ دیولوں کا بیرونی حصہ منبت کاری کے کام سے اسی طرح آراستہ ہے جیسا کہ کنارک اور کھجراؤ کے مندروں کا آراستہ ہے۔ لیکن دکن کے دیولوں کی کرسی اتنی اونچی نہیں ہے جیسا کہ کھجراؤ کے دیولوں کی ہے۔ اور جہاں کہیں زیادہ اونچی بھی ہے عمارت سے ملحق چاروں طرف چبوترہ بنا دیا گیا ہے جس سے عمارت کو استحکام بھی حاصل ہوگیا ہے اور غیر موزونیت بھی رفع ہوگئی ہے۔ دکن کے دیولوں میں ورنگل کا ہزار ستون کا دیول اور رانگی کا مہا دیو کا مندر ستونوں کی مختلف اشکال اور سنگتراشی کے نفیس کام کی وجہ سے مشہور ہیں۔ رامپا کے دیول میں ناچنے والیوں کی سیاہ پتھر کی مورتیں چھتوں کے سہارے کے لئے نصب کی گئی ہیں۔

ان مورتوں کے انداز میں اصلیت کا رنگ بہت غالب ہے۔

ہالی بیدا اور بیلور کے مشہور دیول اگرچہ علاقہ میسور میں واقع ہیں لیکن ان کے سطحی نقشے اور بیرونی منبت کاری اور دیواروں کے کسکے بالکل دکن کے مندروں سے مشابہ ہیں اس لئے اب میں آپ کے سامنے صرف کانجی ورم اور تنجور کے دیولوں کا ذکر کروں گا جن کی ساخت سے آپ کو ہندوستان کے وسطی زمانہ کی تعمیر کا حال اور زیادہ واضح ہوجائیگا

کانجی ورم یا کانجی پور نہایت قدیم بستی ہے۔ یہ پالوا خاندان کے بادشاہوں کی راجدھانی تھا۔ ایک زمانہ تک بدھ مت کے زیر اثر رہا۔ چینی سیاح ہوئین چوئینگ یہاں بھی پہنچا۔ چنانچہ اس نے ذکر کیا ہے کہ کانجی پور میں کئی سو بدھ مذہب کی عبادتگاہیں تھیں۔ اور اتنی ہی مندر ہندو مذہب کے بھی تھے۔ پالوا خاندان کے بعد یہاں چولا سلسلہ کے راجہ حکمراں ہوئے۔ کانجی ورم میں اب بھی بہت سے دیول ہیں لیکن ان میں کیلاش ناتھ نامی جنوبی ہند کے فن تعمیر کی تاریخ میں خاص اہمیت رکھتا ہے۔ کیونکہ اس کی وضع مہابلی پور کے پہاڑ میں تراشے ہوئے دھرم راج رتھ سے بیحد ملتی ہے اور ہمارے اس نظریہ کی توثیق ہوتی ہے کہ ہندوستان کے فن تعمیر کا ارتقا مسلمانوں کے آنے سے قبل لکڑی کی عمارات اور پہاڑ میں تراشیدہ عبادت گاہوں اور خانقاہوں سے ہوا تھا۔ ابتدا میں کانجی ورم کے اس دیول کا مورت کا کوٹھا منڈپ سے علٰحدہ تھا۔ لیکن بعد میں ایک اور منڈپ بیچ میں قائم کرکے تینوں کو آپس میں ملا دیا گیا۔ برج کا بالائی حصہ گول چھتری نما ہے اور نیچے کے حصہ میں کئی منزلیں ہیں جو درجہ بدرجہ مساحت میں کم ہوتی جاتی ہیں۔ ان منزلوں کی ساخت میں ستون اور نعل نما کھڑکیاں نمایاں ہیں جو بدھ مت کے معابد سے نقل کی گئی ہیں۔ اس مندر کے صحن کے اطراف میں جو حجروں کا سلسلہ ہے

ان میں شیو عقیدہ کی مورتیں تقریباً اسی طرح نصب کی گئی ہیں جیسا کہ ایلورہ کے کیلاش
میں ہیں جو پہاڑ میں تراشا ہوا ہے۔ جنوبی ہند کے بُرجوں کے بالائی حصہ کی وضع دو قسم
کی ہے۔ ایک تو گول چھتری نما جس میں بعض اوقات چھتری کی کمانوں کو بھی دکھا دیا
گیا ہے۔ اور دوسری پیپے نما **Barrel** یا بیل گاڑی کے اوپر کے ٹھاٹر کی شکل کی۔
دوسری شکل ان بُرجوں پر جو دروازوں پر بنائے گئے ہیں زیادہ نمایاں ہے۔

تنجور میں بھی بہت سے دیول ہیں لیکن وہاں کا بڑا مندر دسویں صدی کے
آخر یا گیارہویں صدی کے شروع کا بنا ہوا ہے۔ یہ عبادت گاہ شیو مذہب سے تعلق
رکھتی ہے۔ اصل مندر کی عمارت دو منزل ہے۔ اور طول و عرض کے لحاظ سے ۸۲ فیٹ
مربع ہے لیکن اس دو منزلہ عمارت پر جو بُرج قائم کیا گیا ہے وہ سطح زمین سے ۱۹۰
فیٹ بلند ہے اور اس کے تیرہ کھنڈ ہیں جن کی ہئیت مربع ہے اور بتدریج بالائی
جانب ان کی مساحت کم ہوتی جاتی ہے سب میں اوپر چھتری نما گول گنبد ہے جو ایک
ہی پتھر کا تراشا ہوا ہے تنجور کے اس دیول کے دروازے کے اوپر بھی برج ہے
لیکن وہ بہت بعد کا یعنی غالباً سولہویں صدی کا بنا ہوا ہے۔ جنوبی ہند کی عبادتگاہوں
میں دسویں گیارہویں صدی تک جو برج اصلی مندر کی عمارت پر ہیں وہ دروازے
کے برجوں سے زیادہ بلند ہیں اور یہ زیبا بھی تھا کیونکہ تقدس کے لحاظ سے اصل
عمارت دروازہ پر فوقیت رکھتی ہے۔ لیکن بعد کی عمارتوں میں دروازوں کے برج
مورت کے کوٹھوں کے برجوں سے کہیں زیادہ بلند بنائے گئے ہیں۔ یہ سر بہ فلک عمارتیں
جو جنوبی ہند کی اصطلاح میں گوپرم کے نام سے مشہور ہیں مدرا اور کمبا کونم کے دیولوں
میں خاص طور سے قابل دید ہیں۔

۲۹۸

مسلمان مکران میں تو ساتویں صدی ہی میں پہنچ گئے تھے اور ۱۲ ء عیسوی میں محمد بن قاسم نے سندھ فتح کر لیا۔ لیکن اسلامی فنون لطیفہ کی تاریخ ہندوستان کی سرزمین میں سلطان شہاب الدین غوری کے عہد سے سمجھنی چاہئے جب قنوج اور اجمیر فتح ہوئے اور دہلی کے اسلامی دارالسلطنت کی بنیاد پڑی۔ یہ واقعات بارہویں صدی کے آخر اور تیرہویں صدی کے شروع کے ہیں۔ ٹھیک وہی زمانہ جہاں تک عمارات کی تاریخ کا تعلق ہے آپ کے سامنے پیش کیا جا چکا ہے۔

مسلمان کس طرح آئے اس کا اندازہ اس امر سے ہو سکتا ہے کہ سوا سو ڈیڑھ سو برس میں ان کی سلطنت کابل سے لے کر آسام تک اور دہلی سے لے کر دولت آباد تک قائم ہو گئی۔ فن تعمیر کا انہیں خاص ذوق تھا اور ہندسی اور جر ثقیل سے خوب واقف تھے۔ مینار، گنبد اور محراب بنانے میں یہ پہلے ہی کمال حاصل کر چکے تھے۔ گچ کے استعمال کو بھی خوب جانتے تھے علاوہ ازیں ایران کے اثر سے اُنھوں نے چینی کے کام میں بھی کافی مہارت پیدا کر لی تھی۔ اور شام کی ابتدائی حکومت کے زمانہ میں بازنتین کی پچیکاری کی صنعت سے بھی واقفیت حاصل کر چکے تھے۔ چنانچہ جب یہاں آئے تو فنی خصوصیات کا یہ تحفہ ہند کے اہل کمال کے لئے اپنے ساتھ لائے مسلمانوں کا پہلا تعمیری کارنامہ مسجد قوت الاسلام ہے۔ مسجد کا مینار جو قطب صاحب کی لاٹھ سے موسوم ہے آسمان سے باتیں کرتا ہے۔ اس کی تعمیر ۱۱۹۳ء میں قطب الدین ایبک کے حکم سے شروع ہوئی۔ ایبک اس زمانہ میں دہلی میں محمد بن غوری کے نائب کی حیثیت سے متعین تھا۔ مینار کی پانچ منزلیں ہیں جن کو دہلی والے کھنڈ کہتے ہیں۔ پہلا کھنڈ ایبک کے وقت میں تعمیر ہوا اور باقی التمش کے عہد میں۔ لیکن فیروز شاہ تغلق نے اوپر کے دو کھنڈوں میں بہت

کچھ تغیر و تبدل کیا اور سب میں اوپر کے کھنڈ پر ایک چھتری بھی بنائی۔ پوری لاٹھ ۲۳۸ فیٹ بلند ہے۔ بالکل اسی زمانہ میں یعنی بارہویں صدی کے آخر میں جابر مہندس نے الموحد خاندان کے بادشاہ یعقوب بن یوسف کے حکم سے اشبیلیہ مراقش اور رباط میں مینار بنائے تھے جن کی عظمت اور شان اور استحکام کی اسلامی دنیا میں دھوم تھی۔ میں نے ان میناروں کو خود اپنی آنکھ سے دیکھا ہے۔ ان کی بلندی قطب صاحب کی لاٹھ سے ۔۔ فیٹ زیادہ ہے۔ لیکن خوبصورتی کے لحاظ سے ان کا دہلی کے مینار سے کوئی مقابلہ نہیں۔ افریقہ اور اسپین کے ان میناروں کی وضع نیچے سے اوپر تک مربع ہے۔ جس سے عمارت میں ایک قسم کی کاوا کی پیدا ہو گئی ہے۔ قطب کی لاٹھ میں معمار نے اول تو کھنڈوں کی وضع مختلف رکھی ہے اس کے علاوہ کتبوں کو اس خوبصورتی سے عمارت کے اطراف میں کندہ کیا ہے کہ نظر کو بے حد بھلے معلوم ہوتے ہیں۔ عمارت کی تیاری میں ظاہر ہے کہ بیسیوں ہندی معمار مقرر کئے گئے ہوں گے۔ کیونکہ یہ ابتدائی زمانہ تھا اور محمدؐ غوری کے ساتھ سوائے چند استادوں کے زیادہ مہندس نہ آئے ہونگے۔ سنگتراشی کے فن میں ہندی معماروں کو کمال حاصل تھا۔ ہزاروں وضع کی ستون تراشنا جانتے تھے۔ قطب صاحب کی لاٹھ پر کتبے جس طرح منبت کئے گئے ہیں اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یہ کام ہندو معماروں کا ہے۔ کیونکہ بالکل اسی طرح وہ ستونوں پر منبت کاری کے آرائشی پٹے بنانے کے عادی تھے۔

مسجد قوت الاسلام کی محرابوں سے بھی ہندی معماروں کی صنعت ظاہر ہوتی ہے۔ محرابوں کے اطراف میں کتبوں کو انھوں نے اسی قرینے سے منبت کیا ہے جیسا کہ وہ مندروں کے دروازوں پر نقش و نگار بناتے تھے۔ علاوہ ازیں محرابوں کی تعمیر ڈاٹ

کے اصول پر نہیں ہوتی۔ بلکہ پتھروں کو افقی سلسلوں میں نصب کر کے اوپر کی جانب اس طرح گھٹایا ہے کہ محرابی شکل پیدا ہو گئی ہے۔ عمارت کا نقشہ بیشک کسی مسلم مہندس نے بنایا ہوگا۔ لیکن عمارت کی تکمیل ہندی معماروں کے ہاتھ سے ہوئی جیسا کہ ساخت اور آرائشی کام سے ظاہر ہے۔ اجمیر کی مسجد جو اڑھائی دن کے جھونپڑے کے نام سے موسوم ہے مسلمانوں کی اولوالعزمی اور شان اور شوکت کا دوسرا کارنامہ ہے۔ محرابیں نہایت بلند اور خوش وضع ہیں۔ لیکن فن تعمیر کے لحاظ سے ناقص ہیں کیونکہ ڈاٹ کے اصول پر نہیں بنائی گئیں۔ یہ غلطی مسلمان معماروں کی کمی کی وجہ سے واقع ہوئی ہندی معماروں نے ظاہر میں تو محراب کی شکل اسلامی وضع کی بنا دی ہے لیکن اصولاً وہ ٹھیک نہیں۔

۳۰۰

دہلی میں اسلامی دارالسلطنت قائم ہونے کے تھوڑے ہی عرصہ بعد ترکستان، ایران اور مغربی ایشیا سے مہندسین اور اہل کمال کے آنے کا سلسلہ شروع ہو گیا اور یہ مغلیہ سلاطین کے وقت تک جاری رہا جس کا پتہ ہم کو تاریخ سے ملتا ہے۔ ان مہندسین نے خالص اسلامی طرز کی عمارات بنانی شروع کر دیں جن کی بہت عمدہ مثالیں حضرت نظام الدین اولیا کی درگاہ کی مسجد اور علائی دروازہ ہیں۔ پہلی عمارت جماعت خانہ کے نام سے مشہور ہے۔ اِس کا درمیانی حصہ علاؤالدین خلجی کے بیٹے خضر خاں کا بنایا ہوا ہے۔ گنبد نیم کرہ کی شکل کا نہایت شاندار ہے اور اس کے زور کو روکنے کے لئے دیواروں کے بالائی حصہ میں جہاں گنبد قائم کیا گیا ہے چاروں کونوں میں چھوٹی محرابیں بنا دی ہیں۔ گنبد اور محراب میں تعمیر کے لحاظ سے بیرونی جانب ہٹنے کا میلان ہوتا ہے۔ اِس میلان کو روکنے کے لئے یورپ کے مہندسین نے اپنے گنبدوں

کے استحکام کے لئے باہر کی جانب پشتیبان بنائے ہیں۔ لیکن یہ پشتیبان عمارت کی بیرونی
ہئیت کو بدنما کردیتے ہیں۔ چنانچہ یورپ کے تمام بڑے بڑے گنبدوں میں یہ عیب
موجود ہے۔ مسلمان مہندسین نے گنبد کے اس میلان کو روکنے کے لئے اندر چھوٹی چھوٹی
محرابیں اور اقلیدسی اشکال بنائی ہیں۔ مسلمانوں کی اس تدبیر سے گنبد کا بیرونی
میلان بھی رک گیا ہے اور عمارت کے اندرونی حصہ میں ایک قسم کی رعنائی بھی پیدا
ہوگئی ہے۔ علائی دروازہ کے اندرونی حصہ میں یہ چھوٹی چھوٹی اقلیدسی اشکال نہایت
خوبصورت طریقہ سے بنائی گئی ہیں جماعت خانہ اور علائی دروازہ دونوں میں محرابیں
نہایت موزوں اور متناسب ہیں۔ اور آرائشی کام یعنی نبت کاری اور جالیوں
سے بھی ذوق کی نفاست عیاں ہے۔ علاوہ ازیں سنگ مرمر کی لوحوں کو سُرخ
پتھر میں نہایت خوش سلیقگی سے نصب کیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کو
اپنی تعمیر کے حسن کو دوبالا کرنے کے لئے رنگ کے احساس کا شروع سے خیال تھا۔

خلجیوں کے بعد تغلق خاندان برسرحکومت ہوا۔ ان کی عمارتوں میں استحکام اور
قوت بیشک ہے لیکن رعنائی کی شان کم ہے۔ مثال کے طور پر غیاث الدین تغلق کا
مقبرہ اور حوض خاص کی عمارات پیش کی جاسکتی ہیں تغلق بادشاہوں کے عہد میں ہندی
صنعت کا اثر کم پایا جاتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ تغلقی عمارتیں حُسن کے معیار کے
لحاظ سے گری ہوئی ہیں۔

مسلمان اپنی قوت کے زور میں یوں تو صدی ڈیڑھ صدی میں سارے ہندوستان
پر چھاگئے لیکن اس وسیع ملک میں بعد مسافت اور بڑے بڑے دریاؤں اور
پہاڑوں کے حائل ہونے کی وجہ سے اپنی سلطنت کو منظم نہ رکھ سکے۔ اور چودھویں

صدی میں دکن مالوہ، گجرات، جونپور اور بنگالہ میں صوبہ داری خود مختار حکومتیں قائم ہوگئیں۔ ہندوستان میں مسلمانوں کے آنے سے پہلے بھی ان حصوں میں چھوٹی چھوٹی خود مختار حکومتیں موجود تھیں اور ان کے دوبارہ قیام کو گویا ہندوستان کے سیاسی نظام کی صدائے بازگشت سمجھنا چاہئے۔ ان صوبہ دار مسلمان حکومتوں کے دارالخلافوں میں بھی اسلامی ممالک کے اہل کمال آتے رہے لیکن ظاہر ہے کہ ان کی تعداد اتنی نہیں تھی کہ مقامی صناعوں کے میلان کو روک سکتے۔ اس لئے سوائے چند عمارتوں کے ان سب مقامات میں ہندی صنعت کا اثر نمایاں ہے۔ صوبوں کے خالص وضع کی اسلامی عمارتوں میں گلبرگہ کے قلعہ کی جامع مسجد اور مانڈو کی بڑی مسجد خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ ان دونوں عمارتوں میں طرز کی سادگی اور پاکیزگی کے علاوہ گنبد اور محرابوں کے سلسلوں کو اس کمال سے قائم کیا ہے کہ مذہبی عظمت و شان کے ساتھ ساتھ ایک روحانی اسراریت کا رنگ بھی نظر آتا ہے۔ گلبرگہ کی جامع مسجد ۱۳۶۷ء میں تعمیر ہوئی اور مانڈو کی مسجد اس کے کوئی اسی برس بعد ۱۴۵۴ء میں۔

مخلوط طرز کی صوبہ داری عمارتوں میں بعض تو ایسی ہیں کہ ان میں ہندی طرز نبھ گیا ہے لیکن بعض میں بے ترتیبی پیدا ہوگئی ہے۔ مثلاً احمد آباد کی جامع مسجد میں ہندی طرز کے ستون اور محرابوں کا آرائشی کام ایسا زیادہ بے موقع نہیں معلوم ہوتا لیکن اسی مقام پر محافظ خاں کی مسجد میں میناروں پر ہندی طرز کی آرائش اس افراط سے کی گئی ہے کہ ان کی ہیئت بالکل بدل گئی ہے اور عمارت میں ایک غیر موزونیت پیدا ہوگئی ہے۔

پندرہویں صدی میں دہلی اور اس کے نواح میں جو عمارات مرکزی حکومت کے ایماء سے تیار ہوئیں ان میں ہندی اثر گو موجود ہے لیکن ایسا شیر و شکر ہوگیا ہے کہ

بجائے بدمزہ ہونے کے خوشگوار معلوم ہوتا ہے۔ اس قسم کی عمارتوں میں لودی اور سادات خاندان کے بادشاہوں کے مقبرے ہیں۔ ان کے گنبد تو ابتدائی زمانہ کے نیم کرہ دی شکل کے ہیں لیکن ان کے بھاری پن کو کم کرنے کے لئے برج کے اطراف میں چھوٹی چھتریاں بنائی گئی ہیں اور نفس عمارت میں بھی چینی کے کام پتھر کی جالیوں اور چونے کے آرائشی نقش و نگار سے لطافت پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

۱۵۲۶ء میں پانی پت کے مقام پر بابر کی فتح ہندوستان کے فن تعمیر کی تاریخ میں ایک نئے دور کا آغاز کرتی ہے۔ لیکن اس کا نمایاں اثر ہم کو اکبر کے عہد تک نہیں ملتا۔ وجہ یہ ہے کہ بابر اور اس کے بیٹے ہمایوں کو سلطنت کے ایسے جھگڑے رہے کہ فن تعمیر میں خاطر خواہ اصلاح کرنے کا موقع نہ ملا۔ بابر تو اپنے توزک میں ہندی صنعت کی تعریف کرتا ہے لیکن ساتھ ہی یہ بھی لکھتا ہے کہ عمارتوں میں ہم آہنگی اور کاملیت نہیں ہے جو بالکل درست ہے۔ مغلوں کے زمانہ سے پہلے کی ہندوستان کی تمام عمارتوں میں کوئی نہ کوئی نقص اور بیڈھنگا پن ضرور موجود ہے۔

اکبر کے عہد کے فن تعمیر کا ذکر کرنے سے پہلے شیر شاہ کے زمانے کی دو عمارتوں پر تبصرہ کرنا ضروری ہے۔ ان میں ایک تو خود اس کا مقبرہ ہے جو سہسرام میں واقع ہے اور دوسری دہلی کے پرانے قلعہ کی مسجد ہے جس کو شیر شاہ نے ۱۵۴۶ء میں تعمیر کیا تھا۔ ان دونوں عمارتوں میں لودی اور سادات خاندان کے وقت کی تعمیری خصوصیات کے علاوہ کوئی نئی چیز نہیں ہے۔ لیکن انہی پرانی تیلیوں کو اس طرح ترتیب دیا ہے کہ دونوں عمارتوں میں سنگینی اور رنگینی جلال اور جمال کی خاص کیفیتیں پیدا ہو گئی ہیں۔

مغل بادشاہ جیسے انسانی کمال کے قدردان تھے ویسے ہی قدرتی مناظر کے شیدائی تھے۔ اسی وجہ سے انھوں نے اپنی عمارات میں آرائش اور تزئین کیلئے باغوں اور نہروں کا اضافہ کیا۔ یونانیوں کی طرح ان کو یہ بھی خیال تھا کہ عمارت کی شان کے لیے عمدہ پتھر کا بھی ہونا ضروری ہے۔ چنانچہ انھوں نے سنگ مرمر کو خوب رواج دیا۔ پچیکاری کی صنعت ان کے آنے سے پہلے ہند میں پہنچ چکی تھی۔ لیکن اُنھوں نے اس کو اپنے نفیس ذوق سے اور کمال کو پہنچایا۔ جالیوں اور مرغولوں کے کام میں ہندی سنگتراش پہلے ہی سے ماہر تھے۔ لیکن انکی سرپرستی اور نگرانی میں ان کا فن اور چمک گیا۔ گنبد اور محراب اور مینار کی شکلوں میں بھی ایسی اصلاح کی کہ وہ تناسب اور موزونیت کا نمونہ بن گئیں اس مختصر عام تنقید کے بعد میں آپ کے سامنے مغل بادشاہوں کی بعض عمارات کا ذکر کرتا ہوں۔

سب میں پہلے ہمایوں کے مقبرہ کی کیفیت بیان کیجاتی ہے اس میں باغ، چبوترہ، عمارات کی روکار کی بلند محرابیں اور گنبد کی شکل سب نئی چیزیں ہیں۔ اور ان سب نے مل کر عمارت میں عظمت اور شان اور ایک خاص رعنائی پیدا کردی ہے۔ سنگ مرمر کا استعمال بھی پہلی عمارتوں سے زیادہ ہے اور گنبد تو سارا سنگ مرمر کا ہی بنا ہوا ہے۔ ہمایوں کا مقبرہ اکبر کے عہد کا پہلا کارنامہ تھا اس کے بعد فن میں اور ترقی ہوئی۔ چنانچہ فتح پور سیکری کی مسجد اور اس کا عالیشان دروازہ جو اپنی رفعت کے لحاظ سے بلند دروازہ کے نام سے مشہور ہے۔ دونوں نفاست ذوق، الوالعزمی اور صنعتی کمال کے اعلیٰ نمونے ہیں۔ مسجد کے اندرونی ایوان میں اگر ہم جنوبی جانب کھڑے ہو کر کمانوں کے سلسلہ کو دیکھیں تو ان کے تناسب اور سنگ مرمر کے نفیس

کام پر بے اختیار سبحان اللہ کہنے کو جی چاہتا ہے۔ بلند دروازے کو کہتے ہیں اکبر نے خاندیس کی فتح کی یادگار میں تعمیر کیا تھا۔ سطح زمین سے کنگرہ تک اس کی بلندی ۱۷۶ فیٹ ہے۔ اگر ایسی تعمیر کے بعد اس کے دل میں ’جل جلالہ‘ کا جذبہ پیدا ہوا ہو تو تعجب کی بات نہیں۔

۱۵۶۹ء میں اکبر نے فتحپور سیکری کا نیا شہر تعمیر کرنا شروع کیا اور پندرہ سال تک عمارتیں بنتی رہیں۔ ان میں ہندی صنعت کو بے حد فروغ ہوا۔ چنانچہ جودھ بائی کے محل، بیربل کے مکان، دیوان خاص اور سلطانہ کے نشیمن میں ہندی فن تعمیر اور ہندی سنگتراشی نہایت دلپذیر صورتوں میں نمایاں ہیں۔ فتح پور سیکری میں پنچ محل کی ساخت بھی ذرا نرالی ہے اور ہندی وضع کی معلوم ہوتی ہے۔ بعد میں اکبر کا مقبرہ جو جہانگیر کے وقت میں تعمیر ہوا اس کی وضع بھی اسی طرح پنج منزلہ ہے۔

جہانگیر کے وقت میں تعمیر کی نفاست اور بڑھی۔ سنگ مرمر کا استعمال کثرت سے ہونے لگا۔ اندر عمارت کی زیبائش کے لیے پچیکاری کی صنعت کو فروغ ہوا۔ اس عہد کی تدریجی ترقی سمجھنے کے لیے سکندرہ میں اکبر کا مقبرہ اور آگرہ میں اعتماد الدولہ کا مزار دونوں بہترین عمارتیں ہیں۔

۱۶۲۸ء میں شاہ جہاں تخت سلطنت پر متمکن ہوا اور ۳۰ سال تک حکمران رہا۔ تعمیر کا بےحد شوق تھا اور ذوق بھی نہایت نفیس پایا تھا۔ شہر بسایا، قلعے بنائے، مسجدیں تعمیر کیں اور سب میں زیادہ اپنی چہیتی بیوی ممتاز محل کا مقبرہ بنایا جو عجوبہ روزگار ہوگیا آگرہ اور لاہور کے قلعوں میں اکبر اور جہانگیر کے زمانہ کی بہت سی عمارتیں تھیں ان سب کو توڑ کر سرے سے پھر تک سنگ مرمر کا بنایا۔ آگرہ کے قلعہ میں دیوان عام

دیوان خاص، خاص محل، شیش محل، مثمن برج، انگوری باغ، مچھی بھون اور موتی مسجد
شاہ جہاں ہی کے تعمیر کئے ہوئے ہیں۔ اسی طرح لاہور کے قلعہ میں بارگاہ چہل ستون،
مثمن برج، خواب گاہ اور نولکھا شاہ جہاں ہی کے بنائے ہوئے ہیں۔ ان عمارتوں
کی نفاست اور پچیکاری کی خوبصورتی کا بیان کرنا زبان سے مشکل ہے۔ آگرہ کے
مثمن برج کی لطافت کو دیکھ کر کون سا بدذوق انسان ہوگا جس کے دل اور آنکھوں
کو سرور حاصل نہ ہو۔ یہی حال بی بی کے روضہ کا ہے۔ نادر مزنگ نے تو اس کو دنیں
کے ایک جہند میں جو ہو بہو بروبہو ہی کے تخیل کا نتیجہ لکھ دیا۔ خدا کا شکر ہے کہ فارسی
زبان میں ایسی تاریخیں موجود ہیں جن میں اس عمارت کی مفصل کیفیت اور بنانے والوں
کے نام درج ہیں اور سب میں زیادہ تو خود عمارت کی ساخت ہے جو بہ آواز بلند
کہہ رہی ہے کہ میں اسی ملک کے صنعت اور کمال کا نمونہ ہوں۔ جو اصحاب فن تعمیر سے
واقف ہیں ان سے کہا جا سکتا ہے کہ اس عمارت کا نقشہ بیش دکم وہی ہے جو ہمایوں
اور خانخاناں کے مقبروں کا ہے۔ مینار ہم کو ہمایوں کے مقبرہ میں نظر نہیں آتے لیکن
اکبر کے مقبرہ میں جو سکندرہ میں واقع ہے یہ موجود ہیں۔ تبدیلی اتنی ہے کہ دروازے
سے لے کر ان کو چبوترے پر نصب کیا ہے۔ ہمایوں کے مقبرہ میں گنبد کی ہیئت ذرا
بھاری تھی تاج محل میں اس کو شلغمی صورت کا بنا کر ثقالت کو رفع کر دیا ہے۔ پچیکاری
کی صنعت اکبر کے زمانہ میں ہی خاصی فروغ پا گئی تھی۔ جہانگیر کے زمانہ میں اس کو اور
ترقی ہوئی اور شاہجہاں کے زمانہ میں کمال کو پہنچ گئی۔ شاہ جہاں نے عمارت کی
تکمیل کے لئے اہل فن کو دور دور کے ملکوں سے بلایا تھا۔ چنانچہ تاریخ میں ان
صاحبان کمال کے نام درج ہیں۔ اس ضمن میں پچیکاری کے کام کے لئے کسی نیپلز

یا دنیس کے کاریگر کو بھی نوکر رکھ لیا ہو تو تعجب نہیں۔ لیکن یہ ادعا کہ ساری عمارت کسی اطالوی کی بنائی ہوئی ہے ذرا مضحکہ خیز ہے۔ کیونکہ اس وقت کے اطالیہ کے طرز تعمیر کو دیکھتے ہیں جو بیروک کے نام سے مشہور ہے تو بھدے پن اور بد ذوقی کا نقشہ ہماری آنکھوں میں پھر جاتا ہے۔

شاہ جہاں کے بعد اورنگ زیب تخت نشین ہوا۔ اس کی ساری زندگی سیاسی مہموں کے طے کرنے میں گزری۔ اس لئے فن تعمیر میں کوئی خاص ترقی نہ ہوئی۔ اورنگ زیب کے بعد اس کی اولاد اور مغلیہ سلطنت کے آخری تاجدار اور زیادہ جھگڑوں اور کشمکش میں مبتلا رہے۔ چنانچہ ان کی کمزوری اور ملک میں بدامنی کی وجہ سے فن میں انحطاط پیدا ہونا شروع ہو گیا۔ اور آخر نوبت یہ پہنچی کہ ہندوستان کے فن تعمیر کا نمونہ فوج کی بارکیں ڈاک بنگلے اور عدالتوں اور دفتروں کی عمارتیں بن گئیں۔

میں اشوک کے زمانے سے لے کر شاہجہاں کے زمانہ تک تقریباً دو ہزار سال کی داستان آپ کو سنا چکا۔ تنقید کرتے وقت حسن و قبح دونوں پر نظر ڈالنی پڑتی ہے۔ لیکن آپ کی قدیم یادگاریں ایسی نہیں کہ آپ دنیا کے دوسرے ممالک کی یادگاروں سے ان کا مقابلہ کرنے میں کسی طرح شرمائیں۔ مثلاً اگر اہل عراق بابل اور نینوا کی حیوانی تماثیل پر فخر کرتے ہیں تو آپ بھی سارناتھ اور سانچی کے شیروں اور ہاتھیوں کے مجسموں پر فخر کر سکتے ہیں۔ اگر اطالیہ کے رہنے والوں کو پومپیائی اور سائنیا کی قدیم تصاویر پر گھمنڈ ہے تو آپ بھی اجنٹا کی نقاشی پر گھمنڈ کر سکتے ہیں اگر اہل مصر کو ابوالہول اور کارنک کے معبد کی عظمت و شکوہ اور جبروتی شان پر غرور ہے تو آپ بھی ایلورہ کے کیلاش کی عظمت و شکوہ اور ایلی فنٹا کی تری مورتی

کی جمالی اور جلالی شان پر لن ترانی کر سکتے ہیں۔ اگر یورپ والے اپنے قوطی طرز کے
گرجاؤں کے فنِ تعمیر پر فخر کرتے ہیں تو آپ بھی مدرا اور تنجور، کمبا کونم اور ہالی بید کے
دیولوں کے سر بفلک دروازوں اور اعلیٰ سنگتراشی پر فخر کر سکتے ہیں۔ اگر اہلِ ہسپانیہ
کو اشبلیہ و غرناطہ کے محلات کی نفاست اور خوبصورتی پر ناز ہے تو آپ بھی تاج محل
اور آگرہ کے مثمن برج کے حسن و جمال پر ناز کر سکتے ہیں۔ مقابلہ کا سلسلہ اس طرح
اور جاری رکھا جا سکتا ہے اور آپ کسی طرح سے ہیٹے نہ رہیں گے۔
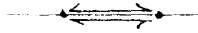
مہا مہو

آزادیٔ ہند کی دوسری سالگرہ کا علمی پیشکش

راجگان آندہرا

(از)

علامہ حکیم سید شمس اللہ قادری صاحب ماہر آثار قدیمہ

۱۵۔ اگست سنہ ۱۹۴۹ء

راجہ رام موہن رائے نے ہندوستانیوں کو ایک بلند مقام پر پہنچانے کی نیت سے ان تمام بڑی بڑی تحریکوں کی داغ بیل ڈالی جو انیسویں صدی کی امتیازی خصوصیات کو اپنے اندر سموئے ہوئے تھیں۔ ان تحریکوں کی ابتداء کرنے کے بعد سے وہ نئے ہندوستان کے پیغمبر اور جمہوریت پرست کی حیثیت سے اپنے اصولوں پر مضبوطی سے قائم بھی رہے۔ ۲۷ ستمبر ۱۸۳۳ء کو انھوں نے اس دار فانی سے رحلت کی۔

تاریخ کے کئی ادوار سے ہم گذر چکے ہیں۔ اگر کُل نہیں تو کم از کم چھ ہزار سال کی انسانی جدوجہد، انسانی دکھ درد، اور انسانی کامیابیوں اور ناکامیوں کی داستانوں کو ہم نے قلمبند بھی کر لیا ہے۔ حضرت انسان کے اس طویل ڈرامہ میں، ہمیں اکثر شخصیتیں ایسی بھی نظر آجاتی ہیں، جن کو ہم اگر "خودی یا خود پسندی" کی زندگی بسر کرنیوالے افراد کہیں تو بیجا نہ ہوگا۔ کیونکہ ان لوگوں نے سماج، سیاست اور مذہب کے معاملہ میں وہی پرانی روایتوں کو بلا چوں و چرا قبول کر کے اپنی جگہ مطمئن ہو بیٹھے تھے۔ اور غور و فکر کو طاق نسیاں پر رکھ چھوڑا تھا۔ معمولی انسان ہی حسب عادت اپنی زندگی بسر کرتا ہے، جس کی بنیاد خوف، ادب، تعظیم اور تقلید پر قائم ہوتی ہے۔ لیکن ایسے بھی لوگ دیکھنے میں آتے ہیں، جنھوں نے حصول کمال میں بڑی کامیاب کوششیں کی تھیں۔ ایسے لوگوں کا گروہ بھی ملتا ہے، جو ایسے اداروں کا سخت مخالف تھا

جن کی افادیت مدتوں پہلے ختم ہو چکی تھی' مگر عوام عادت کے طور پر ان اداروں کی غلامی کئے جا رہے تھے۔ ایسے لوگوں کی جماعت کو بھی پیش کیا جا سکتا ہے جنھوں نے ایسے لوگوں کی کورانہ تقلید کرنے سے صاف انکار کر دیا تھا' جو اپنے تجربے' ذہانت اور اقتدار کے گھمنڈ میں' عوام سے اپنی پیروی کرنے کا مطالبہ کرتے تھے' ایسے لوگوں کی بھی کمی نہیں جو اپنی آزاد خیالی اور آزادی عمل سے پیدا ہونے والے دنیوی نتائج سے ہرگز نہیں گھبراتے تھے۔ اگر دنیا ہر زمانے میں ہمارے سامنے ایسی ہستیوں کی مثالیں پیش نہ کرتی رہتی تو انسان کی زندگی بالکل ساکن ہو جاتی' ترقی کی راہیں مسدود ہو جاتیں اور نہ ہی سکون قلب ایک مضحکہ خیز چیز بن کر رہ جاتا۔ اسی قسم کی ہستیوں کو ہم ہیرو' سورما' معماران قوم' مہاتما' بزرگان دین یا پیشوایان قوم کے لقب سے ملقب کرتے ہیں۔ یہی لوگ ہر زمانے میں اپنی نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔ مگر افسوس ہے تو یہ کہ انہی کے زمانے میں انہی کے لوگ انہیں بدنام اور رسوا کرتے ہیں۔ باوجود اس کے ان کا کام ہمیشہ کے لئے قائم رہتا ہے' اور انہی کے کام کی نوعیت کو دیکھتے ہوئے ہم ان کی زندگی اور ان کے کردار کا صحیح اندازہ کر سکتے ہیں ایسے وقت بھی آتے ہیں' جب کہ انسانی اعمال کا سیاسی' سماجی یا مذہبی' کوئی ایک پہلو فوری اصلاح طلب بنجاتا ہے' اور اسی وقت کوئی نہ کوئی سیاس' سماجی مصلح یا نبی پیدا ہو جاتا ہے۔ لیکن ایسے بھی اوقات آتے ہیں جب کہ ساری قوم کے کل پرزے درہم برہم ہو جاتے ہیں' اور پوری مشنری کو از سر نو درست کرنا پڑتا ہے' اس وقت معماران قوم ہی کو نبی' سیاس' اور سوشل ریفارمر یا مصلح قوم کا کام بھی انجام دینا پڑتا ہے۔

انیسویں صدی کے شروع ہوتے ہی ہندوستان میں اسی قسم کے پیچیدہ مسائل اٹھ کھڑے ہوئے۔ ہندوستان میں نئی فتوحات کا دور ختم ہو چکا تھا۔ اسلئے ایک ایسے دور کے آغاز کی ضرورت تھی جس میں تمام ہندوستان کو متحد و متفق کیا جائے اس کام کا سہرا راجہ رام موہن رائے کے سر ہے۔ کیونکہ انھوں نے ہندوستان کو سب سے پہلے گہری نیند سے جگا کر یہ بتلایا کہ زمانہ سلف میں ہندوستانیوں کا صحیح مذہب کیا تھا اور اب کیا ہے۔ گذشتہ کے نصب العین اور حالیہ حقایق کے درمیان جو خوفناک خلیج پیدا ہو گئی تھی، اس سے بھی آگاہ کیا۔ اسی وجہ سے رام موہن رائے نئے ہندوستان کے پیشرو مانے جاتے ہیں۔ اٹھارویں صدی کے ختم پر رام موہن رائے بالکل شباب پر تھے۔ ایک پروہت نے ان کے سامنے اسی مذہب کو پیش کیا، جو ایک تقلید پسند برہمنی خاندان میں پیش کیا جاتا تھا۔ آجکل کے تقلید پسند گھرانوں کے نوجوانوں کو عام طور پر مذہب سے زیادہ لگاؤ نہیں ہوتا۔ یہی حال رام موہن رائے کا بھی تھا کہ انھوں نے پروہت کے پیش کئے ہوئے مذہب کی طرف زیادہ دھیان نہیں دیا۔ اس عدم توجہی کی وجہ سے ان کے والدین، ان سے سخت ناراض ہو گئے۔ جیسا کہ آج بھی اکثر نوجوان بے جا جسارت دکھاتے ہوئے خاندانی مذہب کی رسوم شکنی کر کے اپنے والدین کو ناراض کر دیتے ہیں۔ لیکن رام موہن رائے کا احتجاج، مذہب سے بالکلیہ انکار نہیں تھا۔ اور نہ خود نمائش یا خود غرضی کی وجہ سے انھوں نے ایسا کیا تھا۔ اور نہ وہ ایسی دنیوی کامیابی کے لئے کیا تھا، کہ ناکامی کی صورت میں دوبارہ پروہت کی گرفت میں پھنس جاتے رسمی مذہب کے خلاف ان کا احتجاج صرف اسی لئے تھا کہ وہ ریسرچ کے ذریعہ مذہب کی صحیح بنیادوں کی کھوج لگانا چاہتے تھے۔ ان کی تحریک کسی صورت میں بھی تخریبی

نہیں تھی۔ ان کا اصل مقصد مذہب کی از سر نو تعمیر تھا۔ جیسا کہ ایک عبرانی نوشتہ میں کہا گیا ہے کہ ایسی چیزیں جن کی بنیادیں ہل چکی ہوں یا وہ انسانوں کی الجھنوں اور پریشانیوں کا باعث بنیں، انہیں ترک کرکے ان کی جگہ مضبوط اصولوں کو دیجائے۔ اسی خیال سے رام موہن رائے ہندو مت کی سب سے قدیم کتابوں کو لے کر ان میں سے صرف بڑے بڑے اور اہم اصولوں کو چن لیا۔

آج کی ہندو اکثریت کو جن میں برہمن بھی شامل ہیں، انہیں یہ تک خبر نہیں کہ ویدوں اور اپنشدوں میں کیا لکھا ہے۔ عام آدمیوں کے مذہب کی بنیاد زیادہ تر پرانوں ہی پر مبنی ہوتی ہے۔ ویدوں اور اپنشدوں کے علم سے عوام محروم کردئے گئے ہیں۔ اٹھارویں اور انیسویں صدی کے مشرقی علوم کے ماہرین کو، ویدوں کے قلمی نسخوں کو حاصل کرنے میں، اور پنڈتوں (اسکالرس) کو ان کی تشریح کرنے میں، بڑی بڑی دقتیں اٹھانی پڑیں۔ اس تمام عرصے میں ہندوستان ان سربرآوردہ ماہران علوم شرقیہ کا رہین منت ہے کہ انھوں نے مغربی ممالک کو مشرقی علوم کی تشریح سے واقف کرایا۔ چاروں وید بڑی موٹی موٹی کتابیں ہیں۔ یوں تو صاحب نظر کے من میں خدا کی توحید کا عقیدہ جاگزیں تھا۔ لیکن اس وحدانیت کو مادے کی مختلف صورتوں کے ساتھ اس طرح گھلا ملا دیا گیا تھا کہ اس سے معمولی آدمی کا دماغ الجھن میں پڑ جاتا تھا۔ حالانکہ اپنشدوں میں خدا اور روح کی حقیقت پر بحث کی گئی ہے، اور خدا کے فضل کو حاصل کرنے کے طریقوں کی نسبت بار بار وضاحت کے ساتھ ذکر آچکا ہے۔ رام موہن رائے نے اپنشدوں کا گہری نظر سے مطالعہ کیا۔ اسکے بعض حصوں کے ترجمہ بھی انگریزی میں شائع کئے۔ اور اس طرح ہندومت کے اصولوں کو دوبارہ اس دعوے کیساتھ پیش کیا کہ

خدا ایک ہے اور اس کا ثانی کوئی نہیں (ایکا ایوا ادوی تیم) خدا دنیا پر محیط ہے۔ (اینشورم اوام سروم) خدا کی وحدانیت کے بارے میں برہمو سماج کا یہ بنیادی عقیدہ ہے۔ خدا تا در مطلق ہے، اور وہی ہمارا معبود ہے، اس کے سوائے اور کوئی معبود نہیں۔

رام موہن رائے کے کام کا یہی تعمیری پہلو ہے، جو قومی روایتوں اور قومی ثقافت کی بنیادوں پر از سر نو قایم کیا گیا ہے۔

اپنے پیدایشی مذہب کے اصولوں، ان لوگوں کے مذہبی اصولوں کو جن کا سیاسی عروج ہندوستان میں ابھی ابھی ختم ہوا تھا، اور اس زمانے کے بڑھتے ہوئے مسیحی اقتدار کے مذہبی اصولوں کو ایک دوسرے میں سمو دینا، راجہ رام موہن رائے کا دوسرا بڑا کارنامہ ہے، کیونکہ تاریخ ہمارے سامنے مختلف روایتیں اور مختلف تہذیبیں رکھنے والی قوموں کے درمیان، رضامندی کے ساتھ یا جبریہ طور پر آپس میں اختلاط پیدا کرنے کی مثالیں بھی پیش کرتی ہے۔ شبہ کی مستقل زندگی اور باہمی چشم پوشی اور رضامندی سے کوئی مفید نتیجہ نہیں نکلتا۔ تاریخ شاہد ہے کہ فتوحات کی ابتدائی مصائب کے ٹلتے ہی، فاتح اور مفتوح کے تصورات یک لخت مٹ جاتے ہیں۔ عام طور پر نہ سہی، کم سے کم ان چند شائستہ افراد کے دل میں تو ضرور یہ خیال پیدا ہو جاتا ہے، جن کی عوام تعظیم و تکریم کرتے ہیں۔ اس طرح کی مشترک تحریک سے تعمیری کوشش کی خاطر ایک نئی قوم پیدا ہو جاتی ہے۔ اس نئی قوم کے لوگ اپنے عقیدے سے پرانے اور فرسودہ اصولوں کو ترک کر دیتے ہیں۔ اور فخریہ انداز میں یہ محسوس کرنے لگتے ہیں کہ دنیا کی تمام تہذیبوں میں جو بنیادی حقیقت سرائت کئے ہوئے ہے، وہ اصل میں ایک ہی چیز ہے۔ یہی وہ احساس تھا جس کے مدنظر گرونانک نے یہ اعلان کیا تھا کہ

"نراکار آکال پرش" میں "رام اور رحیم" ایک ہو جاتے ہیں۔ اسی شعور کے تحت
ہندو مسلمان، دونوں کبیر جی کی نسبت یہ دعویٰ کرنے لگے تھے کہ کبیر جی ان کے ہیں۔

۳۱۷

اٹھارویں صدی میں وسعت نظر اور گہری بصیرت کی ضرورت تھی، تاکہ یسوع مسیح
کے اقوال، قرآن مجید کے ارشادات اور اپنشدوں کی تعلیمات میں ایک ہی مشترک
صداقت کو محسوس کیا جا سکے۔ یسوع مسیح کے اقوال، فارسی پمفلٹ تحفۃ الموحدین،
اور اپنشدوں کے ترجموں کو دیکھنے سے صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ راجہ رام موہن رائے
میں یہ بصیرت موجود تھی۔ زینو کے الفاظ میں انھوں نے یہ سبق دیا تھا کہ

"انسانوں کو ایران یا یونان کے باشندے نہ کہو، بلکہ ایک مشترک کھیت
کے ایسے حصہ دار سمجھو، جس کی کاشت سے پورے انسان اور قوم کا
ہر فرد یکساں فائدہ اٹھاتا ہے۔"

سنہ ۱۸۳۰ء میں رام موہن رائے، ہندوستان کو واپس نہ ہونے کے ارادے سے
انگلستان جانا چاہتے تھے۔ اپنے سفر سے چند مہینے پہلے انھوں نے عبادت کے لئے
کلکتہ میں ایک وسیع ہال تعمیر کرایا تھا، جو ان کا ایک اور زبردست کارنامہ ہے۔ یہی
عبادت گاہ، برہمو سماج کا سنگ بنیاد تھا۔ یہ ہال اسلئے بنوایا گیا تھا کہ ایک خدا
(خدائے وحدہٗ لا شریک) پر یقین کامل رکھنے والے سب لوگ بلا لحاظ مذہب و ملت
جمع ہو کر، اس غیر محدود ہستی کو اپنی پرخلوص محبت کی پیشکش کریں۔ چنانچہ اس خصوص
میں جو اقرار نامہ ترتیب دیا گیا تھا، اس کے الفاظ کو اچھی طرح ذہن میں رکھنا چاہیئے
کہ "عزت و احترام کے ساتھ جس طرح عبادت کرنا چاہیئے اس کا طریقہ بتلا دیا گیا ہے
اگر اس کے خلاف کوئی شخص یا اشخاص، کسی جاندار یا بے جان چیز کو معبود سمجھ لیں یا

اسکی پرستش شروع کردیں تو ان کو ایسا کرنیکی ہرگز اجازت نہ ہوگی۔ کیونکہ حقیقت میں نہ تو ابتک ایسا کیا جاتا رہا اور نہ اب کیا جاتا ہے اور نہ آئندہ کئے جانیکی امید ہے اور نہ کیا جا سکتا ہے۔ اس لئے جو لوگ تبلیغ و اشاعت، بھجن اور وعظ یا اسی قسم کی اور دوسری عبادتوں میں ایسے معبودوں کی طرف اشارہ کرتے ہیں یا آئندہ کرینگے، یا ترغیب دیتے ہیں یا ترغیب دینے کی کوشش کرتے ہیں، وہ غلطی کرتے ہیں، خدا کی شان میں سخت سُست کہتے ہیں۔ اس کی توہین کرتے ہیں۔ اس کا ذکر عزت سے نہیں کرتے"۔

۳۱۰

افسوس تو یہ ہے کہ راجہ رام موہن رائے اپنی محنتوں کو بارآور ہوتے ہوئے دیکھنے کے لئے زیادہ دن تک زندہ نہ رہ سکے۔ برہمو سماج کے سخت ترین مخالفین میں بھی کوئی شخص ایسا نہیں ملتا، جو ان کے دو بڑے جانشینوں یعنی مہارشی دیوندرناتھ ٹیگور اور کیشپ چندر سین کی خدا کی بندگی ریاضت و عبادت سے ایک دیرپا اثر قبول نہ کرتا ہو۔ دیوندرناتھ ٹیگور کا تعلق ایک شاہی خاندان سے تھا، لیکن اکثر پیشروؤں کے مانند، ان کے دل میں یہ یقین پیدا ہو گیا کہ انسان کو حقیقی دولت اسی وقت نصیب ہوتی ہے، جب کہ وہ اپنا سب کچھ خدا کی راہ میں خرچ کر دیتا ہے۔ (تینا، تیا کتینا، بھوان جیتھا۔ ماگر یدھیا کا سیا سیا دھنم) اگر ہم ہندوستان کی اصلی روح کا گیان حاصل کرنا چاہیں تو ٹیگور کی سوانح حیات کا مطالعہ کریں۔ جس روحانی قوت پر یہ دونوں خدا پرست عمل کرتے تھے، اس کی انھوں نے کبھی تشہیر نہیں کی۔ کیونکہ مراقبہ یا تفکر، دیوندرناتھ ٹیگور کی طاقت تھی تو کشف والقا کیشپ چندر سین کی قوت تھی۔ کیشپ چندر حیرت انگیز مبلغ تھے۔ انھوں نے نہ صرف شرابیوں کی اصلاح کی، بلکہ بدکار اور بدمعاشوں کو اس قابل بنا دیا کہ وہ اسم اعظم (خدا کا نام) کے اثرات کو محسوس کر سکیں تفصیلی فروعات

میں اختلافات رکھنے کے باوجود ٹیگور اور کیشپ چندر سین نے ملکر برہمو سماج کی تحریک کو کامیاب بنانے میں بہت بڑا حصہ ادا کیا ہے۔ دیویندر ناتھ اور کیشپ چندر ایسے نمونے تھے جن کی پیروی کرنے والوں کو یہ معلوم ہو چکا تھا کہ انسان کا رشتہ براہ راست خدا تعالیٰ سے قائم ہو سکتا ہے۔ خدا پُرخلوص دل سے نکلی ہوئی دعاؤں کو سنتا ہے۔ اس کے جلوے دنیا میں ہر جگہ نظر آتے ہیں۔ خدا انسان کے اندر اور باہر دونوں جگہ موجود ہے ہر کام میں انسانی ہاتھ کے ساتھ خدا کا ہاتھ بھی کام کرتا ہے، اس کے ہر قدم کے ساتھ خدا کا قدم بھی اٹھتا ہے۔ اعلیٰ وادنیٰ، ولی اور گنہگار، ہر ایک کے دل میں خدا موجود رہتا ہے۔ اگر چٹانوں کو الٹ کر دیکھو گے یا جنگلوں کو چیرتے جاؤ گے، تو وہاں بھی تمہیں خدا ضرور نظر آجائے گا۔ مختصر یہ کہ خود فراموشی اور جذب دل سے خدا کی لو لگائے رہیں، تو خدا ہر شخص کو ہر جگہ برابر نظر آتا ہے۔

یاد رہے کہ بڑی بڑی تحریکوں کی کامیابی کا دارومدار اعلیٰ وجدانات کے اظہار یا بے نظیر عقیدوں پر نہیں ہوتا۔ بلکہ ان زندہ نمونوں کی مقناطیسی شخصیتوں پر ہوتا ہے، جن کی سرشت میں یہ وجدانات اور عقیدے عملی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ مذہبی عقائد میں تنگ نظری پیدا ہونے کے امکانات اور میلانات پائے جاتے ہیں۔ اسی طرح کوئی عبادت گاہ ایک تھیٹر یا تماشا گاہ میں تبدیل بھی ہو سکتی ہے۔ عبادت گاہ کو یہ خطرہ لاحق ہونے کی اصل وجہ یہ ہوتی ہے کہ جب تک کسی مذہب کے پیرو اپنے بانی مذہب کے مقرر کردہ نصب العین کے معیار تک بلند نہیں ہوتے اور خدا کی ذات کو کائنات کے ہر ذرہ میں دیکھ نہیں سکتے، اس وقت تک ہم میں نہ تو خدا شناسی کا احساس پیدا ہوتا ہے اور نہ ہمارا ماحول خدا کے نور سے منور ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہوتی ہے کہ ہمارے

بملا اعمال ایک اداکار کی سی نقل بن کر رہ جاتے ہیں۔ پس برہمو سماج کا تیسرا نہایت ہی اہم پیغام ہے، کہ سب کا خالق ایک ہی خدا ہے۔ وہ بڑا رحیم ہے۔ جو لوگ عجز و انکساری سے اس کی عبادت اور پرستش کرتے ہیں، وہ ان پر اپنی حقیقت کو منکشف کرتا ہے۔

رام موہن رائے کا پورا کام بنیادی طور پر مذہبی ہے، تاہم اس کے اور بھی کئی پہلو ہیں۔ عورتوں کے مسائل کے بارے میں انھوں نے جو جنگ چھیڑ رکھی تھی، وہ ہندوستان کی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ ہے۔ غور کیجئے کہ ستی کی رسم کو منسوخ کرنے میں انہیں کتنا نہ لڑنا پڑا ہوگا۔ یوں تو ایک صدی سے چھوت چھات کا ازالہ ہو چکا، لیکن متعصب فرقہ کے لوگ گاندھی جی پر اس لئے لعن طعن کرتے ہیں کہ وہ (۲۵) سال سے چھوت چھات مٹانے کی تبلیغ کر رہے ہیں۔ تعلیم یافتہ طبقہ گاندھی کی تعریف تو کرتا ہے، لیکن اپنے آپ کو قدیم روایت کی بندھنوں سے آزاد کرانے میں بے حد سست ہے۔ دولہا دلہن کی شادی اور ان کی باہمی رضامندی کی عمر کو بڑھا دینا، یا مذہبی عطیوں کو کارآمد اغراض کے لئے استعمال کرنا جیسے سماجی اصلاحی قوانین کا منظور کرنا، گذشتہ تیس سال سے ہماری مقننہ کے لئے بڑی دشوار گذار اور کٹھن منزلیں تھیں۔ پس اپنے عزیز و اقربا کی ناراضگی کی پروانہ کرتے ہوئے اپنے ایقان کو ظاہر کر دینا بہت بڑی جرأت کا کام تھا۔ یہی نہیں بلکہ متعصب جماعت نے ستی کو منسوخ کرنے والے حکومت ہند کے احکام کے خلاف" بادشاہ بہ اجلاس کونسل" میں جو مرافعہ دائر کر دیا تھا، اس کی جوابدہی اور یکسوئی کے لئے راجہ رام موہن رائے کو سمندر پار کا سفر بھی کرنا پڑا تھا۔ جس کو انھوں نے گوارا کر لیا۔

اس میں ذرا بھی شک نہیں کہ راجہ رام موہن رائے ہندوستانی نشاۃ جدیدہ کے سب سے پہلے پیشرو تھے۔ انھوں نے جس کام کی ابتدا کی تھی، ہمارے زمانہ کے دو ہندوستانی ہستیاں مہاتما گاندھی اور رابندر ناتھ ٹیگور نے اس کام کی تکمیل کی۔ ان تینوں ہستیوں کی نسبت یہ کہنا صحیح ہے کہ یہ لوگ مشرق کے لئے مغرب کے پیغامبر تھے اور ایسے ہی مغرب کے لئے مشرق کے پیغامبر۔ اور اس طرح ان شخصیتوں نے مشرق اور مغرب میں اتحاد و اتفاق پیدا کرنے کی کوشش کی۔ مہاتما گاندھی کے قول کے مطابق "ایک دوسرے کے مذہب کو برا بھلا کہنا، بغیر احتیاط کے بیانات دینا، جھوٹ بولنا، بے گناہ لوگوں کا سر توڑ دینا، مندر اور مسجد کو ڈھا دینا، یہ سب باتیں خدا کے وجود کا انکار ہیں"۔ مہاتما جی کے نزدیک "ہندوستانی تہذیب" پوری کی پوری نہ تو ہندی ہے اور نہ مسلم اور نہ کسی دوسرے مذہب کی۔ وہ تمام تہذیبوں کا ایک مرکب ہے۔ وہ چاہتے تھے کہ ممکنہ آزادی کے ساتھ تمام ملکوں کی تہذیبیں اڑ کر ان کے گھر میں آ پڑیں اور کونے کونے میں پھیل جائیں۔

راجہ رام موہن رائے کے کارناموں میں، میکس مولر نے اسی احساس ہم جنسی کو محسوس کیا تھا۔ شانتی نکیتن میں ٹیگور نے اسی انس و محبت کو ترقی دینے کی خواہش ظاہر کی تھی۔ چنانچہ شانتی نکیتن کا یہ نصب العین مقرر کیا گیا تھا کہ اس درسگاہ میں کسی کے مذہب کو حقیر نہیں سمجھا جائے گا۔ ٹیگور اس خیال کو بڑی عمدگی سے بیان کرتے ہیں کہ "زندہ خدا تک ادنیٰ سے ادنیٰ ہستیوں کی بھی رسائی ہو جاتی ہے"۔

تسبیح پھیرنا، بھجن کرنا اور خدا کی تعریف کے گیت گانا، سب چھوڑ دو۔ مندر

کے دروازے بند کرکے اس کے تاریک گوشہ میں بیٹھے تم کس خدا کی پرستش کر رہے ہو؟ آنکھیں کھولو اور دیکھو کہ تمہارا خدا تمہارے سامنے نہیں ہے!

ارے خدا تو وہاں بھی ہے جہاں کسان سخت زمین میں ہل چلاتا ہے اور وہاں بھی ہے جہاں راستہ بنانے والا سخت چٹانیں توڑتا ہے۔

مترجمہ: مسٹر وانن راؤ انجو ٹگی

ہندو مسلمان ایک ہیں

(از)

مولوی سید غلام پنجتن (بی، اے۔ ال ال بی بیرسٹرایٹ لا)
سابق معتمد کانگریس کمیٹی اٹاوہ، سابق سشن جج حیدرآباد و سابق رکن مجلس آئین و قوانین

۱۵۔ اگسٹ سنہ ۱۹۴۹ء

چشتی نے جس زمین پہ پیغام حق سُنایا　　نانک نے جس چمن میں وحدت کا گیت گایا
تاتاریوں نے جس کو اپنا وطن بنایا　　جس نے حجازیوں سے دشت عرب چھڑایا
میرا وطن وہی ہے میرا وطن وہی ہے

یہ گیت علامہ اقبالؔ نے بچوں کے لئے لکھا تھا۔ بچوں کا گیت نہ شاعرانہ تصنع و تعلی کا بوجھ اُٹھا سکتا ہے نہ حقیقت سے دور ہو سکتا ہے۔ اس کا ہر مصرع

ہر چیز کہ در کانِ نمک رفت نمک شد

کی تفسیر ہی نہیں بلکہ وطنیت کی جیتی جاگتی ہنستی بولتی تصویر ہے۔ نسلوں سے نسلیں مل کر یوں ہی نئی نسلیں بنتی چلی آئی ہیں۔ نسلی اور مذہبی امتیاز پر سکونت ہمیشہ غالب رہی ہے۔ حسن بصری۔ سہیل یمنی۔ بلال حبشی اس کی مثالیں ہیں۔ خود رسولؐ کی آل مکہ و مدینہ سے نکل کر جیلانی۔ مشہدی اور بخاری کہلائی۔ جب ہندوستان میں آ کر بسے تو کوئی سادات بارہ کہلائے کوئی بلگرامی۔ علماء میں کوئی محدث دہلوی بنے کوئی بدایونی کوئی دیوبندی۔ فرنگی محلی تو اپنے سکونتی مکان کو اپنا طرۂ امتیاز بنا کر دنیائے علم و فضل میں آئے۔ ہماری آنکھوں دیکھی کل کی بات ہے کہ مولانا محمود الحسن صاحب رحمۃ اللہ جن کے معتقدین دنیائے اسلام میں پھیلے ہوئے تھے اور جن کی سنتِ نبوی کی پیروی کے چرچے بلادِ اسلامیہ میں ہر جگہ تھے۔ شیخ الہند ہی کہلاتے تھے۔ دین والوں کو

چھوڑ کر اب دنیا والوں میں آئے۔ صدیوں سے ہر زمانے کا نیا ادب اپنی سادگی، رعنائی اور رعنائیوں کے ساتھ مذہب کا فرق مٹاتا چلا آرہا ہے ہندوستان کے شاعروں اور ادبی صحبتوں کو دیکھئے۔ بلا تفریق مذہب و ملت سب ساتھ زانو سے زانو ملا کر بیٹھے تھے۔ دونوں کے محاورے اور بندشیں ایک ہوتی تھیں۔ فرق تھا مگر دہلوی اور لکھنوی کا۔ کاہستھ و مرزا کا نہیں۔ پنڈت اور میر کا نہیں۔ جو شخص ذاتی دانفضیلت نہ رکھتا ہو اس کیلئے یہ کہنا محال ہے کہ تسلیم نسیم۔ شاد۔ آزاد۔ سائل مائل۔ قرار سرشار۔ تفتہ شیفتہ۔ عالی محزون۔ شوق اور فراق میں کون کون مسلمان ہے کون کون ہندو۔ دونوں نے ملکر ایک مشترکہ ادب ہی نہیں بنایا بلکہ قومیت اور وطنیت بھی۔ حکومت بھی اس فرق کو مٹانے میں پیچھے نہیں رہی مسلمانوں میں راجہ محمود آباد۔ راجہ جہانگیر آباد۔ راجہ نان پارہ۔ چودھری اور کنور راجہ یہ سب پکارے گلے کہہ رہے ہیں کہ یہ سب کچھ ایک قوم بنانے کیلئے ہوا لیکن انگریزی سرکار نے ہندوؤں کو راجہ اور رائے بہادر مسلمانوں کو نواب اور خان بہادر بنا کر اس یکجہتی کو مٹانا شروع کر دیا اگرچہ علم و فضل مسلمان ہندوؤں سے حاصل کرتے تھے ہندو مسلمان سے لیکن ان میں بھی شمس العلما، اور مہامہوپادھیایہ کی دیوار کھڑی کر دی۔ سر ہنری ایلیٹ اور ان کے شاگردوں اور حواریوں نے تاریخ کو بدلنا اور مسخ کرنا شروع کر دیا اور تعلیم کے ساتھ ہندوستانیوں کے دلوں میں زہر بھرنا آغاز کیا۔ سومنات اور بنارس کی لوٹ مار کو ایک مذہبی جنون کا کرشمہ ٹھہرایا اور اس کو اڑا گئے کہ اس سے پہلے مکے اور مدینے کو تاراج کرنیوالے بھی مسلمان ہی تھے۔ انھوں نے اس حقیقت پر پردہ ڈال دیا کہ سکندر سے لیکر انگریز تک جو آیا وہ دولت کی چاٹ میں آیا۔ غزنوی یہ سمجھ کر نہیں آیا کہ جے پال ہندو ہے اور نادر یہ سمجھ کر تلوار نہیں روکا کہ محمد شاہ

مسلمان ہے درانی کی تلوار نے مرہٹوں کی قوت ہی صرف نہیں توڑی بلکہ مغلیہ سلطنت کی قبر بھی کھود دی۔ لالہ لاجپت رائے نے اپنی کتاب "ان ہیپی انڈیا" میں جس کو انگریزی سرکار نے ضبط کرایا تھا صاف صاف بتلا دیا ہے کہ فرقہ وارانہ نفاق برطانیہ کے عہد میں پیدا ہوا۔ اور پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو پر عمل رہا۔ کبھی ہندو کو بڑھایا کبھی مسلمان کو تھپ تھپایا۔ اس سے پہلے اعتماد اس درجہ بڑھا ہوا تھا کہ جب لکھنو پر ہاتھ ڈالا گیا تو لندن بھیجنے کے لئے اور واجد علی شاہ کی طرف سے پیروی کرنے کے لئے راجہ رام موہن رائے کو چنا گیا اور جب نانا صاحب کی بتنیت سے گورنر جنرل نے انکار کیا تو اپنا مشیر و صلاح کار نانا صاحب نے عظیم الدین کو بنایا۔

۱۸۵۷ء کی لڑائی سپاہیوں کی بغاوت نہ تھی بلکہ آزادی ہند کیلئے ہندوؤں مسلمانوں کی متحدہ لڑائی تھی جو وقت مقررہ سے کچھ دن پہلے شروع ہو گئی۔ نانا صاحب تانتیا ٹوپی رانی جھانسی کے ساتھ ساتھ مولوی احمد شاہ خاں۔ بخت خاں اور شہزادہ فیروز جان اور مال کی بازی لگائے ہوئے تھے۔ یہ سب سبز جھنڈا لہرا رہے تھے اور فوج بہادر شاہ کے نام کی سلامی اتارتی تھی۔ اس کے پورے اٹھائیس سال کے بعد کانگریس نے ایک انگریز مسٹر ہیوم کے ہاتھوں پر جنم لیا۔ زچہ خانے میں رحمت اللہ سیانی بھی موجود تھے۔ بدرالدین طیب جی کے ہاتھوں تیسرے سال اس کا دودھ بڑھا اور جب بچہ پیروں چلنے لگا تو نواب سید محمدؐ کی انگلی پکڑ کر چلا۔ جب یہ بچہ اشنان کے لئے پراگ آیا تو سر آکلینڈ کالوت نے سید احمد خاں جن کو اس کے سر پر سوار کرانا چاہا۔ مولوی احمد رضا خاں فتنوں کے نپٹنے لئے دھونی دینے آموجود ہوئے اور پنڈت اجودھیا ناتھ جی کا بول بالا رہا۔ کانگریس میں شرکت کے موافق جن علماء نے فتوے دئے تھے وہ

سے کے اور مدینے سے لیکر علی گڈھ تک کے تھے خود مولوی لطف اللہ اسی شہر کے تھے جہاں سر سید مسلمانوں کی قسمت سدھارنے کے لئے آئے تھے۔ اس زمانہ کی سیاسی جد وجہد بھی ہی کیا۔ سر سید کا گروہ حکومت پر انگریزوں کے ہاتھ میں تھا اور مسٹر بیک سر سید پر مسلط ہو گئے تھے اور کانگریس والوں کو آزاد خیال انگریز کھلونوں سے بہلا رہے تھے جو انگلستان سے اس زمانے میں تعلیم پا کر آتے تھے وہ جواہر لال اور سرو باش بوس نہ ہوتے تھے۔ ایمپائر کے معاملے میں قدامت پسند ہوں یا آزاد خیال سب ہی حکومت پسند تھے۔ سب ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے۔ لندن میں جو برٹش کمیٹی آف دی کانگریس بنائی گئی تھی اس میں ہیوم اور ودّربرن کے علاوہ ڈبلو ایس کین۔ سیموئل اسمتھ۔ ہربرٹ رابرٹ جو آگے چل کر لارڈ کاؤنٹ ہوئے شریک تھے۔ اس کمیٹی کا اخبار انڈیا تھا اس کے پہلے ایڈیٹر ولیم ڈگبی تھے اور پھر گورڈن ہیوارٹ جو بعد کو لارڈ ہیوارٹ لارڈ چیف جسٹس آف انگلینڈ ہوئے۔ حکومت کبھی سر پر ہاتھ پھیر دیتی تھی کبھی ڈانٹ بتا دیتی تھی۔ ۱۸۸۷ء میں مدراس کے گورنمنٹ ہوس تک کا سامان استقبالیہ کمیٹی کو مل گیا۔ اور دوسرے سال الہ آباد میں سر آکلینڈ کالوں نے کھلم کھلا اسکی مخالفت کی۔ ۱۹۱۴ء میں مدراس کے گورنر کانگریس کے کھلے اجلاس میں شریک ہوئے ۱۹۱۶ء میں لکھنؤ میں کانگریس کے ڈائس پر ہماری آنکھوں نے لارڈ میسٹن کو جو اس وقت سر جیمس مسٹن تھے بیٹھے ہوئے دیکھا اور کانوں نے ان کی تقریر بھی سنی۔

تقسیم بنگال کا جب ہنگامہ شروع ہوا تو بنگال کی صوبائی کانفرنس کی صدارت سلے رسول نے کی اور اکثر مسلمانوں نے ہندوؤں کا ساتھ دیا اور مورد عتاب بنے رہے تقسیم بنگال کے بعد ملک نے جو روش اختیار کی اس کی وجہ سے اور اس وقت کے پرنس آف ویلز

کے آمد کے سلسلے میں ۱۹۰۵ء میں کانگریس کے چوٹی کے لیڈروں میں خود اختلاف ہو گیا۔ گوکھلے اور سر سُریندر ناتھ بنرجی تلک مہاراج اور لالہ لاجپت رائے کے ساتھ نہ چل سکے۔ جب انگریزوں نے دیکھا کہ باوجود کانگریس میں پھوٹ پڑ جانے کے ان ہندو اور مسلمان لیڈروں کا اثر عوام پر خواہ ہندو ہو یا مسلمان بڑھتا چلا جاتا ہے جو باہمی اتفاق کے حامی ہیں تو انھوں نے ایسا حربہ نکالا جو تسمہ باقی نہ رکھے۔ مسلمانوں کے دلوں میں ایک طرف تو ان کی پولٹیکل اہمیت کا غرور پیدا کرایا گیا اور دوسری طرف ہندو اکثریت کا خوف دلوں میں بٹھایا گیا۔ غیر سرکاری انگریزوں نے حکومت پر اثر ڈالنا شروع کیا کہ اگر ہندو اور مسلمان مل گئے تو ہم کہیں کے نہ رہیں گے۔ باوجود اس کے کہ محمد علی جناح اور نواب سید محمد ایسے لوگ مخالف بھی رہے ۱۹۰۶ء میں مسلمان سر آغا خاں کو اپنا سردار بنا جداگانہ انتخاب کی التجا لیکر لارڈ منٹو کی بارگاہ میں شملہ پہونچ ہی گئے۔ اس دریوزہ گری کو ابھی چھ ماہ بھی نہیں گزرے تھے کہ علیگڈھ کالج کے طلبا انگریز پروفیسروں کی رسی گردن سے نکال قومیت کے جھنڈے تلے آ گئے۔ حسرت موہانی تو اسقدر تیز چلے کہ سب سے پہلے جیل میں پہونچ گئے لارڈ مارلے نے جداگانہ انتخاب کو اچھی نظر سے نہیں دیکھا انہیں گورنمنٹ آف انڈیا کے اصرار پر اس پر راضی ہونا پڑا کہ نشستیں محفوظ کر دی جائیں مگر دوسرے انگریز اس پر بھی راضی نہ ہوئے۔ سر ہربرٹ ریزلے جو اس وقت ہوم آفس میں تھے کہا جاتا ہے کہ بڑے دقیانوسی اور بڑی دور کی کوڑی لانیوالے تھے ان کے سامنے لارڈ مارلے کی اتنی بھی نہ چلی۔ انگلستان میں لارڈ زیٹ لینڈ اور سر ولیم جوئے سن ہکس اس بل کی مخالفت پر آمادہ تھے لارڈ مارلے نے یہ دیکھ کر کہ پارلیمنٹ میں جا کر سارا بل ہی پاش پاش نہ ہو جائے جداگانہ انتخاب پر آمادگی ظاہر کر دی اور ۱۹۰۹ء کا ایکٹ پاس ہو گیا

اور سب کو اس جدا گانہ انتخاب کی چوکھٹ پر سر گرونا ہی پڑا۔ اس پر بھی جب ۱۹۱۰ء میں پریس ایکٹ کی بلا نازل ہوئی تو مسلمان اخبار نویسوں میں سے مولانا محمد علی ابوالکلام آزاد اور ظفر علی خاں نے کامریڈ الہلال اور زمیندار کو پیش کیا اور تکالیف سہیں۔

جب انگلستان کے مرضی کے خلاف ۱۹۱۴ء میں جرمنی کے امپیریل چانسلر نے بلجیم کے ساتھ کئے ہوئے ۱۸۳۹ء کے دیرینہ معاہدے کو بیکار کاغذ کا ٹکڑا بتایا اور انگلستان جنگ میں شریک ہو گیا تو ہندوستانیوں نے یہ جانتے ہوئے کہ ہندوستان کے ساتھ کئے ہوئے وعدے انگلستان بھولتا ہی رہتا ہے۔ جنگ میں انگلستان کی پوری پوری مدد کی۔ تلک مہاراج جو اس وقت تک قید میں تھے چھوڑ دئے گئے انھوں نے اس موقعے پر ہندوستان کو انگلستان کے ساتھ باوفا رہنے کی پوری پوری تلقین کی مگر کچھ ایسی ہوا چلی کہ جان و مال کی قربانیوں کے اعتراف میں ڈیفنس آف انڈیا ایکٹ ملا۔ جس کا استعمال نہایت آزادی سے کیا گیا اور اس کی سختیوں کی لذت سے ہندو اور مسلمان دونوں لذت اندوز ہوئے۔ ترکوں کے ساتھ ہمدردی رکھنے والے مسلمانوں اور اسی طرح دہشت پھیلانے والے ہندوؤں کو تو جانے دیجئے۔ ہوم رول کا چرچا کرنیوالی مسٹر اینی بسنٹ اور ان کے ساتھی ارنڈیل اور واڈیا تک نظر بند کر دیے گئے۔ مسٹر اینی بسنٹ کے لکھے پڑھے پجاری تلک مہاراج کے جاں باو ان سے بیٹھے تھے سونے پر سہاگہ یہ چڑھا کہ لالہ لاجپت رائے اور سی آر داس بھی اسی اکھاڑے میں آکودے اور کانگریس سے جی حضوری بھاگ نکلے۔ لیکن قوم پرست مسلمان ڈٹے رہے جب مونٹیگو ہندوستان میں آئے تو آل انڈیا کانگریس کمیٹی اور آل انڈیا مسلم لیگ کی کونسل ہاتھ میں ہاتھ دئے ان کے سامنے پہونچی۔ کانگریس سے نکلے ہوئے نانٹوں

اور کمزور دلوں نے مانٹیگو کو آسمان پر چڑھا یا۔ جب رولٹ ایکٹ پاس ہوا تو
ان کی آنکھیں بھی کھُل گئیں۔

۱۹۱۹ء سے لیکر ۱۹۳۵ء کا زمانہ ہندوستان کے تاریخ میں یادگار رہے گا۔ اصلی
سیاسی لڑائی یہیں سے شروع ہوتی ہے۔ یہ دور عدم تعاون مقاومت مجھول اور جبر و
تشدد کے دور سے منسوب ہوگا۔ ہندی سبھا برلن سے ماسکو منتقل ہو چکی تھی۔ مولینا
عبید اللہ اور نازوں کا پلا ہندر پرتاب سنگھ کابل پہونچ چکے تھے اور کابل میں انڈین نیشنل
کانگریس کی شاخ قائم ہو چکی تھی۔ اس دور میں آپکو جواہر لال اور پنت جی ایسے ہٹے کٹے
ہی لاٹھیاں کھاتے نظر نہیں آئینگے بلکہ لالہ لاجپت رائے ایسے بڈھے بھی۔ اسی دور میں
آپ کو موتی لال جی ایسے محلوں میں زندگی بسر کرنے والے جیل کی کوٹھریوں میں ملینگے
اسی دور میں آپ اکالی جد و جہد۔ ملازمتوں سے علحدگی خطابوں کی واپسی۔ نان برہمن
موومنٹ خلافت موومنٹ ایسے تحریکیں ملینگی۔ اسی دور میں آپ، مڈیمن کمیٹی۔ مڈیمن کمیٹی
سائمن کمیشن۔ نہرو کمیٹی۔ اور راونڈ ٹیبل کانفرنس کے اجلاس ہوتے ہوئے پائیں گے
۱۹۱۹ء ہی میں آپ کو جلیان والا باغ نظر آئے گا۔ اور سر مائیکل اڈوائر پنجاب میں
حکومت کرتے ہوئے اور ان کا مارشل لا۔ مارشل لا ایک تو خود ہی کڑوا کریلا ہوتا ہے
اس پر جنرل ڈائرکٹر کی ایذا دہند طبیعت نے اور نیم چڑھا دیا اور وہ ایک ہولناک داستان
بنکر رہ گیا۔ جلیان والا باغ کے اندر جو ہوا اس کو جنرل صاحب بہادر کی مغلوب الغضبی
کے تحت لاکر کچھ اشک شوئی ہو بھی سکتی ہے لیکن وہ تو بھیمیت اور اخلاق سوزی کا ایک
مسلسل ڈراما کھیلتے رہے۔ ہنکڑی کی دو کڑیوں میں سے ایک کو مسلمان کے ہاتھ میں دوسری
کو ہندو کے ہاتھ میں پھنسوا کر پھرانا کہ لو یہ تمہارے ڈاکٹر سیف الدین اور ڈاکٹر ستیا پال

کی ہندو مسلمان دوستی کا ثمرہ ہے دلوں کو دہلا تو نہ سکا بلکہ اور ملا گیا۔ تو پیں گنوں اور طیاروں کو نہتے لوگوں کے خلاف استعمال کرکے شائستہ قوم کے ان نمائندوں نے اپنی درندگی کا مزید ثبوت اس اعلان سے دیا تھا کہ اب ہندوستان میں سر اٹھانے کی سکت نہیں رہی۔ چند ہی ماہ میں اس زعم کو شاردہا نندجی اور موتی لال نہرو نے مٹا دیا۔ موتی لال جی کا ایڈریس موجود ہے وہ طرز بیان اور وہ ماحول تو کہاں سے آئیگا لیکن آج بھی اس میں روانی ہے جوانی ہے اور اثر سچ ہے کہ بڑھاپے کی آمد سفید بالوں سے نہیں دل کی کیفیت سے ہے۔ زندگی کا بڑھاو چڑھاو دونوں۔ مہینوں اور سالوں کے گذرنے پر موقوف نہیں ہے بلکہ اس کا مدار دل کی امنگوں پر ہے۔ دنیا میں ایسے لوگ بھی ہیں جو بڑے سے پیدا ہوئے مگر پنڈت جی ان لوگوں میں تھے جو کبھی بڑھے ہوئے ہی نہیں۔

بعض گھڑیاں ایسی ہوتی ہیں جو پھر نہیں آتیں۔ ایسی ہی وہ گھڑی تھی جب تالیوں کی گونج اور بجے کے نعروں کی گرج میں پنڈت جی ایک جم غفیر سے گزرتے ہوئے امرتسر کی کانگریس کے ڈائس پر آئے۔ استقبالیہ کمیٹی کے صدر شاردہانند جی تھے ان دونوں کے گرد حلقہ بنائے تلک مہاراج مالوی جی۔ حکیم اجمل خاں۔ سی آر داس۔ محمد علی۔ شوکت علی تھے اور خود مہاتما جی بھی ڈائس پر بیٹھے ہوئے تھے۔ پنڈت جی کے خطبے کا ایک ایک لفظ جنرل ڈائرکٹر کی توپوں کی چھائی ہوئی دھاک کو ہوا میں اڑا رہا تھا جب انھوں نے یہ اشعار پڑھے:-

گر دیدہ وطن غرقۂ اندوہ و محن وائے — اے وائے وطن وائے

برخیز در دیدہ زپہ تابوت وکفن وائے — اے وائے وطن وائے

از خونِ جواناں کہ شدہ کشتہ دریں راہ — رنگین طبق ماہ

خو زمین شدہ صحرا و نل و دشت و دمن وائے   اے وائے وطن وائے

بہت سے ایسے بھی تھے جو فارسی بالکل نہیں سمجھتے تھے مگر سب طرف جوش اور غم کی

ایک لہر دوڑ گئی۔ آنجہانی کے انگریزی کے چند فقرے جن کا ترجمہ پیش کرتا ہوں میرے دل پہ نقش ہو کر رہ گئے ہیں۔

"ہماری اصلی منزل کیا ہے ؟ ہم خیالات کے اظہار کی"

"آزادی چاہتے ہیں۔ اپنا مقدر بنانے کی آزادی چاہتے"

"ہیں اور ہندوستان کو ایسا بنانا چاہتے ہیں جو اس میں"

"رہنے والوں کی خصوصیات کے مطابق ہو۔"

اس کے بعد ایسی صورتیں پھر ایک پلیٹ فارم پہ جمع نہ ہو سکیں۔ تلک مہاراج کی نگاہ میں عدم تعاون اور مقاومت مجہول کی پالیسی کچھ جچتی نہ تھی۔ وہ شیر پیدا ہوئے تھے۔ شیر بنکر رہے اور شیر کی طرح یکم اگست ۱۹۲۰ء کو مر گئے۔ اگلے مہینے جب کلکتہ میں خاص اجلاس کانگریس کا ہوا تو موتی لال نہرو بھی عدم تعاون و مقاومت مجہول کے قائل ہو گئے۔ اور چند ماہ بعد سی آر داس کو بھی ملک کی نجات کا یہ بھی راستہ نظر آیا۔ گاندھی جی ملک کے مسلمہ لیڈر قرار دئے گئے۔ محمد علی اور شوکت علی تو مہاتما جی کے ساتھ تھے ہی حکیم اجمل خاں صاحب بھی ساتھ ہو لئے۔ حکیم صاحب کے اس میداں میں آتے ہی خطاب یافتوں اور چند سوکھی روٹی پہ قناعت کرنیوالے مسلمانوں کو چھوڑ کر سب مسلمان عدم تعاون میں شریک ہو گئے۔ علما طوق و زنجیر کی خواہش میں نکل کھڑے ہوئے اور بہت سے پرجوش مسلمان ہندوستان کو بیت الحرب قرار دیکر ڈیورنڈ لائن کے پار کابل کے علاقہ میں پہونچ گئے۔ حکومت کو دن میں تارے نظر آنے لگے۔ اور جبر و تشدد کا

بازار گرم ہوگیا۔ حماقت و جہالت نے جنوبی ہندوستان میں موپلا مسلمانوں کو آپے سے باہر کر دیا اور انھوں نے جوش میں آکر ہندوؤں کو بری طرح نقصان پہونچایا مگر پھر بھی میل جول میں کمی نہیں ہوئی۔ پرنس آف ویلز نے جس دن بمبئی کی زمین پر قدم رکھا سخت ہنگامہ پھوٹ پڑا جس سے مہاتما جی کو بڑا صدمہ پہونچا۔ مہاتما جی علی برادران۔ ابوالکلام آزاد۔ پنڈت موتی لال جی۔ سی آر داس اور ہزاروں پڑھے لکھے جیل میں بھر دیے گئے۔ اس کے بعد فرقہ وارانہ فساد ہوتے رہے یہاں تک کہ شاردہانندجی ایک مسلمان کے ہاتھ سے ۱۹۲۶ء میں قتل کئے گئے ہندو مسلمان سب نے ان کا سوگ منایا۔ اس پر بھی مہاتما جی نے دونوں کو بچھڑنے نہیں دیا۔ کہا جاتا ہے کہ مہاتما جی نے اپنی جان دیکر اپنے آپ کو مسلمانوں سے بہت قریب کر لیا مگر میں یہ کہونگا کہ مہاتما جی نے ہندو اور مسلمان کو کبھی علٰحدہ علٰحدہ سمجھا ہی نہیں ان کی زندگی کے کسی دور میں ہندو مسلمان کا سوال نہیں آیا۔ انھوں نے جب جنوبی آفریقہ میں نیٹال انڈین ایسوسی ایشن قائم کی تو حاجی داؤد محمد کو اس کا صدر بنایا۔ سو سی اکاق جی حاجی حسین داؤد۔ احمد موسیٰ۔ ابراہیم اسمٰعیل استوات افریقہ کی مہم میں ان کے ساتھ ساتھ رہے جب انھوں نے وہاں ٹرسٹ قائم کیا تو عمر حاجی احمد داؤد اس کے جائنٹ سکریٹری بنائے گئے۔ محمد ابراہیم کنکی اپنی ڈاڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے جیل آتے جاتے رہے عورتوں میں شیخ احمد کی زوجہ اور حنیفہ بی کی مردانگی کو مہاتما جی ہمیشہ یاد کرتے رہے۔ سیرامتی آشرم میں امام عبدالقادر بوازیر کو کون نہیں جانتا۔ ۱۹۲۶ء میں جب مہاتما جی نے اس آشرم کی دیکھ بھال کے لئے کمیٹی بنائی تو یہی امام صاحب اس کے وائس چیرمین بنائے گئے۔ آل انڈیا اسپنرس ایسوسی ایشن میں شوکت علی اور شعیب قریشی کو لیا سول ڈس اوبی ڈینس کمیٹی (Civil Disobedience Committee) کا صدر

حکیم اجمل خاں کو بنایا اور ممبروں میں ڈاکٹر انصاری کو لیا ان کی مسلمان دوستی کے یہ سب نہ مٹنے والے نشان ہیں۔ ان کی شخصیت نادر و بے مثال تھی۔ ان کے متعلق ۱۹۰۹ء کی کھلی کانگریس میں خود گوکھلے آنجہانی نے جو پھونک پھونک کر قدم رکھنے والے رہنماؤں کے سردار تھے فرما گئے ہیں:-

"میں مسٹر گاندھی کو بہت اچھی طرح سے جانتا ہوں اور"
"میں آپ لوگوں سے کہتا ہوں کہ گاندھی جی سے زیادہ"
"پاک طینت شریف بہادر اور رحمت والے آدمی نے اس"
"سرزمین پر قدم نہیں رکھا...... ان میں ہندوستانیوں"
"کے ساتھ ہمدردی اور خدا ترسی انتہا کو پہونچی ہوئی ہے"۔

ان کے یہاں دولت کا صرف ایک ہی مصرف تھا کہ وہ ملک کی خدمت میں صرف ہو۔ ڈر اور خوف ان کے پاس سے چھو کر نہیں نکلا تھا۔ ان کا دل نفرت اور خواہشات دونوں سے خالی تھا۔ انھوں نے سنیاس نہیں لیا تھا لیکن دنیا آجتک ایسا سنیاسی پیدا نہیں کر سکی۔ ان کو حکومت کے طریقۂ کار سے نفرت تھی لیکن چھوٹا ہو یا بڑا کسی حاکم سے ان کو عناد نہ تھا۔ ان سے غلطی ہو تو اس کا فوراً اعتراف کر لیتے تھے۔ خطا سے بریت اور کاملیت خدا ہی کو سزاوار ہے مکمل خلوص اور اندھی عقیدت بندے کو بندے سے مشکل ہے لیکن وہ "سُپر مین" (Super Man) ضرور تھے انھوں نے بندگی اور بیچارگی کا طوق ہماری گردنوں سے نکال پھینکا۔ دنیا کہتی تھی کہ

جب تک بھیڑیں شیر نہ بنلیں نام نہ لیں آزادی کا

انھوں نے شیروں کی گردنیں بکریوں کے سامنے جھکوا دیں ہندوستان کی

حکومت جب تک ان کے بتائے ہوئے راستے پر چلیگی طاقتور کمزور کو کچل نہ سکیگا۔

۱۹۳۵ء سے ۱۹۴۷ء تک زمانے کو ہمیں بھول جانا چاہئے۔ مسلمانوں کو رونا

چاہئے اور ہندوؤں کو ہمدردی کرنا چاہئے کہ مسلمانوں کے لیڈروں میں سے سوائے ابوالکلام آزاد کے سب اللہ کو پیارے ہوئے صرف ایک محمد علی جناح رہ گئے تھے وہ سب پر چھا گئے۔ اگر حکیم اجمل خاں ہی زندہ ہوتے تو مسلمانوں کو یہ دن دیکھنا نصیب نہ ہوتا۔ ہندوستان کے ٹکڑے ہونے کے بعد جو عام مسلمان ہندوستان میں ہیں وہ سہمے ہوئے ہیں اور عام ہندو آزادی کے نشے میں مست، سچ پوچھو تو دونوں جمہوریت سے ناواقف ہیں۔ ہمارے سامنے صرف ہندو اور مسلمانوں کے دلوں کو صاف کرنے کا ہی اکیلا سوال نہیں ہے بلکہ خود ہندوؤں میں سے بھی ذات پات اور چھوت چھات کا جھگڑا چکانا ہے۔ ہمارے پاس اس وقت پیٹ بھر کر کھانا نہیں درآمد برآمد کا توازن بگڑا ہوا ہے۔ ہمارے آنکھوں کے سامنے آزادی کی دلفریب تصویر ہے لیکن کان اقتصادی غلامی کی جھنکار سن رہے ہیں۔

انڈین یونین میں اس وقت مسلمانوں کی تعداد لاکھوں نہیں کروڑوں سے ہے۔ نہ انھوں کو ملک سے باہر نکالا جا سکتا ہے اور نہ موت کے گھاٹ اُتارا جا سکتا ہے نہ اتنی بڑی تعداد کو بیروزگار۔ بھیک منگا اور فاقہ کش بنا کر رکھا جا سکتا ہے۔ جب تک سب کو ہندو ہو یا مسلمان ان کی اہلیت کے مطابق کام کرنیکا اور کام لینے کا موقع نہ دیا جائے گا ہندوستان پنپ نہیں سکتا۔ نہ جمہوریت قائم رہ سکتی ہے اور نہ خوش حالی اپنا چہرہ دکھلا سکتی ہے۔ ہندو ہو یا مسلمان سب کو انسان سمجھنا پڑے گا۔ منھ سے نہیں عملاً میرٹھ میں اپنے خطبہ صدارتی میں کرپلانی جی نے صحیح کہا ہے کہ

۳۴۴

"جو ہندو کسی مسلم کو اجنبی یا غیر سمجھتا ہے وہ ہندوستان کی"
"آزادی اور ترقی کا دشمن ہے - اگر کوئی مسلمان ایسا عقیدہ"
"رکھتا ہے تو وہ بھی پوری قوم کو برابر کا نقصان پہونچاتا"
"ہے - ہمارے لئے یہ موقع ہے کہ مختلف ذاتوں، مسلکوں"
"نسلی اور مذہبی طبقوں میں ایکا پیدا کریں - تاکہ وہ ساز تیار"
"ہو جو کبھی زمین پر یا سمندر میں سنا نہیں گیا۔"

جے ہند

ماہنامہ

آزادیٔ ہند کی دوسری سالگرہ کا علمی پیش کش

ہندوستان کے عجوبۂ روزگار سکّے

(از)

علّامہ حکیم سیّد شمس اللہ قادری ماہرِ علوم آثارِ قدیمہ

۱۵-اگست سنہ ۱۹۴۹ء

ہندوستان کے ان اعجوبہ روزگار سکوں کو عظیم الشان سکے کہتے ہیں۔ شہنشاہ جہانگیر نے اپنی تزک میں ان کو اشرفی کلاں اور روپیہ کلاں کے ناموں سے تعبیر کیا ہے۔ شاہجہاں اور اورنگ زیب عالمگیر کے درباری مؤرخ بھی ان کے لئے یہی نام استعمال کرتے ہیں۔ مشہور مؤرخ خافی خاں نظام الملکی نے ان سکوں کے لئے ایک خاص نام سکہ غریب نواز استعمال کیا ہے۔ عرب و عجم کے نووارد ہندوستان و دکن میں عموماً غریب (یعنی اجنبی) کہلاتے تھے۔ یہ سکے عموماً سلاطین عرب و عجم کے ایلچیوں کو بطور انعام دیے جاتے تھے۔ اس لئے ان کا نام سکہ غریب نواز مشہور ہو گیا۔

سلاطین مغول کے بڑے بڑے سکے مسکوکات عالم کی تاریخ میں خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ اہل یورپ نے ان کو اعجوبۂ روزگار نمونہ میں شمار کیا ہے۔ ان کا وزن ایک پونڈ سے پندرہ سولہ پونڈ بلکہ اس سے بھی زیادہ ہوا کرتا تھا۔ ایسے وزنی اور سنگین سکے مغول بادشاہوں کے سوا دنیا میں کسی اور بادشاہ نے مضروب نہیں کرائے تھے۔ چنگیز خاں (۶۰۳ھ تا ۶۲۴ھ) کے زمانے سے ان سکوں کا سلسلہ شروع ہوا ہے۔ صاحب دیوان علاء الدین جوینی اور وزیر رشید الدین فضل اللہ ہمدانی نے چنگیز خانی دور کے ایک خاص سکے کا ذکر کیا ہے جس کا نام بالش ہے[۱]۔ یہ سکہ چنگیز خاں کے بعد قاآن کبیر

(۶۰۳ھ سے ۱۰۴۳ھ) کی مملکت میں مدت تک جاری رہے - چنگیز خاں کے پوتے قوبیلائی خاں نے جب چین کو فتح کیا تو وہاں بھی اس کا رواج ہو گیا چنانچہ ۸۲۲ھ میں سلطان شاہرخ بن تیمور (۸۵۰ھ) نے اپنے سفیر چین میں بھیجے تو وہاں کے بادشاہ نے ان کو انعام میں بالش عطا کئے تھے[۵]۔

علاؤالدین جُوینی نے لکھا ہے کہ بالش پانسو مثقال کا ہوتا تھا اور زر و نقرہ دونوں سے بنایا جاتا تھا[۶]۔ عبداللہ وصاف کا بیان ہے کہ بالش زر دو ہزار دینار اور بالش نقرہ دو سو دینار کے مساوی تھا[۷]۔

امیر تیمور (۷۷۱ھ سے ۸۰۷ھ) نے ۸۰۳ھ میں دمشق فتح کیا تو وہاں کے دارالضرب میں اپنے نام سے سونے چاندی کے ایسے تنکے مضروب کرائے جن کا وزن سو مثقال، پچاس مثقال اور دس مثقال تھا[۸]۔

۱۶ ربیع الآخر ۹۳۵ھ کو بابر بادشاہ (۹۰۹ھ سے ۹۳۷ھ) نے آگرہ میں دربار کیا تو کوجم خاں ازبک اور اس کے چھوٹے بھائی حسن چلپی کے سفیروں کو بالش نقرہ سے تول کر سونا اور بالش زر سے تول کر چاندی عنایت کی بابر بادشاہ نے ایک بالش زر کا وزن پانسو مثقال بتایا ہے جو ایک سیر کابلی کے مساوی ہے۔ اور بالش نقرہ کا وزن ڈھائی سو مثقال جو آدھ سیر کابلی کے برابر ہے[۹]۔

بابر بادشاہ نے خواجہ کلاں کے ہاتھ عسس کے لئے ایک بڑی اشرفی بھیجی تھی۔ جس کا وزن تین سیر بادشاہی یا پندرہ سیر ہندی تھا۔

بابر بادشاہ کی بیٹی گلبدن بیگم نے ہمایوں نامہ میں اس اشرفی کا پُر لطف واقعہ اس طرح بیان کیا ہے کہ:-

بادشاہ نے خواجہ کلاں بیگ کے ہاتھ عموی عسس کے لئے ایک بڑی اشرفی بھیجی جو وزن میں تین سیر بادشاہی یا پندرہ سیر ہندوستانی کے برابر تھی۔ آپ نے خواجہ سے کہہ دیا تھا کہ اگر عسس تم سے پوچھے کہ بادشاہ نے میرے لئے کیا بھیجا ہے تو کہہ دینا کہ ایک اشرفی بھیجی ہے۔ اور واقعی ایک ہی اشرفی تھی۔ عسس نے اس پر تعجب کیا اور تین دن تک کڑھتا رہا۔ بادشاہ نے فرمایا تھا کہ اشرفی میں سوراخ کر کے ڈوری ڈالی جائے اور عسس کی آنکھیں بند کر کے گلے میں ڈال دیجائے اور اسے حرم میں بھیجدیا جائے جس وقت اس کے گلے میں ڈالی گئی تو اس کے وزن سے بہت گھبرایا مگر دل میں خوش ہو کر کہنے لگا کہ دیکھو میری اشرفی کو کوئی نہ لے[۶]

ابوالفضل علامی نے آئین اکبری میں اکبر کے بڑے سکوں کا حال نہایت تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے[۶] ان میں سب سے بڑے سکے کا نام سہنسہ تھا اور اس کا وزن ایک سو تولہ نو ماشہ سات سرخ ہوا کرتا تھا۔ اس کے ایک جانب بادشاہ کا نام اور اسکے اطراف یہ عبارت ہوتی تھی "السلطان الاعظم الخاقان المعظم خلد اللہ ملکہ وسلطانہ ضرب دارالخلافہ آگرہ" دوسری جانب کلمۂ طیبہ اور اس کے نیچے "وان اللہ یرزق من یشاء بغیر حساب" اور اس کے گرداگرد اصحاب اربعہ رضی اللہ عنہم کے اسماء لکھے جاتے تھے۔ ابتدا میں اس سکہ کو مولانا مقصود مہرکن نے تیار کیا تھا۔ پھر ملا علی احمد نے اس میں ترمیم کر کے کلمۂ طیبہ کے نیچے یہ عبارت اضافہ کی "افضل دینار ینفقہ الرجل دینار ینفقہ علی اصحابہ فی سبیل اللہ" اور رخ ثانی کیلئے یہ عبارت مقرر ہوئی :۔ "السلطان العالی الخلیفتہ المتعالی خلد اللہ تعالیٰ ملکہ وسلطانہ وابد عدلہ واحسانہ" لیکن بعد میں یہ سب عبارتیں موقوف کر دی گئیں اور ان کے بجائے ملک الشعراء شیخ فیضی کی یہ رباعیاں

نقش ہونے لگیں۔ ایک جانب وسط میں "اللہ اکبر جل جلالہ" اسکے گرداگرد حسب ذیل رباعی۔

خورشید کہ ہفت بحر از گوہر یافت / سنگ سیہ از پرتو اے جوہر یافت
کاں از نظر تربیت او زر یافت / واں زر شرف از سکۂ اکبر یافت

دوسری جانب وسط میں ماہ و سال الٰہی اور اطراف یہ رباعی۔

ایں سکہ کہ پیرایۂ امید بود / با نقش دوام نام جاوید بود
سیمائے سعادتش ہمیں بس کہ بدہر / یک ذرہ نظر کردۂ خورشید بود

اس سے چھوٹا سکہ رہس تھا اور وزن میں سہنسہ کا نصف ہوتا تھا۔ اس کے ایک طرف سہنسہ کی عبارت اور دوسری طرف شیخ فیضی کی یہ رباعی ثبت ہوا کرتی تھی۔

ایں نقد رواں گنج شاہنشاہی / با کوکب اقبال کند ہمراہی
خورشید بہ پرورش ازاں رو کہ بدہر / باید شرف از سکۂ اکبر شاہی

رہس کا نصف آتمہ تھا۔ یہ سکہ مدور اور مربع ہوا کرتا تھا اس پر کبھی سہنسہ کی عبارت اور کبھی شیخ فیضی کی مندرجہ ذیل رباعی نقش ہوا کرتی تھی۔

ایں سکہ کہ دست بخت را زیور باد / پیرایۂ نہ سپہر و ہفت اختر باد
زریں نقدیست کار ازو چوں زر باد / در دہر رواں بنام شہ اکبر باد

محمد ہاشم خافی خاں نظام الملکی نے اپنی تاریخ میں شہنشاہ اکبر کے خزانہ کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ بادشاہ کی وفات کے بعد خزانہ میں ایک ہزار اشرفیاں ایسی موجود تھیں جن کا وزن سو تولہ سے پانسو تولہ تک تھا۔[۵۹]

ابوالفضل علامی نے آئین اکبری میں سو تولہ سے زیادہ وزن کی اشرفیوں کا حال نہیں لکھا ہے۔ اس لئے قیاس ہوتا ہے کہ اکبر نے آئین اکبری کی تصنیف

کے بعد (جو ۹۹۹ھ میں واقع ہوئی ہے) دکن کی فتوحات سے واپس ہو کر اپنی
حکومت کے اخیر زمانہ میں وہ سکے مضروب کرائے تھے۔ جن کا وزن دو سو تولہ سے
پانسو تولہ تک تھا۔

۳۴۰

شہنشاہ نورالدین جہانگیر (۱۰۱۴ھ تا ۱۰۳۷ھ) جب سریرآرائے سلطنت ہوا تو
اپنے جلوس کے پہلے سال مختلف اوزان کے سکے مضروب کرائے اور وزن کی کمی بیشی
کے اعتبار سے ان کے جدا جدا نام مقرر کئے۔[1]

	طلائی سکے	نقرئی سکے
۱۰۰ تولہ	نورشاہی	کوکب طالع
۵۰ تولہ	نورسلطانی	کوکب اقبال
۲۵ تولہ	نوردولت	کوکب مراد
۱۰ تولہ	نورکرم	کوکب بخت
۵ تولہ	نورمہر	کوکب سعید
۱ تولہ	نورجہانی	جہانگیری
½ نیم تولہ	نورانی	سلطانی
¼ ربع تولہ	رواجی	نثار
¹⁄₁₀ دہم تولہ	•	خیر قبول

سو تولہ سے دس تولہ تک جسقدر طلائی اور نقرئی سکے تھے ان پر جہانگیر نے
آصف خاں کے ابیات نقش کرائے۔
ایک جانب حسب ذیل بیت اور اس کے بیچ میں کلمہ طیبہ۔

بخط نور بر زر کلک تقدیر — رقم زد شاہ نورالدین جہانگیر

دوسری جانب حسب ذیل بیت جس کے الفاظ آفتاب مملکت سے سکہ کی
تاریخ ۱۰۱۴ھ برآمد ہوتی ہے اور اس کے وسط میں مقام ضرب اور سنہ جلوسی و سنہ ہجری

شد چو خور این سکہ نورانی جہاں — آفتاب مملکت تاریخ آں

معمولی اشرفی اور روپیہ پر ایک جانب امیر الامراء کا حسب ذیل بیت ثبت کرایا
اور دوسری جانب مقام ضرب سنہ ہجری اور سنہ جلوسی منقوش ہوا۔

روی زر را ساخت نورانی برنگ مہر و ماہ — شاہ نورالدین جہانگیر ابن اکبر بادشاہ

جہانگیر نے ان سکوں کے علاوہ سونے چاندی کے ایسے سکے بھی مضروب کرائے
تھے جن کا وزن دو سو تولہ سے ہزار تولہ تک تھا۔ اور بادشاہ نے ہزار تولہ کی مہر کا نام
کوکب طالع اور پانسو تولہ کی مہر کا نام نور جہانی رکھا تھا[۱۱] سونے چاندی کے
ایسے ہی بڑے سکے شاہ جہاں (۱۰۳۷ھ-۱۰۶۹ھ) اور اورنگ زیب عالمگیر
(۱۰۶۹ھ-۱۱۱۹ھ) کے عہد میں ہی مضروب ہوئے تھے۔ اور ان کے بعد محمد شاہ
بادشاہ کے عہد تک موجود تھے۔ چنانچہ اس دور کی تاریخوں میں اکثر مقامات پر ان کے
تذکرے ملتے ہیں۔

یہ بدیہی امر ہے کہ اس قدر بڑے اور گرانقدر سکے روزمرہ لین دین میں بے فائدہ
اور عوام الناس کے لئے بیکار تھے ایسی حالت میں یہ سوال در پیش ہوتا ہے کہ ان کے
مضروب کرانے کی کیا وجہ تھی۔ اس کے متعلق مختلف مصنفین نے مختلف خیالات ظاہر کئے[۱۲]
طبیب منوچی جو وینیشیا کا باشندہ تھا اور اورنگ زیب عالمگیر (۱۰۶۹ھ-۱۱۱۸ھ)
کے زمانہ میں ۱۰۶۴ھ سے ۱۱۲۰ھ تک تقریباً ۶۴ سال ہندوستان میں مقیم
۱۶۵۳ء ۱۷۰۸ء

رابرٹ، اپنی کتاب میں بیان کرتا ہے کہ اورنگ زیب نے اپنے خزانہ میں سونے
چاندی کے بے شمار سکے جمع کئے تھے اور اس ذخیرے کو سرقہ سے بچانے کے لئے یہ
ترکیب نکالی تھی کہ انہیں گلا کر بڑے بڑے اور وزنی سکوں کی صورت میں مضروب کرایا
تاکہ بعد میں کار آمد نہ ہو سکیں۔

جنرل کننگھم نے جو ہندوستان کے سررشتہ آثار قدیمہ کا پہلا ڈائرکٹر جنرل ہے
اپنی ایک رپورٹ میں بیان کیا ہے کہ مغل بادشاہوں کے عہد حکومت میں بڑے بڑے
امراء اور باج گزار حکام جب دربار شاہی میں باریاب ہوتے تو انہیں بادشاہ کی خدمت
میں نذرانہ پیش کرنا پڑتا تھا یہ نذرانہ بڑے سکوں میں دیا جاتا تھا اور اسی غرض سے یہ
سکے مضروب کرائے تھے۔

ان دونوں بیانات کے خلاف فارسی تاریخوں سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ امرائے
سلطنت کو کوئی خدمت جلیلہ عطا ہوتی یا خلعت سے سرفراز کئے جاتے یا دیگر سلطنتوں کے
وکلاء و سفراء ناکرہ الزام ہو کر رخصت حاصل کرتے تو انہیں بادشاہ کی طرف سے یہ سکے
انعام میں عطا کرتے تھے۔

جہانگیر نے اپنے جلوس کے آٹھویں سال ایرانی ایلچی یادگار بیگ کو ایک اشرفی
ہزار تولہ کی [؎] اور دسویں سال عادل خاں کے وکیل سید کبیر کو ایک اشرفی پانسو تولہ
کی [؎] اور زمیں بیگ ایلچی کو ایک اشرفی دو سو تولہ کی عنایت کی تھی [؎]

شاہجہاں نے جلوس کے چودھویں سال روم کے ایلچی ارسلان آغا کو ایک اشرفی
سو تولہ کی اور ایک روپیہ اسی وزن کا [؎] اکیسویں سال عادل خاں کے وکیل سید حسین
کو ایک مہر دو سو تولہ کی اور اسی وزن کا ایک روپیہ [؎] اٹھائیسویں سال رومی سفیر

ذوالفقار آغا کو ایک مہر چار سو تولہ کی اور ایک روپیہ اسی وزن کا[۱۸] سرفراز کیا تھا۔

اورنگ زیب عالمگیر نے جلوس کے چوتھے سال ایرانی سفیر بوداق بیگ کو تین اشرفیاں سات سات سو تولہ کی اور تین روپیے پان پانسو تولہ کے[۱۹] خواجہ احمد ایلچی بخارا کو ایک اشرفی تین سو تولہ کی اور ایک روپیہ دو سو تولہ کا[۲۰] چوبیسویں سال خان میرزا سفیر اورگنج کو ایک اشرفی پچاس تولہ کی اور ایک روپیہ سو تولہ کا[۲۱] اکتیسویں سال خان فیروز جنگ کو ایک اشرفی ہزار اشرفیوں کی[۲۲] بیالیسویں سال سفیر بخارا قطب الدین کو ایک اشرفی دو سو اشرفیوں کی اور ایک روپیہ دو سو روپیہ کا عنایت کیا[۲۳]

مؤرخ محمد ہاشم خافی خاں نے بیان کیا ہے کہ ۱۱۱۹ھ میں شاہ عالم بہادر شاہ تخت نشین ہوا تو اس وقت دہلی کے خزانہ میں نو کروڑ کے اشرفی اور روپے موجود تھے یہ دولت منجملہ ان چوبیس کروڑ کے تھی جس کو شاہجہاں نے جمع کیا تھا اور عہد عالمگیر میں مہم دکن میں صرف ہونے کے بعد بچ رہی تھی اس میں وہ روپیے اور اشرفیاں شامل نہیں تھے جن کا وزن سو تولے سے پانسو تولہ تک تھا اور جو سکۂ غریب نواز کہلاتے تھے اور ان کو بطور انعام دینے کے لیے مسکوک کیا گیا تھا[۲۴]

سلاطین مغلیہ کے بڑے سکے اس وقت کمیاب اور نادر الوجود ہیں۔ اکبر کی تخت نشینی سے اورنگ زیب کی وفات تک سلاطین مغلیہ کا خزانہ زر و جواہر سے معمور تھا اور ان بادشاہوں کے ہاں دولت بہ افراط تھی۔ اورنگ زیب کی وفات کے بعد خانہ جنگیاں شروع ہو گئیں سلطنت کو روز بہ روز زوال ہونے لگا۔ وسائل آمدنی کم ہونے لگے۔ کثرت اخراجات سے خزانہ خالی ہو گیا۔ اس زمانہ میں بادشاہوں نے

بڑے سکے گلا دئے جس کے باعث یا عجوبۂ روزگار ذخیرہ معدوم ہو گیا اور ان کے سونے چاندی سے رائج الوقت سکے مضروب ہوئے تاہم چند سکے زمانہ کی دست برد سے بچ گئے ہیں۔ ان میں سے بعض یورپ کے عجائب خانوں میں اور دیسی روسا کے خزانوں میں محفوظ ہیں اور انہیں مختلف اوقات میں ماہران سکہ جات نے دیکھا ہے۔

اکبر اور جہانگیر کے بڑے سکے بالکل معدوم ہو گئے ہیں۔ اس وقت تک صرف پنج مہری اشرفیاں ملی ہیں جو برٹش میوزیم میں موجود ہیں۔ اکبر کی پنج مہر ۹۷۱ھ میں مضروب ہوئی ہے اور اس پر حسب ذیل عبارت منقوش ہے ؎

رُخ اوّل

لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ

اس کے اطراف پانچ گوشوں میں ابی بکر الصدیق۔ عمر الفاروق۔ عثمان العفان علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہم۔

رُخ دُوم

جلال الدین محمد اکبر بادشاہ غازی

اس کے گرداگرد السلطان الاعظم الخاقان المکرم خلد اللہ تعالیٰ ملکہ و سلطانہ

ضرب آگرہ (۹۷۱)

جہانگیر کی پنج مہر جلوس کے چودھویں سال ۱۰۲۸ھ میں بمقام آگرہ مضروب ہوئی۔ اس پر حسب ذیل ابیات منقوش ہیں ؎

رُخ اوّل

از شاہ جہانگیر بود دور زماں
در آگرہ ز نام اوست زر نور فشاں

رُخ دُوم

تا ہست نشاں ز پنج نوبت بجہاں
ایں سکۂ پنج مہریش باد رواں

سلاطین مغلیہ کا سب سے بڑا طلائی سکہ جو اس وقت تک دستیاب ہوا ہے وہ شاہجہاں بادشاہ کی دو صد مہر ہے۔ مشہور لغت نویس ڈاکٹر ریچرڈسن نے

اس کا وزن ستر اونس بیان کیا ہے اور
یہ سکہ جلوس کے اٹھائیسویں سال
۱۰۶۴ھ میں بمقام شاہجہان آباد مضروب
ہوا ہے۔ اس کے دو عدد برٹش میوزیم
میں موجود ہیں اور ان پر خط نستعلیق میں
حسب ذیل عبارت مسکوک ہے

رخ اوّل

لا اله الا الله محمد رسول الله
ضرب دار الخلافہ شاہجہان آباد سنہ ۱۰۶۴
اس کے اطراف حسب ذیل رباعی درج ہے
از صدق ابی بکر شد ایمان انور
اسلام قوی دست شد از عدل عمر
دین تازہ شد از شرم و حیائے عثمان
وز علم علی یافت ولایت زیور

رخ دوم

صاحب قران ثانی شہاب الدین محمد
شاہجہاں بادشاہ غازی سنہ ۲۸
اس کے اطراف حسب ذیل رباعی ہے۔
سکہ بر مہر دو صد مہری زد از لطف اله
ثانی صاحبقران شاہجہاں دین پناہ
روی زر باد از نقش سکہ اش عالم فروز
تا شود از پرتو خورشید روشن روی ماہ

سنہ ۱۸۸۳ء میں بنگال ایشیاٹک
سوسائٹی کے ایک جلسہ میں مسٹر گبس نے
اسی سال اور اسی دار الضرب کی ایک
دو صد مہری اشرفی پیش کی تھی اسکی عبارت
خط نسخ میں لکھی ہوئی تھی اور تحریر کا
طرز و اسلوب نستعلیق سکہ سے کسیقدر مختلف
تھا

مہاراجہ سندھیا کے توشہ خانہ میں
اورنگ زیب کی ایک صد مہر موجود ہے
جو جلوس کے پندرہویں سال سنہ ۱۰۸۳
میں بمقام شاہجہاں آباد مضروب ہوئی
تھی اس کا وزن تینتیس اونس ہے اور
اس پر خط نستعلیق میں حسب ذیل عبارت
کندہ ہے

رخ اوّل

ابو المظفر محی الدین محمد اورنگ زیب عالمگیر

بادشاہ غازی سنہ ۱۰۸۳ھ

اس کے اطراف

شاہ اورنگ عالمگیر

آسمان قدرت و قضا تدبیر

روی زر از فروغ سکہ او

گشت روشن بہ جہاں چو مہر منیر

رخ دوم

سنہ ۱۵ جلوس میمنت مانوس

ضرب دار الخلافہ شاہجہاں آباد

اس کے اطراف :-

شاہ عالمگیر دریای کرم اورنگ زیب

آنکہ از قسمت نخالش آب میگیرد سحاب

از فروغ سکہ اش در عرصۂ ہندوستان

گشت روشن روی زر چوں روی ماہ آفتاب

اسی نقش اور اسی وزن کی ایک صد مہرا اشرفی کو جنرل کننگھم نے سنہ ۱۸۸۱ء میں بمقام بنارس دیکھا تھا[۳۰] مارسڈن نے اسی نقش کے ایک نقرئی سکے کا ذکر کیا ہے جو رسڈن کے عجائب خانہ میں موجود ہے۔ اس کا وزن پندرہ پونڈ اکاون گرین ہے اور جلوس کے دسویں سال سنہ ۱۰۷۸ھ میں بمقام شاہجہاں آباد مضروب ہوا ہے[۳۱]

سلاطین ہندوستان کے بڑے سکے جب ایران میں پہنچے تو وہاں کے سلاطین نے بھی ان کی اتباع میں بڑے سکے مضروب کرائے لیکن ایرانی سکے اس قدر بڑے اور گراں قدر نہ تھے۔ شاہان ایران میں سب سے پہلے شاہ عباس ثانی (سنہ ۱۰۵۲ھ - سنہ ۱۰۷۷ھ) نے جو شاہجہاں بادشاہ (سنہ ۱۰۳۷ھ - سنہ ۱۰۶۹ھ) کا معاصر تھا تبریز میں چاندی کا ایک سکہ مضروب کرایا جو مروجہ سکے سے وزن میں تخمیناً چار گونہ زیادہ تھا[۳۲] اس کے جانشین شاہ سلیمان صفوی (سنہ ۱۰۷۷ھ - سنہ ۱۱۰۵ھ) نے بھی اس کی اتباع کی[۳۳] سلیمان کے بعد سلطان حسین (سنہ ۱۱۰۵ھ - سنہ ۱۱۳۰ھ) برسر حکومت ہوا۔ یہ بادشاہ اورنگ زیب

(سنہ ۱۰۶۹ھ تا سنہ ۱۱۱۸ھ) کا معاصر تھا۔ اس نے
سنہ ۱۱۱۸ھ میں بمقام اصفہان ایک نقرئی
سکہ ۸۳۶ گرین کا رواج دیا[۳۲] اس کے
دو سال بعد سنہ ۱۱۲۱ھ میں جب کہ دہلی میں
شاہ عالم بہادر (سنہ ۱۱۱۹ھ تا سنہ ۱۱۲۴ھ) کی
حکومت تھی ایک اور نقرئی سکہ پندرہ اونس
کا مضروب کرایا۔ سلاطین ایران کے سکوں
میں اس سے بڑا سکہ ابھی تک دستیاب
نہیں ہوا ہے۔ یہ سکہ یورپ کے کئی عجائب
خانوں میں موجود ہے اور مارسڈن نے
بھی اس کے حالات بیان کئے ہیں اس
پر حسب ذیل عبارت مسکوک ہے[۳۵]
نمبر (۶)

رخ اوّل

لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ علیؑ ولی اللہ

رخ دوّم

بندۂ شاہ ولایت حسین
ضرب اصفہان سنہ ۱۱۲۱ھ

شہنشاہ اکبر

(۱)

طلاء پنج مہر۔ آگرہ سنہ ۹۷۱ھ وزن ۸۲۰ گرین

رخ اول	رخ دوم
لا الٰہ الا اللہ	اکبر بادشاہ غازی
محمد	محمد
رسول اللہ	جلال الدین
حاشیہ۔ پانچ گوشوں	حاشیہ۔ فوق۔ السلطان
میں۔ ابی بکر الصدیق	الاعظم۔ الخاقان
عمر الفاروق۔ عثمان	یمین۔ المکرم۔ تعالیٰ
العفان۔ علی المرتضیٰ	لیسار۔ اللہ۔ خلد
رضی اللہ عنہم	تحت۔ ملکہ و سلطانہ
	ضرب سنہ آگرہ۔

سکہ جات سلاطین مغلیہ۔ برٹش میوزیم نمبر ۲۱۔

جہانگیر

(۲)

پنج مہر۔ طلاء۔ آگرہ سنہ ۱۰۲۸ھ سنہ ۱۳
جلوسی ۳۱۸ گرین۔

جہانگیر	جہاں

از شاہ	بت
بود دور زماں	نشاں ز پنج نو
اوست	تا ہست
در آگرہ ز نام	پنج مہرش با دوراں
نشاں	سکہ
زر نور ۱۰۲۰	ایں ۱۴

سکہ جات سلاطین مغلیہ۔ برٹش میوزیم نمبر ۳۰۵

شاہجہاں

(۳)

دو صد مہر۔ طلاء۔ دار الخلافہ شاہجہاں آباد ۲۰ سنہ ۱۰۶۴ سنہ ۲۸ جلوسی۔

رخ اوّل	رخ دُوم
لا الہ الا اللہ	بادشاہ غازے ۲۰
محمد رسول اللہ ۱۰۶۴	قران ثانی شاہجہاں
ضرب	حب
دار الخلافہ شاہجہاں آباد	شہاب الدین محمد صا
حاشیہ فوق شد ایمان انور	حاشیہ فوق سکہ بر مہر دو صد
از صدق ابی بکر	مہری زد لطف الہ
یسار۔ شد از عدل عمر	یسار۔ ثانی صاحب قراں

اسلام قوی دست	شاہجہاں دین پناہ
تحت۔ از شرم و حیای	تحت۔ روی زر باد از نقش
عثمان دین تازہ شد	سکہ اش عالم افروز
یمین۔ علم ولایت زیور	یمین۔ تا شود از پرتو خورشید
در علی یافت	روشن روی ماہ

سکہ جات سلاطین مغلیہ۔ برٹش میوزیم

دیباچہ صـ ۸۷

(۴)

دو صد مہر۔ طلاء۔ دار الخلافہ شاہجہاں سنہ ۱۰۶۴ سنہ ۲۸ جلوسی۔

رخ اول	رخ دُوم
لا الہ الا اللہ	شہاب الدین محمد
محمد رسول اللہ	صاحب قراں ثانی
ضرب دار الخلافہ	شاہ جہاں
شاہ جہاں آباد	بادشاہ غازے
۱۰۶۴	۲۸
حاشیہ فوق۔ ایمان از صدق شد	حاشیہ فوق۔ بر مہر دو صد مہری
ابی بکر انور	زو از سکہ لطف الہ
حاشیہ یمین۔ از عدل عمر شد	حاشیہ یمین۔ ثانی صاحب قراں

اسلام قوی دست	شاہ جہاں دین پناہ
تخت - از بزم و بنائے عثمان	تخت - زد وز زبادِ انقش
دین تازہ شد	سکہ اش عالم فروز
یسار - ولیت افور	یسار - تا از پرتو خورشید
وز علم علی ربانیت	روشن شود روئے ماہ

روئداد بنگال ایشیاٹک سائٹی بابت جنوری ۱۸۸۳ء

اورنگ زیب عالم گیر

(۵)

مسکوکہ طلاء دار الخلافہ شاہ جہاں آباد

۱۱۰۳ھ سنہ ۳۵ جلوسی -

رخ اول	رخ دوم
عالم گیر بادشاہ غازی	سنہ ۳۵ جلوس میمنت
اورنگ زیب	ب
محمد ابو المظفر	مانوس ضرب دار
محی الدین	الخلافہ شاہ جہاں آباد
۱۱۰۳	حاشیہ فوق - شاہ عالم گیر
حاشیہ فوق - شاہ اورنگ زیب	دریائے کرم اورنگ زیب

عالمگیر	یسار - آنکہ از قسمت خالیش
یسار - آسمان تقدیرت	میگردد بسحاب
وز فنا تدبیر	تخت - از فروغ سکہ اش
تخت - زد وز اوج سکہ او	در عرصہ ہندوستان
یمین - گشت روشن	یمین - گشت روشن روی
بہ جہان تدبیر	زر چوں روئے
	ماہ آفتاب

روئداد بنگال ایشیاٹک سائٹی بابت مارچ ۱۸۰۵ء

سلطان حسین

(۶)

نقرہ اصفہان سنہ ۱۱۲۱ھ - وزن (۱۵) اونس

رخ اول	رخ دوم
لا الہ الا اللہ محمد	شاہ ولایت بندہ حسین
رسول اللہ علی و	ضرب اصفہان
لی اللہ	۱۳۲۱

سکہ جات شاہان ایران برٹش میوزیم

نمبر ۹۷ مارسڈن جلد دوم ص ۴۶۶

۱ـہ۔ تاریخ جہانکشائی طبع یورپ جلد اول ص ۵۹ و ۶۰ و جامع التواریخ۔ طبع طہران۔ جلد دوم ص ۷۰ و ۱۷۲

۲ـہ۔ مطلع السعدین۔ طبع لاہور جلد دوم ص

۳ـہ۔ تاریخ جہانکشائی۔ جلد اول ص ۱۲

۴ـہ۔ تاریخ وصاف۔ جلد اول ص ۲۲

۵ـہ۔ ظفر نامہ۔ جلد دوم۔ ص ۳۳۶

۶ـہ۔ تزک بابری۔ ص ۲۲۹

۷ـہ۔ ہمایوں نامہ طبع لاہور ص ۱۲

۸ـہ۔ آئین اکبری۔ طبع دہلی ۱۲۷۲ھ جلد اول ص ۲

۹ـہ۔ منتخب اللباب طبع کلکتہ جلد اول ص ۲۴۳ ایڈورڈ تھامس کی تاریخ سلاطین افاغنہ دہلی طبع لندن ص ۴۲۳

۱۰ـہ۔ تزک جہانگیری طبع لکھنؤ ص ۶

۱۱ـہ۔ تزک جہانگیری ص ۱۴۰ و ۱۴۱

۱۲ـہ۔ لین پول۔ دیباچہ ص ۷۰

۱۳ـہ۔ تزک جہانگیری طبع نول کشور پریس ص ۱۱

۱۴ـہ۔ ″ ″ ص ۱۴۰

۱۵ـہ۔ ″ ″ ص ۱۳۳

۱۶ـہ۔ عمل صالح جلد دوم ص ۳۳۳

۱۷ـہ۔ ″ جلد سوم ص ۸

۱۸ـہ۔ عمل صالح جلد سوم ص ۱۸۹

۱۹ـہ۔ عالمگیر نامہ ص ۶۰۸

۲۰ـہ۔ ″ ″ ص ۸۲۷

۲۱ـہ۔ مآثر عالمگیری ص ۲۰۰

۲۲ـہ۔ ″ ص ۲۶۶

۲۳ـہ ″ ص ۳۹۷

۲۴ـہ۔ منتخب اللباب جلد دوم ص ۵۲۸

۲۵ـہ۔ لین پول نمبر (۲۳)

۲۶ـہ ″ نمبر (۳۰۵)

۲۷ـہ۔ ″ دیباچہ ص ۸ مارسڈن ص ۶۴۱

۲۸ـہ۔ رُوداد بنگال ایشیاٹک سوسائٹی بابتہ جنوری ۱۸۸۲ء

۲۹ـہ۔ رُوداد بنگال ایشیاٹک سوسائٹی بابتہ مارچ ۱۸۸۵ء

۳۰ـہ۔ لین پول دیباچہ ص ۸۶

۳۱ـہ۔ مارسڈن جلد دوم ص ۴۶۶

۳۲ـہ۔ اسٹوارٹ پول نمبر ۴۷

۳۳ـہ ″ ″ نمبر ۵۷ و ۶۸

۳۴ـہ ″ ″ نمبر ۹۸

۳۵ـہ ″ ″ نمبر ۹۸

ہما

آزادئ ہند کی دوسری سالگرہ کا علمی پیشکش

ہند قدیم و جدید کی منظوم تاریخ

(از)

راجہ نرسنگھ راج عالی

۱۵۔ اگست سنہ ۱۹۴۹ء

نظم لکھی ہے بند نامہ کی　　کیفیت ہے عجیب خامہ کی

مستی ہے ایک کیف طاری ہے　　جوئے شیریں کی نہر جاری ہے

یوں بظاہر جو میں خوشی میں ہوں　　بات یہ ہے کہ بےخودی میں ہوں

آج دل بلیوں اچھلتا ہے　　اب سنبھالے نہیں سنبھلتا ہے

کیا خوشی اس طرح سے ہوتی ہے　　آنکھ مسرور ہو کے روتی ہے

بعد صدیوں کے یہ زمانہ ہے　　واقعی سچ ہے یا فسانہ ہے

کسکو دکھلاؤں دل کی یہ حالت　　باغ و بلبل کی گل کی یہ حالت

گل کھلے بلبلیں چہکتی ہیں　　مثل رقاصہ یہ بہکتی ہیں

رونق پُر بہار ہے گلشن　　حسن کا یہ نکھار ہے گلشن

دیکھئے آج چل کے میخانے　　گردش میں آرہے ہیں دیوانے

ابر کا سایہ رحمت باری　　فیض گویا ہے ہر طرف جاری

ساقی ہے مست جھومتا پھرتا　　اپنے رندوں میں گھومتا پھرتا

ہاتھ میں سب لئے ہیں پیمانہ　　حکم ساقی کسی نے کب مانا

نہ شریعت نہ حشر کا ڈر ہے　　آج ہر رند اپنا رہبر ہے

کوئی سنتا نہیں کسی کی بات　　وصل کی ملگئی ہے جیسی رات

آج واعظ ہیں سارے خوابیدہ | رند ہیں جیسے ہوں بہا ندیدہ
کوئی ہو، کوئی نا و نوش میں ہے | کوئی خاموش کوئی جوش میں ہے
یہ سماں وہ ہے جو نہ دیکھا تھا | یہ زماں وہ ہے جو نہ دیکھا تھا
مثل آئینہ سب ہیں سکتے میں | دیکھنے والے کس طرح دیکھیں
سارے مندر بھرے پڑے ہیں آج | لاکھوں انساں یہاں کھڑے ہیں آج
کوئی ناقوس کی صدا دیتا | کوئی ہر بار یہ دعا دیتا
رہے آزاد ہند ہے پربھو | ہو یہ آباد ہند ہے پربھو
سینکڑوں آج مسجدیں پر ہیں | ایک تسبیح سینکڑوں در ہیں
ہاتھ اٹھائے کوئی دعا کیلئے | کوئی سجدے میں ہے خدا کیلئے
ہر زباں پر دعائیں آتی ہیں | اور اذاں کی صدائیں آتی ہیں
بودھ، عیسائی، پارسی بھی ہیں | ساتھ آریے آرسی بھی ہیں
سب کی عزت بھلائی اسمیں ہے | عمر بھر کی کمائی اسمیں ہے
یہ وہ دریائے بیکراں ہے مگر | جس میں ملتے ہیں سینکڑوں گوہر
ہند وہ جس کا مرتبہ اعلیٰ | ہند وہ سب کا ہے جو گہوارا
ہند وہ ہند جو وطن اپنا | ہند وہ جس میں ہے دکن اپنا
ہند وہ ہند علم کا مخزن | ہند وہ ہند خلق کا معدن
نام لیوا اسی کے جدا مجد | دوست اک دوسرے کے سب بجد
رام اور کرشن کا یہ مسکن تھا | بھیشم ارجن سے ہند گلشن تھا
ہند کو جن سے اب بھی زینت ہے | ساری دنیا میں آج شہرت ہے

رامؔ کا رام راج تھا مشہور — جس کی مئے سے ہر ایک تھا مخمور
جس میں انصاف کا تھا دورِ عظیم — کس کی طاقت جو منہ چڑھائے غنیم
رام مریاد کے شناور تھے — درد و غم میں سبھی کے یاور تھے
گرچہ صدیاں ہوئیں وہ زندہ ہیں — کل مرے جو وہ آج مردہ ہیں
کارنامے کبھی نہیں مٹتے — اُن کے رہتے ہیں حشر تک چرچے
بیوی بھائی کی کچھ نہ تھی پروا — ایک دھوبی کی پُر اثر تھی صدا
ساری دنیا میں ان کے چرچے ہیں — اُسی دن سے یہ اپنے چرنے ہیں
جا بجا معرفت کا چرچا تھا — بچہ بچہ یہاں کا اچھا تھا
کرشن جی کا زمانہ پھر دیکھے — دھیان انمول گیتا پہ دیجے
یہ ہے لافانی قول کا منبع — یہ ہدایات و رُشد کا مرجع
زندگی کے بڑے خزانے ہیں — یہ نہ سمجھے کوئی فسانے ہیں
ہوا اس دور میں مہا بھارت — کرشن ارجن کے بن گئے سارت (رتھ بان)
صرف انصاف کی لڑائی تھی — خاندانی تھے کب جدائی تھی
زور طاقت کا ساتھ دنیا دے — اور دولت کا ساتھ دنیا دے
پر جو عارف ہیں وہ نہیں ڈرتے — کام بیجا کبھی نہیں کرتے
پھر صداقت کی جیت ہو ہی گئی — آج تک اسکی ریت (رواج) ہو ہی گئی
ارجن و بھیم اور کرن کیا تھے — بھیشم اور درون سارے جن (انسان) کیا تھے
فوق الانسان تھے عظیم تھے یہ — موردِ رحمتِ کریم تھے یہ
یہ شجیع و جری عزائم تھے — بے مثال و بزرگ دائم تھے

تھے یہاں گوتم اور شنکر بھی ان سے بہتر کہاں تھے رہبر بھی

فلسفہ ان کا دیکھئے نایاب ایک دریا تھا جو ہو پایاب

ان کے سینے تھے یا سفینے تھے علم قدرت کے یہ خزینے تھے

ایک دنیا نے مان کر لوہا ان کی پیروی ہی بنگئی گویا

ہند کی خاک و خون کی برکت تھی تھے کبیر اور سور نانک جی

داس تلسی تھے میرآں بائی بھی جن کے اقوال آج بھی ہیں جلی

چکرورتی اشوک راجا تھے یہ بھی مقبول دین دنیا تھے

ان کا انصاف ان کا جود و کرم ہے زباں زد عوام کے نہیں کم

شاہ اکبر یہیں کے تھے فرزند زندگی جنکی پر نصائح و پند

انکی تھی بے تعصبی مشہور انہیں تھا کچھ نہ شاہونکا سا غرور

عدل و انصاف کے نمونا تھے فرد بے مثل۔ مثل کسریٰ تھے

ہند کی سرزمین کا نام ہوا یعنی اچھا ہر ایک کام ہوا

ہند کے کیا سپوت پیدا ہیں ان پہ دنیا کے لوگ شیدا ہیں

گوکھلے اور تلک یہیں پر تھے دادا بھائی رناڈے کے گھر تھے

یہی باپو کا تھا وطن پیارا گاندھی جی نے یہیں برت رکھا

ہوئی ان کی تپسیا پوری جاں اسی ملک کے لئے دیدی

یہ رشی تھے یہی منی بھی تھے سیکڑوں کیلئے گنی بھی تھے

یہ تھے تعریف سے بھی بالاتر اور توصیف سے بھی بالاتر

خود سے مٹے مٹنے سے بچانے کو ہند والوں کے آزمانے کو

ان کی سنیا گرہ نہ بھولے گی — چالیں ساری بھلا دی برٹش کی
یہ تھے ایسے نہیں ہے جن کی نظیر — تھے سدھارک مگر بہ شکل فقیر
سادگی ان میں کیا بلا کی تھی — انہیں جلوہ گری خدا کی تھی
یہ شہنشاہ سے کبھی نہ ڈرے — اپنی سادہ لباس ہی سے ملے
انکو پروا نہیں ہنسی کی تھی — غم کی پروا نہ کچھ خوشی کی تھی
سب مذاہب کے یہ تھے شیدائی — انہیں کب تھا غرور رعنائی
باپو نے اپنے جانشین کئے — ہر مکان ان کے لئے مکین کئے
کس سے اب ہیں نہاں جواہر لال — ہند کی روح و جاں جواہر لال
ان کا ایثار بے مثال رہا — ان کو دولت کی کب رہی پروا
خود یہ دولت ہیں اور ہیں مقبول — ہند کے رہنما ہیں یہ معقول
ساری دنیا کی یہ نظر میں ہیں — یوں تو کہنے کو اپنے گھر میں ہیں
اور سردار جی پٹیل بھی ہیں — نت نئے کھیلتے یہ کھیل بھی ہیں
ہے سیاست انہیں کھلونا سی — فرد نایاب آج ہیں یہ بھی
انہیں طاقت ہے اور عزم و جلال — ملک کی لاج کا نہیں ہے خیال
بابو راجن ہیں اور سکھ سینا — فخر کایستھ ہیں سدا رہنا
ہند کے لاجواب یہ فرزند — ان کو ایشور رکھے سدا خورسند
مالوی جی تھے اور تھے ٹیگور — علم و فن میں جو تھے بہت مشہور
بوس اور گھوش بھی ہیں پڑھتے — شیر پنجاب کے رہے چرچے
موتی لال اور پوجیہ داس بھی تھے — ساتھ لاکھوں ہزاروں پاس بھی تھے

مسنر نائیڈو کی خاص عزت تھی | ان کی دنیا میں ایک شہرت تھی
بلبل ہند فخر و ناز دکن | جن کو روتا ہے آج سارا وطن
شیر کشمیر سرحدی گاندھی | اور آزاد باکمال بھی
ہند تیرا یہ کارنامہ ہے | تو بڑا ہے ترا زمانہ ہے
تیری کرنی سے تیرا اوج ہوا | گنگا جمنا کا تجھ میں زوج ہوا
یاں مقدس ندی ہیں نالے ہیں | تیری آغوش کے یہ پالے ہیں
تجھ میں ہماچل اور وندھیاچل | تجھ میں کاشی بھی اور گنگا جل
تجھ میں مندر ہیں اور شوالے ہیں | تجھ میں مشہور پاٹھ شالے ہیں
مسجد و خانقاہ و گنبد بھی | تجھ میں ہیں نیک لوگ بھی بد بھی
تیرے ہی ہیں اجنتا ایلورا | ساری دنیا میں جن کا ہے چرچا
یاں کے کاریگروں کی صنعت پر | لوگ دنیا کے دنگ ہیں اب سر
سارے سیاح جو کہ آتے ہیں | اسکی تعریف کر کے جاتے ہیں
گو ہزاروں برس کی شان ہے یہ | واقعی صنعتوں کی جان ہے یہ
جن کا پتھر میں یہ کرشما تھا | ان کی نظروں میں زر بھی ادنیٰ تھا
تاج کو آج مغتنم سمجھو | ایسی صناعی اب ہے کم سمجھو
شان اسکی کوئی نہیں پاتا | کونسے دل کو یہ نہیں بھاتا
ہند کب تک ترا بیان کریں | خیر مقدم ترا جوان کریں
تیرا جلال اور جمال ہے یہ | تجھ پہ مرتے ہیں سب کمال ہے یہ
وہ نزاں قوموں کی تو ہی مادر ہے | سب پجاری ہیں تو ہی مندر ہے

نظرِ بد کہیں لگے نہ تجھے　　دشمنوں کی یہ دسترس سے بچے

ساری دنیا میں بول بالا ہو　　ہر طرف روشنی اجالا ہو

تو ممالک کا رہنما ہو جائے　　کشتی والوں کا ناخدا ہو جائے

نام پہ تیرے ہم جئیں بھی مریں　　کام جتنے ہیں تیرے ملکے کریں

ایک ہی تیرا لخلخہ رہ جائے　　ہندو مسلم یہاں کا سب کو بھائے

تو پھلے پھولے تیرا نام رہے　　تیرے بچوں کو تیرا کام رہے

رہیں سب کے یہ رہنما بنکر　　دشمنوں سے ملیں سدا تنکر

ان کے اخلاق سب پہ حاوی ہوں　　دیکھنے والے اسکے راوی ہوں

دل سے دینا ہے یہ دعا عالی
اور ہو تیرا مرتبا عالی

ہندوستان کا نیا جنم

از

مسٹر سید عبدالقادر مینیجنگ ڈائرکٹر حیدرآباد کیمیکل اینڈ فارماسیوٹیکل ورکس لمیٹیڈ

۱۵- اگست سنہ ۱۹۴۹ء

۱۵/اگست ۱۹۴۷ء سے پہلے ہندوستان کو ہندوستان ہی کہا جاتا تھا اور ۱۵/اگست ۱۹۴۷ء کے بعد بھی ہندوستان کو ہندوستان ہی کہا جاتا ہے۔ حالانکہ ۱۵/اگست ۱۹۴۷ء سے پہلے اور بعد کے ہندوستان میں زمین و آسمان کا فرق ہے کیونکہ ہندوستان کا ایک بہت بڑا حصہ ہندوستان سے جدا ہو کر پاکستان کے نام میں تبدیل ہو گیا ہے۔ دراصل جغرافی اور تاریخی اعتبار سے وہ بھی ہندوستان ہی ہے مگر سیاسی لحاظ سے اس کی نوعیت بدل گئی ہے اور نتیجہ کے طور پر مکمل ہندوستان کی بجائے منقسم ہندوستان باقی رہ گیا ہے۔ اب یہ بنیادی بحث پیدا ہو سکتی ہے کہ ہندوستانی ذیلی براعظم کی جو اصطلاح غیر منقسم ہندوستان کے لئے زمانۂ دراز سے مروج تھی۔ کیا پاکستان کے وجود کے بعد بھی وہ برقرار رہے گی؟ کیا ہمالیہ کے جنوب کے وسیع میدان کو جو ہندوستان اور پاکستان کے علاقوں پر مشتمل ہے۔ پاکستانی ذیلی براعظم کہا جائے گا یا صرف ہندوستانی؟

ظاہر ہے کہ اہل پاکستان اس کو پاکستانی ذیلی براعظم کہیں گے اور اہل ہند اس کو ہندوستانی ذیلی براعظم کے نام سے موسوم کریں گے۔ اگر تاریخی، جغرافی اور حصہ ملک کی وسعت کے لحاظ سے اس کو ہندوستانی ذیلی براعظم کہا جائے تو صحیح ہوگا۔

تقسیم ہند کے بعد پنجاب کے دو اور بنگال کے دو ٹکڑے ہو گئے اور امتیاز

کے لیۓ انکو مشرقی پنجاب، مغربی پنجاب، مشرقی بنگال اور مغربی بنگال کے ناموں سے موسوم کیا گیا۔ مغربی بنگال اور مشرقی پنجاب ہندوستان کے جزو اور مغربی پنجاب اور مشرقی بنگال پاکستان سے وابستہ ہیں۔ لیکن اب بھی پنجاب و بنگال اسی مفہوم میں استعمال ہوتے ہیں کہ کبھی تقسیم نہیں ہوۓ تھے اور نیک ہزاروں ہندوستانی و پاکستانی اس امر سے ناواقف ہیں کہ پنجاب و بنگال کے کتنے مقامات پاکستان کے ہیں اور کتنے ہندوستان کے۔

تاریخ کا ہر طالب علم اس حقیقت کو جانتا ہے کہ ہندوستانی ذیلی براعظم کی شکل ایک ایسے تکون مثلث کی ہے۔ جس کا قاعدہ شمال میں کوہ ہمالیہ کے متوازی ہے اور جنوب میں اس کا راس بحیرۂ ہند میں دور تک چلا گیا ہے اور خاتمہ پر راس کماری ہے۔ یہ پورا ذیلی براعظم خط استوا کے شمال میں واقع ہے۔ ہندوستان، کوہ ہمالیہ کی وجہ سے ایشیا سے کٹکر علیحدہ ہوگیا ہے۔ وسعت کے لحاظ سے روس کو چھوڑ کر یورپ کے مساوی اور جزائر برطانیہ کا بیس گنا ہے اور اس کی آبادی دنیا کی آبادی کا $\frac{1}{5}$ ہے۔

یہ عجیب بات ہے کہ دنیا کا اتنا وسیع اور طاقتور ملک صدیوں بیرونی فاتحین کے زیر تسلط رہا۔ اس کے اظہار سے یہ بتانا مقصود نہیں کہ قرن ہا قرن اس نے بیرونی اقوام کی غلامی کی اور بیرونی اقتدار سے چھٹکارہ حاصل کرنے کی اس میں صلاحیت نہ تھی۔ قوموں کے عروج وزوال کی یہ ایک المناک داستان ہے جس سے ہر پڑھا لکھا واقف ہے۔

انگریزوں نے کم وبیش پونے دو سو سال ہندوستان پر حکومت کی

اور اس طرح اس ملک نے بہت سے انقلابات دیکھے مگر تاریخ کے کسی دور میں بھی یہ جمہوری ملک نہیں رہا اور اب آزادی کے بعد اس کی جغرافی، سیاسی اور تاریخی حیثیت کچھ سے کچھ ہو گئی ہے۔ اور جو کام یہاں صدیوں میں بھی نہیں ہوا تھا وہ مفاد عامہ کے منصوبہ کے تحت قومی اور جمہوری قوت سے آناً فاناً پایۂ تکمیل کو پہونچ گیا اور لاکھوں نہیں بلکہ کروڑوں باشندوں کو یہاں وہ سب آزادیاں مل گئیں جو ہر انسان کا پیدائشی حق ہے جس کے بعد پست و بلند کا فرق باقی نہیں رہتا ہے محنت، عمل، کردار اور خدمت خلق کے ذریعہ معمولی سے معمولی درجہ کا انسان اب دیش کا ہیرو بن سکتا ہے اور اونچے سے اونچا انسان اگر انسانیت اور عمل سے بے بہرہ ہو تو یہاں اس کے لئے کوئی مقام نہیں رہا ہے۔ یہ جو انقلاب آیا ہے اتنا عظیم، شدید، اور طاقتور ہے کہ کوئی اس کی زد میں آکر پنپ نہیں سکتا۔ اس نے نہ صرف صدیوں کی تاریخ و سیاست کے دھارے کے رُخ کو پھیر دیا بلکہ دنیا کے نقشہ میں بھی تبدیلی کر دی اس طرح کہ نقشہ سے برطانیہ کی سامراجی سرخی کو ہندوستان کے دامن سے دھو دیا۔ یہ سرخی دراصل خون آشام تھی جو ہندوستانی عوام کی آزادیوں کو کچلنے سے ہویدا ہوئی تھی۔ ہزاروں سال کی جد و جہد کے باوجود جو کام نہ ہو سکا تھا اور عوام کو بیدار نہ کیا جا سکا تھا اور ان کو ان کی حقیقی قدر و قیمت سے ناآشنا رکھا گیا تھا چند ہی سال میں اپنے رہنماؤں کی جد و جہد سے ان رازہائے سربستہ سے ہندوستانی روشناس ہوئے اس میں شک نہیں کہ رواداری نیکی، مروت خلق اور ایثار کے چشمے پہلے بھی جاری تھے اور اب بھی جاری ہیں۔ مگر اب اُن کی روانی کا طریقہ بدل گیا ہے اور عوام کو آزادی کی ایسی شراب

پلائی گئی ہے کہ جس کا نشہ ساری زندگی اتر نہیں سکتا۔ ہندوستان کی آزادی کے ساقی صرف ہندو ہی نہیں تھے بلکہ مسلمان بھی تھے اور ہندوستان کی دیگر اقوام نے بھی اس میں قابلقدر حصہ لیا تھا۔ اب جو ہندوستان ہے اس کو قدیم ہندوستان نہیں سمجھنا چاہیئے کیونکہ آج کل کے ہندوستان کو ہندوستان قدیم سے کوئی مناسبت نہیں ہے۔

اسلاف نے اپنے اخلاف کی بہبودی کے لئے جس طرح راستے صاف کئے تھے اسی طرح دورحاضر کے رہنماؤں نے اپنے اخلاف کے لئے راستے ہموار کئے۔ انھوں نے ایلورہ، ایجنٹہ، ایلیفنٹا، قطب مینار، اور تاج محل جیسی کوئی یادگار اپنی باقیات میں نہیں چھوڑی بلکہ انھوں نے آیندہ نسلوں کے لئے صرف ایک یادگار چھوڑی ہے جو ان تمام یادگاروں سے افضل، مستحکم، دیرپا اور حسین وجمیل ہے اور اتنی بلند و بالا کہ جس کی کوئی حد نہیں ہے اور اتنی مضبوط کہ جسے نہ گردش ایام کہنہ کر سکتے ہیں اور نہ برق گرنے سے اس میں رخنے پڑ سکتے ہیں اور نہ کوئی قوت اسے ڈھا سکتی ہے یہ وہ یادگار ہے جو حقیقی معنوں میں یادگار کہلائی جا سکتی ہے اور مستقبل کے لئے ایک ایسا شاندار تحفہ ہے کہ یقیناً ہمارے اخلاف اس پر فخر کرینگے۔ اور یہیں سے ہندوستانی عوام کی جمہوری زندگی کا آغاز ہوا ہے اگر دورحاضر کو تاریخ و سیاست کا نیا دور قرار دیا جائے تو یہ ایک حقیقت ہوگی اور اس تعلق سے ۱۵/اگسٹ ۱۹۴۷ء کے دن کو ہندوستان کی آزادی اور جمہوریت کی تخلیق کا جنم دن کہنا ہوگا! اور ہر سال اگسٹ کی ۱۵/کو یہ قومی دن بطور سالگرہ تاقیام شمس و قمر منایا جاتا رہے گا!!

دی سنگارینی کالریز کمپنی محدود
منتظمین - دی انڈسٹریل ٹرسٹ فنڈ حکومت حیدرآباد
معدن زغال - کتہ گوڈم - بیلم پلی اور ایلندو
رجسٹر شدہ دفتر "معین منزل" چرچ روڈ حیدرآباد دکن

تار کا پتہ "کول مائنس" حیدرآباد
"منیجر" بھدراچلم روڈ ڈین۔یس۔آر

سنگارینی کالریز کمپنی محدود کا قیام سنہ ۱۹۲۱ء میں عمل میں آیا یہ کمپنی حکومت حیدرآباد کی سب سے بڑی اور اہم صنعت ہے جس میں حکومت کے ۸۷ فیصدی حصص ہیں کمپنی کا سرمایہ منظورہ (۹۰) لاکھ روپیہ سکہ کلدار ہے اور اجرا شدہ سرمایہ ۲۱۶ء۶۳ لاکھ ہے کمپنی کے محفوظات بتاریخ ۳۱/ڈسمبر سنہ ۱۹۴۷ عیسوی ۳۲ء۱ کروڑ سکہ کلدار تھے۔ کمپنی نے سنہ ۱۹۴۷ عیسوی میں ۶ فیصدی منافع (جس میں ایک فیصد بونس بھی شامل ہے) حصہ داروں کو ادا کیا سنہ ۱۹۴۸ء کے حسابات زیر تنقیح ہیں کمپنی کا انتظام مجلس نظماء کے تحت ہے جس کے جملہ آٹھ اراکین ہیں جن میں سے ۵ نظماء حکومت کے عہدہ دار ہیں اور جس کے صدر نشین عزت مآب وزیر مالیات وصنعت وحرفت ہیں۔ فی الوقت کوئلہ کی فراہمی تین معادن سے ہوتی ہے جو کتہ گوڈم "بیلم پلی" اور "ایلندو" میں واقع ہیں۔ سالانہ کوئلہ کی پیداوار دس لاکھ ٹن ہے جو نظام اسٹیٹ ریلوے ،یم ایس ایم ریلوے اور میسور اسٹیٹ ریلوے کے علاوہ جنوبی ہند میں بھی دیا جاتا ہے۔

کوئلہ کی پیداوار میں اضافہ اور کان کنی کے جدید طریقے رائج کرنے کے لئے ایک توسیعی اسکیم سنہ ۱۹۴۸ء میں مرتب کی گئی تھی جس کے لئے ۵ کروڑ روپے سکہ کلدار کی منظوری دی گئی۔ اور توقع کی جاتی ہے کہ سنہ ۱۹۵۲ء کے ختم تک کوئلہ کی پیداوار ۱۵ ملین ٹن تک پہنچ جائے گی۔ امریکہ اور انگلستان کے ماہروں سے مشورہ کے بعد کان کنی کے جدید آلات ومشین منگائے جارہے ہیں جس کا کچھ حصہ کالریز پہنچ چکا ہے۔

کالریز میں جملہ مزدوروں کی تعداد تقریباً ۱۶ ہزار ہے جس کے لئے کمپنی کے جانب سے مفت مکانات آبرسانی اور طبی امداد دی جاتی ہے غذا اور دیگر اشیاء ما یحتاج مزدوروں کو رعایتی قیمت پر انجمن امداد باہمی مزدوران کے دوکانات سے دستیاب ہوتے ہیں۔ مزدوروں کو پراوڈنٹ فنڈ کے استفادہ کا حق ہے اور ہر سال ۴ ماہ کا بونس بھی دیا جاتا ہے۔ حکومت کی مقرر کردہ تحقیقاتی لیبر کمیٹی کے سفارشات کے پیش نظر مزدوروں کی اجرتوں اور الونس وغیرہ میں اضافہ کا مسئلہ حکومت کے زیر غور ہے۔

کمپنی نے کثیر رقم کے صرفہ سے مزدوروں کی رہائش کے لئے پختہ مکانات تعمیر کروائے ہیں جن میں دو کمرہ رہائشی اسٹور روم باورچی خانہ حمام اور بیت الخلاء بھی ہیں کمپنی نے جدید عصری آلات سے آراستہ ہسپتال کتہ گوڈم میں قائم کیا ہے جس میں علاج جدید طریقوں پر کیا جاتا ہے مزدوروں کے سہولت کے خاطر دواخانہ کتہ گوڈم تانڈور (بیلم پلی) اور ایلندو میں بھی کھولے گئے ہیں جن کی نگرانی ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ میڈیکل افسر کے تفویض ہے۔ کمپنی کے عملہ کے لئے کتہ گوڈم اور تانڈور (بیلم پلی) میں علحدہ علحدہ کلب قائم کئے گئے ہیں جس میں ہر قسم کی تفریح اور آسائش کا سامان مہیا کیا گیا ہے کیا تیسس ویلفیر سنٹرس (مرکز بہبودی مزدوران) اور پارک وغیرہ کا بھی اہتمام کیا گیا ہے اور مزدوروں کو مزید آسائش پہنچانے کے لئے ممکنہ سعی کی جارہی ہے۔ کیونکہ مزدور ہی ہر صنعت کی پشت پناہ ہیں۔

کوئلہ کی صنعت نہ صرف ایک بنیادی صنعت ہے بلکہ ایک قومی اثاثہ بھی ہے جس کی کامیابی پر دیگر صنعتوں کی عمدہ کارکردگی اور کامیابی منحصر ہے جو آجر اور مزدور کے باہمی خوشگوار تعاون سے بآسانی حاصل ہوسکتی ہے۔

ہندوستان آزادی سے پہلے

نیشنل کانگریس کی جد و جہد

(از)

مسٹر مرزا محمود علی بیگ ام۔اے، بی۔اے آنرز (لندن)

۱۵ اگست سنہ ۱۹۴۹ء

انگریزوں کے ہندوستان پر تسلط کے سو سال بعد اہل ہند میں بدیشی سامراج کے مقابلہ کی توانائی پیدا ہو گئی، جس کا نتیجہ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی تھی اس کو انگریز مورخ غدر کے نام سے تعبیر کرتے ہیں ۱۸۵۷ء کے کوئی ستائیس سال بعد پھر اہل ہند نے ایک دوسرے طریقہ سے جد و جہد آزادی کا آغاز کیا۔ اس کے اغراض و مقاصد وقت کی نزاکت کے لحاظ سے متعین کئے گئے اور بدلے گئے۔ انڈین نیشنل کانگریس کی بنیاد ایک انگریز کے ہاتھوں ۱۸۸۵ء میں پڑی تھی اور غیر فرقہ وار اساس پر جد و جہد کا سلسلہ شروع ہوا تھا۔ اس کے صدر ہندو، مسلمان، انگریز، اور پارسی غرضکہ ہر قوم کے افراد تھے۔ یہ غیر فرقہ وارانہ تحریک اپنے اعلیٰ تر مقصد کے حصول کے لئے (۶۲) سال سرگرم عمل رہی اور بالآخر اس نے آج سے دو سال قبل آزادی کی جنگ برطانی سامراج کے مقابل جیت لی۔ اس جنگ کو تاریخ میں اس لئے اہمیت حاصل ہے کہ اہنسا اس کا بنیادی ہتھیار تھا جس میں اعلیٰ اخلاقی قدروں کو بڑی اہمیت دی گئی تھی۔ یہ سب کچھ قوم کی نجات اور انسانیت کی بقاء کے لئے ہوا تھا۔

آج کے مبارک و مسعود موقع پر نیشنل کانگریس کی جد و جہد آزادی کا اجمالی خاکہ درج ذیل کیا جاتا ہے:-

۱۸۸۵ء

بمبئی میں گوالیا ٹینک روڈ پر گوکل داس تیج پال سنسکرت کالج کی عمارت میں انڈین نیشنل کانگریس کا پہلا اجلاس ۱۸۸۵ء میں ہوا۔ جس میں ہندوستان کے ہر حصے سے ۷۲ نمائندگان نے شرکت کی۔ دو دنوں کی بے ضابطہ کارروائی کے بعد کھلے اجلاس میں جن امور پر بحث ہوئی وہ حسب ذیل تھے۔

(۱) ایک شاہی کمیشن کے تقرر کا مطالبہ، جو ہندوستان کے سرکاری انتظامات کی کارکردگی کے متعلق غور و پرداخت کرے۔ (۲) وزیر ہند کی کونسل کی برخاستگی کی قرارداد۔ (۳) شہنشاہی اور صوبہ جاتی مجالس قانون ساز کی اصلاح و توسیع اور اراکین کو سوالات کرنے اور بجٹ پیش کرنے کا حق۔ (۴) سیول سروس کے امتحانات بہ یک وقت ہندوستان اور انگلستان میں منعقد ہوا کریں۔ (۵) فوجی اخراجات میں معتد بہ کمی کی جائے (۶) روئی کی درآمد پر از سر نو ٹیکس لگایا جائے۔ لائسنس ٹیکس میں توسیع ہو اور ہندوستانی قرضہ کے متعلق امپیریل گارنٹی منضبط کر لی جائے (۷) برما کو وائسرائے ہند کے اختیارات سے نکال کر علحدہ صوبہ بنایا جائے۔

ان میں سب سے پہلی قرارداد کی تحریک مسٹر جی سبرامانیہ ائیر نے کی تھی۔ اس اجلاس کے صدر شری اومیش چندر بنرجی تھے اور معتمد عمومی مسٹر اے۔ او۔ ہیوم۔

۱۸۸۶ء

انڈین نیشنل کانگریس کا دوسرا اجلاس ۱۸۸۶ء میں کلکتہ میں منعقد ہوا۔ اس کی صدارت دادا بھائی نوروجی نے کی۔ معتمد عمومی اب بھی مسٹر اے۔ او۔ ہیوم تھے اور

مجلس استقبالیہ کے صدر راجندر لال متر تھے۔ اس اجلاس میں ۴۰۶ مندوبین نے شرکت کی۔ یہ اجلاس بڑی دھوم دھام سے ہوا۔ اس میں مندوبین کے علاوہ دوسرے لوگ بھی شامل ہوئے۔ اس دفعہ جلسہ کی کارروائی میں زیادہ زور ہندوستان کی مفلسی پر دیا گیا تاکہ ہندوستان سے افلاس اور بے روزگاری کو مٹانے کے لئے نمائندہ مجالس کا قیام عمل میں لایا جائے۔ ایک پبلک سروس کمیٹی بھی تشکیل دی گئی۔ اس کمیٹی کے صدر دادا بھائی نوروجی تھے۔ اس کمیٹی نے آٹھ قسم کے مشورے دئے۔ اور اس کو کانگریس نے منظور کر لیا۔ ایک قرارداد کے ذریعہ مطالبہ کیا گیا کہ جیوری کی مدد سے مقدمات کی سماعت کا طریقہ کار سارے ہندوستان میں رائج کیا جائے۔ فوجداری مقدمات میں انتظامی اور عدالتی اختیارات کو علیحدہ کر دیا جائے۔ اسی اجلاس میں کانگریس کو بہتر طور پر چلانے کے لئے ملک کے طول و عرض میں کانگریس کمیٹیوں کے قیام کی تحریک کو منظور کر لیا گیا۔ اجلاس کے اختتام پر دادا بھائی نوروجی کی قیادت میں ایک وفد نے وائسرائے ہند لارڈ ڈفرن سے ملاقات کی۔

۱۸۸۷ء

بدرالدین طیب جی کی صدارت میں کانگریس کا تیسرا اجلاس ۱۸۸۷ء میں مدراس میں منعقد ہوا جس میں ۶۰۷ نمائندے شریک ہوئے اس اجلاس کی خصوصیت یہ تھی کہ اس کے مسودہ آئین کی تدوین کے لئے اولاً ایک کمیٹی تشکیل دی گئی۔ اس میں جو قراردادیں منظور کی گئیں ان کا مطلب یہ تھا کہ قانونی مجالس میں توسیع کی جائے۔ عاملہ اور عدلیہ کو علیحدہ کر دیا جائے "قومی خدمت" اور "ہندوستانی

رضا کار دستہ" کے متعلق بھی قراردادیں منظور کی گئیں۔ ایک اور قرارداد میں یہ مطالبہ کیا گیا کہ انکم ٹیکس کے لئے کم سے کم رقم کو بڑھا کر ایک ہزار روپیہ کردیا جائے اور اس طرح حکومت کی آمدنی میں جو کمی ہوگی اس کو پورا کرنے کے لئے باریک سوتی کپڑے پر محصول درآمد از سر نو عاید کیا جائے۔ ایک قرارداد کے ذریعہ قانون اسلحہ میں اصلاحی ترمیم کا مطالبہ کیا گیا۔ اب بھی انڈین نیشنل کانگریس کے معتمد عمومی مسٹر اے۔ او۔ ہیوم تھے اور صدر مجلس استقبالیہ راجہ سر ٹی مادھو راؤ تھے۔

سنہ ۱۸۸۸ء

سنہ ۱۸۸۸ء کو کانگریس کا چوتھا اجلاس الہ آباد میں زیر صدارت جارج یول منعقد ہوا۔ اب کی مرتبہ نمائندوں کی تعداد (۱۲۴۸) تک پہنچ گئی۔ کانگریس کے معتمد اب بھی مسٹر اے۔ او۔ ہیوم ہی تھے۔ اس جلسہ کی مجلس استقبالیہ کے صدر پنڈت اجودھیا ناتھ تھے۔ انعقاد جلسہ سے قبل کئی پمفلٹ شائع ہوئے۔ کانگریس پر سختیاں شروع ہوگئیں۔ اجلاس کرنے کے لئے جگہ نہیں دی گئی۔ مہاراجہ دربھنگہ نے لوتھر محل کو خرید کر کانگریس کے حوالے کردیا۔ سر سید احمد خاں اور مہاراجہ بنارس کی جانب سے مخالفت شروع ہوگئی۔ اجلاس میں گذشتہ اجلاس کی تحریکات و قراردادیں منظور کی گئیں۔ اس اجلاس کی خصوصیت یہ ہے کہ کانگریس نے پہلی مرتبہ پولس کے طرز عمل کو ظالمانہ اور سخت قرار دیا۔ اور تحقیقاتی کمیشن کے قیام کا مطالبہ کیا۔

سنہ ۱۸۸۹ء

سنہ ۱۸۸۹ء میں انڈین نیشنل کانگریس کا پانچواں اجلاس بمبئی میں منعقد ہوا۔ اس میں شریک ہونیوالے نمایندوں کی تعداد (۱۸۸۹) تھی۔ یہ اجلاس آبادی کے لحاظ سے ہر دس لاکھ

میں پانچ نمائندوں کا اوسط ہوتا تھا۔ اس اجلاس کو "بریڈ لا اجلاس" کہا جاتا ہے کیونکہ چارلس بریڈلا رکن پارلیمان انگلستان اس میں شریک ہوئے تھے اس اجلاس کی صدارت سر ولیم ویڈربرن نے کی۔ مجلس استقبالیہ کے صدر سر فیروز شاہ مہتا تھے۔ پہلے اجلاسوں کی تحریکات کو پھر سے دہرایا گیا۔ جس میں سونے اور چاندی کے تیروں کے ٹیکس کو اٹھا لینے کا مطالبہ قابل ذکر ہے۔ اور عوام کو اجازت دیجائے کہ وہ اپنے سکے بنوالیں سرکاری طور پر سکوں کو مہریں لگانے کی مخالفت کی گئی۔ لارڈ بریڈلا کی خدمت میں ایک سپاسنامہ پیش کیا گیا جس کے جواب میں انھوں نے کہا کہ "میں آپ کی خدمت کے لئے تیار ہوں" اور وعدہ کیا کہ وہ پارلیمان میں ہندوستان کے لئے اصلاحات کا مسودہ قانون پیش کرینگے۔

سنہ ۱۸۹۰ء

سنہ ۱۸۹۰ء میں کانگریس کا چھٹا اجلاس بصدارت سر فیروز شاہ مہتا کلکتہ میں منعقد ہوا مسٹر اے۔ او۔ ہیوم کے ساتھ پنڈت اجودھیا ناتھ بھی معتمد بن گئے۔ شریک ہونے والوں کی تعداد گھٹ کر (۶۷۷) ہو گئی۔ اس اجلاس کی سب سے بڑی خصوصیت یہ تھی کہ برطانوی سامراج کی نمائندہ حکومت ہند نے سرکاری ملازمین کو کانگریس کے اجلاسوں میں شریک ہونے سے منع کر دیا۔ کانگریس اب سامراج کی آنکھوں میں کھٹکنے لگی تھی۔

پرانے اجلاس کی روئداد کو دہرایا گیا۔ ایک اہم فیصلہ یہ کیا گیا کہ سنہ ۱۸۹۲ء میں کانگریس کا اجلاس لندن میں منعقد کیا جائے تاکہ ہندوستان کی شکایات اور مطالبات کو گورے آقاؤں کے سامنے پیش کیا جاسکے۔ اس وفد کے لئے سر نیدر ناتھ بنرجی اور ڈبلیو سی بنرجی کا انتخاب عمل میں آیا۔ ایک قرارداد کے ذریعہ مطالبہ کیا گیا کہ دوامی بندوبست

دیگر صوبوں میں بھی رائج کیا جائے۔

۱۸۹۱ء

۳۷۲

سنہ ۱۸۹۱ء میں کانگریس کا ساتواں اجلاس ناگپور میں بصدارت شری آنند چارلو منعقد ہوا۔ اس میں (۸۱۲) نمائندے شریک ہوئے۔ بکتی فوج کے کمشنر جنرل بوتھ نے ایک برقیہ روانہ کیا کہ غریبوں اور تہی دستوں کو غیر آباد حصوں میں بسایا جائے۔ کانگریس نے جواباً لکھا کہ کانگریس کا نصب العین غریبوں اور بیروزگاروں کی امداد ہے۔ گذشتہ اجلاس کے اس فیصلہ کو رد کر دیا گیا کہ کانگریس کا اجلاس لندن میں منعقد کیا جائے۔ اور کانگریس کے اجلاس اس وقت تک ہندوستان ہی میں ہوا کریں جب تک ہندوستان کی حالت سدھر نہ جائے۔ یہ فیصلہ اس لئے بھی کیا گیا کہ اسی سال انگلستان میں پارلیمان کے انتخابات ہو رہے تھے۔ حسب دستور وہی قراردادیں منظور ہوئیں جو پہلے اجلاسوں میں منظور کی گئی تھیں۔ چالیس ہزار روپیہ کانگریس کی برطانوی کمیٹی کے لئے مختص کر دئے گئے۔

۱۸۹۲ء

ڈبلیو، سی بنرجی جو کانگریس کے چھٹے اجلاس میں کانگریسی وفد برائے انگلستان کے مندوب تھے کانگریس کے آٹھویں اجلاس منعقدہ الہ آباد سنہ ۱۸۹۲ء کے صدر بنائے گئے۔ اس جلسہ میں شریک ہونے والے نمائندے صرف (۶۲۵) تھے۔ مسٹر ہیوم کے ساتھ اب بجائے پنڈت اجودھیا ناتھ کے شری پی آنند چارلو معتمد منتخب ہو چکے تھے۔ اسی سال لارڈ کراس کا تجویز کردہ قانون مجلس ہند جاری ہوا۔ جسے کانگریس نے منظور کر لیا لیکن احتجاج کیا کہ اس قانون میں نمائندوں کو انتخاب کرنے کا حق

عوام کو حاصل نہیں ہے۔ پبلک سروس کمیشن کی رپورٹ چونکہ تشفی بخش نہیں تھی اس لئے اس کے خلاف احتجاج کیا گیا۔ اور برطانوی پارلیمان میں ایک احتجاجی یادداشت روانہ کی گئی۔ جنوبی ہند کے جنگلوں کے متعلق جو قوانین بنائے گئے تھے ان کے خلاف آواز بلند کی گئی۔ پنجاب کے قوانین کے خلاف بھی احتجاج کیا گیا۔ اس کے بعد حسب سابق قراردادیں دہرائی گئیں۔

سنہ ۱۸۹۳ء

بمقام لاہور سنہ ۱۸۹۳ء میں کانگریس کا نواں اجلاس بصدارت جناب دادا بھائی نوروجی منعقد ہوا۔ تعداد نمائندگان (۶۲۵) تھی۔ معتمد اب بھی مسٹر اے۔ او۔ ہیوم ہی تھے۔ جلسہ میں محکمۂ طبابت کی جانب توجہ کی گئی۔ عدالتوں کے فیصلوں میں سرکاری مداخلت کو ظلم قرار دیا گیا۔ اس مسئلہ پر غور کرنے کے لئے کانگریس نے یہ تجویز پیش کی کہ ہر صوبہ میں ایک کمیٹی اس ظلم کا قلع قمع کرنے کے لئے مقرر کی جائے۔ نیز چاندی ٹکسال میں داخل کر کے سکے حاصل کرنے کے طریقے کو ختم کرنے کے خلاف احتجاج کیا گیا۔ حسب معمول قراردادیں منظور کی گئیں۔

سنہ ۱۸۹۴ء

کانگریس کا دسواں اجلاس بصدارت مسٹر الفرڈ وب مدراس میں سنہ ۱۸۹۴ء میں منعقد ہوا۔ شری پی رنگیا نائیڈو مجلس استقبالیہ کے صدر مقرر ہوئے۔ لنکا شائر کی روئی کے کارخانوں کی سرپرستی کے لئے ہندوستانی سوتی کارخانوں پر ٹیکس لگائے گئے تھے اور پولیس کا ایک نیا قانون بنایا گیا تھا کہ اگر کہیں فساد ہو جائے تو وہاں پولیس کی چوکی بٹھا دی جائے گی اور اس کے اخراجات مقامی رعایا کو برداشت

کرنے پڑیں گے۔ ان دونوں کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی گئی۔ دیسی ریاستوں میں صحافت پر جو پابندیاں عائد کی گئی تھیں ان کی مذمت کی گئی۔

اس جلسہ کی صدارت ایک ایسے شخص نے کی جو برطانوی سامراج کے خلاف آواز بلند کرنے والے ملک آئرستان کا باشندہ تھا۔ مسٹر الفرڈ ویب آزادی آئرستان کے علمبردار تھے اور ہندوستان کی تحریک آزادی سے خاص دلچسپی رکھتے تھے۔ یہ ۱۹۰۰ء میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے رکن بنائے گئے اور ۱۹۰۸ء میں ان کا انتقال ہو گیا۔

۱۸۹۵ء

شری سُریندر ناتھ بنرجی کی صدارت میں کانگریس کا گیارہواں اجلاس بمقام پونہ ۱۸۹۵ء میں منعقد ہوا۔ مسٹر ہیوم کے ساتھ ڈی۔ ای واچا معتمد عمومی مقرر ہوئے اس اجلاس میں (۱۵۸۴) مندوبین شریک ہوئے۔ استقبالیہ کمیٹی کے صدر سری وی یم بھڈے تھے۔ کانگریس نے اس اجلاس میں حکومت ہند کے اس قانون کے نفاذ کی بڑے زور شور سے مذمت کی جس میں وکیلوں کو ججوں اور کمشنر مالگزاری کے تحت کر دیا گیا تھا۔ ریلوں کے تیسرے درجہ میں سفر کرنے والوں کو آسائشیں بہم پہنچانے کی سفارش کی گئی۔ اور پچھلی تجاویز کو دہرایا گیا۔ جنوبی افریقہ میں ہندوستانیوں پر جو مظالم ڈھائے جا رہے تھے ان کے خلاف سخت سست کہا گیا۔ بیرون ہند ہونے والی جنگوں کے اخراجات کا بار ہندوستانی موازنہ پر ڈالنے کے طریقۂ کار کی مذمت کی گئی۔ صوبہ متوسط کے ایک نمائندے کو سامراجی کونسل میں نامزد کرنے کے خلاف آواز اٹھائی گئی کیونکہ یہ نمائندہ مقامی بلدیہ کونسل کا نامزد کردہ نہ تھا۔

سنہ ۱۸۹۶ء

سنہ ۱۸۹۶ء میں کانگریس کا بارھواں اجلاس بمقام کلکتہ رحمت اللہ سیانی کی صدارت میں منعقد ہوا۔ مجلس استقبالیہ کے صدر سر رومیش چندر متر اور معتمد عمومی اب بھی مسٹر ہیوم اور ڈی۔ آئی۔ واچا تھے۔ اس اجلاس میں (۷۸۴) نمائندے شریک ہوئے اور ملکہ وکٹوریہ کی پچاس سالہ جوبلی پر مبارک باد دی گئی۔ اسی سال پلیگ اور قحط کی مصیبتیں ہندوستان پر نازل ہوئیں۔ قحط سے متعلق قوانین کے بارے میں کہا گیا کہ یہ ناکافی ہیں۔ قحط کے بیمہ فنڈ کو دوبارہ جاری کرنے کا مشورہ دیا گیا۔ راجاؤں مہاراجاؤں کو معزول کرنے سے قبل ایک عدالت قائم کرنے کی تجویز حکومت کے آگے رکھی گئی۔ جو ان کے زیر حکومت علاقوں میں بے چینی اور بدنظمی سے متعلق تحقیقات کرے۔ بمبئی اور مدراس کے صوبوں کی مجالس عاملہ میں ہندوستانی نمائندوں کی شرکت کا مطالبہ بھی ہوا۔ اراضی کے مالیہ کے تعلق سے یہ تجویز پیش کی گئی کہ بندوبست آٹھ سال میں ایک وقت ہوا کرے۔

سنہ ۱۸۹۷ء

کانگریس کے معتمدین مسٹر اے۔ او۔ ہیوم اور ڈی۔ آئی۔ واچا نے کانگریس کا تیرھواں اجلاس مسٹر سنکرن نیر کی صدارت میں بمقام امراؤتی سنہ ۱۸۹۷ء میں منعقد کیا جس میں (۶۹۲) نمائندے شریک ہوئے۔ اس سال ہر حیثیت سے ہندوستان پر مایوسی چھائی ہوئی تھی۔ لوکمانیہ تلک کو سزا ہوگئی کیونکہ انھوں نے برطانوی سامراج کے خلاف آواز اٹھائی تھی۔ سردار ناتو اور ان کے بھائی کو جلاوطن کر دیا گیا۔ کانگریس کو تنگ کرنے کے لئے قوانین سخت کر دئے گئے۔ کانگریس کے

جلسہ میں ان تمام بدعنوانیوں کے خلاف آوازے کسے گئے۔ پنجاب کی آئین ساز اسمبلی میں سوالات پوچھنے کے حق کے فقدان کے خلاف احتجاج کیا گیا اور حکومت کو مشورہ دیا گیا کہ قحط سے متعلق جو کمیٹی بنائی گئی تھی اس میں وسعت دیجائے۔

سنہ ۱۸۹۸ء

شری آنند موہن بوس کی صدارت میں کانگریس کا چودھواں اجلاس مدراس میں منعقد ہوا۔ شریک ہونیوالے نمائندوں کی تعداد (۶۱۴) تھی۔ معتمدین حسب سابق مسٹر اے۔او۔ ہیوم اور ڈی۔ای واچا تھے۔ لارڈ کرزن اسی سال وائسرائے بن کر ہندوستان آئے تھے۔ کانگریس نے ان کا خیر مقدم کیا۔ کانگریس نے آگے چل کر اس بات پر زور دیا کہ جنگلات وغیرہ سے متعلق حکومت کو قانون سازی کے وقت صرف آمدنی پر زور نہ دینا چاہیئے بلکہ ان کے تحفظ کے لئے بھی ضروری احتیاط لازمی ہے۔ کانگریس کے دستور کو تبدیل کرنے کے لئے ایک کمیٹی تشکیل دی گئی۔ ہندوستانی صحافت کا گلا گھوٹنے کے لئے جو خفیہ کمیٹیاں مسٹر چیمبر نے بنائی تھیں ان کے خلاف کانگریس نے سخت احتجاج کیا۔ ایک تجویز پیش کی گئی جس میں کہا گیا کہ پلیگ سے بچاؤ کی تدابیر کو روبہ عمل لانے کے لئے اخراجات کا بار بلدیہ کمیٹیوں پر نہ ڈالا جائے بلکہ حکومت خود اس کو برداشت کرے۔

سنہ ۱۸۹۹ء

کانگریس کا پندرھواں اجلاس سنہ ۹۹ء میں لکھنو میں ہوا جس کے صدر شری رومیش چندر دت تھے۔ (۷۸۹) نمائندے اس اجلاس میں شریک ہوئے۔ لارڈ کرزن کے جابر قوانین کی مخالفت کی گئی۔ تار و ٹپہ کے نرخ کم کرنیکی تجویز پیش کی گئی

کلکتہ کے قانون بلدیہ کی مخالفت بھی کی گئی۔ مدرسین کی کانگریس کے اجلاسوں میں شرکت کی اجازت پر زور دیا گیا۔ لالہ لاجپت رائے کی تجویز پر نصف دن کا اجلاس تعلیمی اور اقتصادی حالات کو بہتر بنانے کے مسائل پر ہوا۔ ہندوستان کی دولت کو ہندوستان سے باہر نہ لیجانے پر زور دیا گیا۔

سنہ ۱۹۰۰ء

شری این جی چندر وارکر کی صدارت میں کانگریس کا سولھواں اجلاس لاہور میں منعقد ہوا۔ شریک ہونے والوں کی تعداد (۵۶۷) تھی حسب دستور معتمدین مسٹر اے۔او۔ ہیوم۔ اور ڈی۔ای واچا ہی تھے۔ اس اجلاس میں ہندوستانیوں کو بڑے بڑے عہدے نہ دینے پر احتجاج کیا گیا۔ انگلستان کی کالجوں میں ہندوستانیوں کو داخلہ دینے پر جو پابندیاں لگائی گئی تھیں اس پر بھی احتجاج کیا گیا۔ جنوبی افریقہ کے ہندوستانیوں پر جو پابندیاں لگائی گئی تھیں ان کو اٹھا لینے کی خواہش کی گئی کانگریس کمیٹی میں نمائندوں کی تعداد بڑھائی گئی۔ اور کانگریس کے گزشتہ جلسوں کے صدور کو رکنیت دی گئی۔ پنجاب کے انتقال اراضی کے مسودہ قانون کے متعلق ایک قرارداد منظور کی گئی۔ کانگریس چاہتی تھی کہ اس قانون کو رائج کردیا جائے اور ایک سال کے بعد اس کے نتائج دیکھ کر اس میں ضروری ترمیمات کی جائیں اس کی وجہ یہ تھی کہ کانگریس میں موجودہ مسلمان اس قانون کی مخالفت کر رہے تھے اور دستور کے مطابق یہ لازمی تھا کہ سارے اراکین متفق الرائے ہوں۔

سنہ ۱۹۰۱ء

کانگریس کا ۱۷واں اجلاس بمقام کلکتہ سنہ ۱۹۰۱ء میں بصدارت مسٹر دینشاہ

اڈیولجی واچا منعقد ہوا، مسٹر واچا، مسٹر ہیوم کے ساتھ کانگریس کے معتمد بھی رہ چکے تھے۔ اس اجلاس میں (۸۹۶) نمائندگان نے شرکت کی۔ اجلاس کی کارروائی کے اہم نکات یہ ہیں۔ (۱) آسام کے چائے کے باغیچوں میں ہندوستانی مزدوروں کی جبری بھرتی پر اظہار تاسف۔ (۲) فیس رکنیت بجائے دس روپیہ کے بیس روپیہ کردی گئی۔ (۳) پریوی کونسل میں ایک ہندوستانی رکن کے تقرر کا مطالبہ۔ (۴) ہندوستان کی مالیات پر غور وخوص کرنے کے لئے ایک کمیٹی کا قیام۔ (۵) معدنیات کے کالج کی تاسیس۔ (۶) ڈاکٹر والکر کی زراعتی تجاویز کو عملی جامہ پہنانے کے لئے تجاویز

سنہ ۱۹۰۲ء

سنہ ۱۹۰۲ء میں کانگریس کا اٹھارواں اجلاس احمد آباد میں منعقد ہوا اس میں نمائندوں کی تعداد صرف (۴۷۱) رہ گئی تھی۔ صدارت سری سریندر ناتھ نے کی۔ اس اجلاس میں یونیورسٹی کمیشن کی رپورٹ پر تنقید کی گئی۔ ہندوستان کی غربت اور قحط سالی کے متعلق قرار دادیں منظور کی گئیں۔ کانگریس کی برٹش کمیٹی، اور " انڈیا " (کانگریسی ترجمان) کے اخراجات کے لئے ہر رکن کو دس روپیہ دینے کی خواہش کی گئی۔

سنہ ۱۹۰۳ء

شری لال موہن گھوش کی صدارت میں سنہ ۱۹۰۳ء میں کانگریس کا انیسواں اجلاس مدراس میں منعقد ہوا معتمدین میں ہیوم اور واچا کے علاوہ گوپال کرشنا گوکھلے بھی شامل کر لئے گئے تھے۔ جس میں (۵۳۸) نمائندگان شریک رہے۔ گذشتہ جلسہ میں یونیورسٹی کی تعلیم سے متعلق جس رپورٹ پر تنقید کی گئی تھی اس کا مسودۂ قانون

چونکہ شائع ہو چکا تھا۔ اس کی مخالفت کی گئی کیونکہ اس قانون کے منظور ہو جانے کی وجہ سے یونیورسٹیوں کی آزادی محدود ہو جاتی تھی۔ سرکاری ملازمین کے لئے ایک گشتی جاری کی گئی تھی کہ وہ سرکاری رازوں کو افشا نہ کریں۔ اس حکم کے خلاف آواز اٹھائی گئی۔ انگریزی افواج کے اخراجات کا بوجھ ہندوستان پر جوڑا لا جاتا تھا اس کے خلاف احتجاج کیا گیا۔ اور کہا گیا کہ انگریزی افواج کے اخراجات برطانوی حکومت خود برداشت کرے۔ مالیہ اراضی کے مسئلہ پر بھی بحث ہوئی۔

سنہ ۱۹۰۴ء

سنہ ۱۹۰۴ء میں بمقام بمبئی کانگریس کا بیسواں اجلاس بصدارت سر ہنری کاٹن منعقد ہوا۔ اس اجلاس میں (۱۰۱۰) نمائندوں نے شرکت کی۔ معتمدین اے۔او ہیوم۔ ڈی۔ای۔ واچا اور گوپال کرشنا گوکھلے تھے۔ لارڈ کرزن سیاسی اغراض کی بنا پر تبت گئے ہوئے تھے انھوں نے پارلیمان انگلستان کی اجازت کے بغیر ہندوستانی خزانہ سے روپیہ خرچ کیا تھا اس پر کانگریس نے احتجاج کیا کیونکہ ان کا یہ اقدام سنہ ۵۸ء کے قوانین کے مطابق ناجائز تھا۔ لارڈ کچنر کی فوجی اخراجات کے فنڈ میں اضافہ کی تجویز کی بھی مخالفت کی گئی اور اسی مقصد کے لئے ایک وفد انگلستان روانہ کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ تقسیم بنگال کی تجویز شائع ہو چکی تھی جس کی اس اجلاس میں بڑے زور و شور سے مخالفت کی گئی۔

سنہ ۱۹۰۵ء

شری گوپال کرشنا گوکھلے کی صدارت میں کانگریس کا اجلاس بنارس میں سنہ ۱۹۰۵ء میں منعقد ہوا۔ یہ کانگریس کا اکیسواں سالانہ اجلاس تھا۔ اس اجلاس

میں شریک ہونیوالے نمائندوں کی تعداد (۷۵۶) تھی۔ مخالفت کے باوجود بنگال کی تقسیم عمل میں آچکی تھی تلک اور لالہ لاجپت رائے کی رائے کے مطابق قوم پرست چاہتے تھے کہ شہزادہ ویلز کی آمد کا بائیکاٹ کیا جائے۔ شری گوپال کرشنا گوکھلے اور سر سیندرناتھ بنرجی اس کے مخالف تھے۔ کانگریس نے شہزادہ ویلز کا خیر مقدم کیا۔ بدیشی مال کا بائیکاٹ زوروں پر تھا۔ اجلاس میں اس پر غور نہیں ہوا۔ البتہ کہا گیا کہ بہتر طریقہ یہ ہے کہ قانونی حدود میں حکومت کو تنگ کیا جائے۔ گوکھلے کو کانگریس کی تجاویز پیش کرنے کے لئے انگلستان روانہ کیا گیا۔ پندرہ افراد پر مشتمل ایک کمیشن کا قیام عمل میں آیا جس کا کام تھا کہ کانگریسی نظریہ کو فروغ دے اور تجاویز کو عملی جامہ پہنانے کی حتی الامکان کوشش کرے۔ جنوبی افریقہ کے ہندوستانیوں پر مظالم کی مذمت کی گئی اور مطالبہ کیا گیا کہ جبری مزدوری کے طریقہ کو ختم کر دیا جائے۔

سنہ ۱۹۰۶ء

سنہ ۱۹۰۶ء میں کانگریس کا (۲۲) واں سالانہ اجلاس کلکتہ میں ہوا۔ صدارت دادا بھائی نوروجی نے کی۔ اس اجلاس میں (۱۶۶۳) نمائندوں نے شرکت کی دادا بھائی نوروجی کو ہندوستان بلایا گیا اور کانگریس کی صدارت کی خواہش کی گئی۔ تقسیم بنگال کے خلاف احتجاج سیول سروس کا امتحان ہندوستان و انگلستان دونوں جگہ منعقد کرنے کا مطالبہ۔ آئین ساز کونسل کی توسیع فوجی اخراجات میں اضافہ کے خلاف قراردادیں منظور کی گئیں۔

سنہ ۱۹۰۷ء

ڈاکٹر راش بہاری گھوش کی صدارت میں (۲۳) واں اجلاس سورت

میں منعقد ہوا۔ اولاً طے پایا کہ اجلاس ناگپور میں کیا جائے۔ لیکن کانگریسی قائدین کے اختلاف کی بنا پر سورت میں منعقد کیا گیا۔ تربھون داس۔ ین۔ مالوی نے خطبۂ استقبالیہ پڑھا۔ انبالال ڈیسائی نے ڈاکٹر راش بہاری کا نام صدارت کے لئے تجویز کیا۔ سریندر ناتھ بنرجی نے تائید کی۔ یہ اجلاس نامکمل ہوا۔

سنہ ۱۹۰۸ء

سورت کے نامکمل اجلاس کی تکمیل مدراس میں سنہ ۱۹۰۸ء میں ہوئی اس اجلاس کی صدارت ڈاکٹر راش بہاری گھوش نے کی۔ معتمدین ڈی۔ ای۔ واچا اور ڈی اے کھارے تھے۔ اس اجلاس سے قبل اعتدال پسند کانگریسی اراکین کا ایک جلسہ الہ آباد میں ہوا جس میں کانگریس کا نظام نامہ بنایا گیا۔ اس اجلاس میں قوم پرست کانگریسی شریک نہیں ہوئے۔ بہرحال سنجیدگی کے ساتھ سودیشی اور قومی تعلیم نیز اجتماعی اصلاح کی تجاویز کو پیش کیا گیا۔ برطانوی جنگی دفتر نے ہندوستان پر جو تین لاکھ پونڈ کا بوجھ ڈالا تھا اُس کی مذمت کی گئی۔ اور اس سلسلہ میں پرانی تجاویز کو دہرایا گیا۔ اس اجلاس میں ۶۱۷ نمائندے شریک ہوئے۔

سنہ ۱۹۰۹ء

پنڈت مدن موہن مالویہ کی صدارت میں سنہ ۱۹۰۹ء کا اجلاس لاہور میں منعقد ہوا منٹو مارلے اصلاحات ابھی جاری ہوئی تھیں۔ اس میں انتخابات مذہبی بنیادوں پر ہونے کی مخالفت کی گئی۔ مسلمانوں کو ضرورت سے زیادہ نمائندگی دیدینے پر ناراضگی کا اظہار کیا گیا۔ پنجاب مشرقی بنگال آسام اور برما میں اگزیکیوٹیو کونسل کے قیام پر زور اور صوبہ پنجاب کی اصلاحات کو ناکافی قرار دیا گیا برار کو

سامراجی آئین ساز کونسل میں حق نمائندگی حاصل نہ ہونے پر اظہار تاسف اور گاندھی جی کی عدم تعاون کی تحریک کے لئے چندہ فراہم کیا گیا (۱۸) ہزار روپیہ وصول ہوئے۔ رتن ٹاٹا نے جنوبی افریقہ کے لئے (۲۵) ہزار روپیہ عطیہ دیا۔ حسب معمول دیگر تجاویز دہرائی گئیں۔ ۳۴۳ نمائندوں نے شرکت کی۔

۱۹۱۰ء

سر ولیم وڈر برن کی صدارت میں کانگریس کا (۲۵) واں اجلاس ۱۹۱۰ء میں منعقد ہوا۔ ۳۳۶ نمائندوں نے شرکت کی۔ اس سال فرقہ واریت بڑی حد تک بڑھ چکی تھی سر ولیم وڈر برن نے اس خلیج کو پاٹنے کی کوشش کی۔ بلدیہ مجلسوں کا انتخاب فرقہ وارانہ بنیادوں پر منعقد ہونے والا تھا۔ صوبجات متحدہ میں مشترکہ انتخابی حلقوں کا طریقہ خوش اسلوبی سے جاری تھا۔ قائد اعظم مرحوم خود فرقہ وارانہ انتخابات کے مخالف تھے۔ ۱۹۰۹ء کی تجاویز کو پھر سے دہرایا گیا۔

۱۹۱۱ء

پنڈت بشن نراین در کی صدارت میں ۱۹۱۱ء میں کلکتہ میں منعقد ہوا۔ تقسیم بنگال کی تحریک ختم ہو گئی۔ اس سال ہندوستان کا مستقر کلکتہ سے دہلی میں منتقل ہوا جنوبی افریقہ میں جبری مزدوری کو منسوخ کر دیا گیا۔ قانون صحافت اور دوسرے فرسودہ قوانین کے خلاف احتجاج کیا گیا۔ لوکمانیہ تلک اور دیگر سیاسی قیدی مانڈلے میں نظر بند تھے ان کو رہا کرنے کا مطالبہ کیا گیا۔ مہاتما گاندھی اور جنوبی افریقہ کے ہندوستانیوں کو اس بات پر مبارکباد پیش کی گئی کہ انھوں نے جنوبی افریقہ کے خراب اور فرسودہ قوانین میں ردو بدل کرایا تھا۔

۱۹۱۲ء

۱۹۱۲ء میں کانگریس کا اجلاس بانکی پور میں منعقد ہوا۔ جس کی صدارت آر ین مدھولکر نے کی۔ حکومت کے اصلاحات میں مزید تبدیلیاں نہ کرنے پر کانگریس نے افسوس کا اظہار کیا۔ مطالبہ کیا گیا کہ سامراجی مجلس (امپیریل کونسل) اور صوبائی مجالس قانون ساز میں منتخبہ اراکین کی تعداد زیادہ ہو اور ان کو ضمنی سوالات کا حق دیا جائے۔ ایک قرارداد کے ذریعہ مطالبہ کیا گیا کہ جو لوگ انگریزی سے ناواقف ہیں ان کو مقامی کونسلوں میں منتخب ہونے کا موقع نہ دیا جائے۔ ہندوستانیوں کو اعلیٰ فوجی عہدے نہ دیئے جانے پر اظہار افسوس کیا گیا۔ لارڈ ہارڈنگ پر ایک جلوس کے موقعہ پر جو بم پھینکا گیا تھا۔ مذمت کی گئی۔

۱۹۱۳ء

نواب سید محمدؐ بہادر کی صدارت میں ۱۹۱۳ء کا اجلاس کراچی میں منعقد ہوا۔ اسی اجلاس سے ہندو مسلم اتحاد کا آغاز ہوتا ہے۔ اس امر پر اظہار طمانیت کیا گیا کہ مسلم لیگ نے بھی "سلف گورنمنٹ" کو اپنا معیار بنایا ہے۔ گذشتہ سال کی تجاویز کو پھر سے دہرایا گیا۔ قانون ترک وطن کے خلاف آواز اٹھائی۔

۱۹۱۴ء

شری بھوپیندر ناتھ باسو کی صدارت میں کانگریس کا (۲۹) واں اجلاس ۱۹۱۴ء میں مدراس میں منعقد ہوا۔ معتمدین این سبا راؤ اور نواب سید محمدؐ بہادر تھے شریک ہونے والے نمائندوں کی تعداد (۸۶۶) تھی۔ کانگریس نے برطانیہ سے حلف وفاداری اٹھایا اور سلف گورنمنٹ کا مطالبہ کیا۔ دوسرا مطالبہ یہ تھا کہ

فوج کے اعلیٰ عہدے ہندوستانیوں کو دئے جائیں۔ ہندوستان میں فوجی کالج کھولے جائیں اور ہندوستانیوں کو ایک رضاکار تنظیم بنانے کی اجازت دی جائے۔

۱۹۱۵ء

انڈین نیشنل کانگریس کا (۳۰) واں اجلاس بصدارت سر ستیندر پرسن سنہا ۱۹۱۵ء بمبئی میں ہوا۔ معتمدین نواب سید محمد بہادر اور راین سبا راؤ تھے۔ مجلس استقبالیہ کے صدر دینشاہ ایڈل جی واچا اور شریک ہونے والے نمائندوں کی تعداد (۲۲۵۹) تھی۔ اس اجلاس میں صوبہ جات متوسط کیلئے ایک انتظامی کونسل نیز پنجاب، برما، صوبہ متوسط وغیرہ کے لئے ہائی کورٹ کے قیام کا مطالبہ کیا گیا۔ اصلاحی کاموں کے لئے آل انڈیا کانگریس کمیٹی سے درخواست کی گئی کہ وہ ایک خاکہ تیار کرکے اس کے تحت ایک مستقل پروگرام مرتب کرے تاکہ ہندوستان کے مختلف مقامات پر اس پروگرام کو روبہ عمل لایا جائے۔ اس میں کامیابی حاصل کرنے کے لئے مسلم لیگ سے تعاون کرنے کا اختیار آل انڈیا کانگریس کمیٹی کو دیا گیا۔ اس اجلاس کی خصوصیت یہ تھی کہ اس میں کانگریس کے دستور کی از سر نو تدوین کی گئی۔ اس دستور میں یہ لچک رکھی گئی کہ پھر سے قوم پرستوں کو کانگریس میں شریک ہونے کا موقع دیا گیا۔ تلک آنجہانی نے بھی اپنی جماعت کے ساتھ کانگریس میں شریک ہو جانے پر رضامندی ظاہر کی۔ اس اجلاس کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ مہاتما گاندھی کو مجلس موضوعات کے لئے رکن منتخب نہیں کیا گیا تھا۔ صدر کو اپنے اقتدار حاصلہ کے تحت نامزد کرنا پڑا۔

۱۹۱۶ء

۱۹۱۶ء کا اجلاس لکھنو میں بصدارت امبکا چرن مزمدار منعقد ہوا جس میں (۲۳۰۱) نمائندے شریک ہوئے۔ ایک مدت کے راش بہاری گھوش اور سر نیدر ناتھ نبرجی اس اجلاس میں تلک اور کھاپرڈے کے دوش بہ دوش کام کرتے دکھائی دئے۔ قانون اسلحہ، فوج کے اعلیٰ عہدوں، رضاکار تنظیم، سامراجی ترجیح، پابند معاہدہ مزدوری، جیوری کے ذریعہ مقدمات کی سماعت وغیرہ سے متعلق تجاویز پیش کی گئیں۔ یوروپی زمینداروں اور ہندوستانی کاشتکاروں کے باہمی تعلقات اور کسان طبقہ کی شکایات کے سلسلہ میں بھی قرار دادیں منظور کی گئیں۔ پٹنہ یونیورسٹی کے مسودہ قانون میں ترمیم کے لئے ایک قرارداد منظور کی گئی۔ کانگریس اور لیگ کی مشترکہ کارکردگی کے لئے ایک اسکیم پیش کی گئی۔ قوانین تحفظ امن عامہ کے غلط اور بے روک تھام استعمال پر اظہار افسوس کیا گیا۔ اس سال لیگ کا اجلاس بھی اسی شہر میں منعقد کیا گیا۔ لیگ اور کانگریس میں برادرانہ اخوت اور انتہا پسند اور اعتدال پسندوں میں اشتراک عمل اس اجلاس کی خصوصیت تھی۔

۱۹۱۷ء

مسز اینی بیسنٹ کی صدارت میں کانگریس کا (۳۲) واں اجلاس ۱۹۱۷ء میں کلکتہ میں منعقد ہوا۔ معتمدین سی پی رام سوامی آئر۔ پی کیشب پلے اور ڈھیر گری تھے۔ اس اجلاس میں (۴۹۶۷) نمائندوں نے شرکت کی اس اجلاس میں مسٹر مانٹیگیو کے خیر مقدم، علی برادران کی رہائی، ہندوستان کی تاج برطانیہ

سے وفاداری، فوجی تعلیم کی اہمیت وضرورت، فوجوں میں ہندوستانیوں کے تقرر وغیرہ سے متعلقہ تجاویز و قراردادیں حسب معمول دہرائی گئیں۔ ذمہ دارانہ حکومت کا مطالبہ کیا گیا۔ کانگریس اور مسلم لیگ کی مشترکہ اسکیم پر زور دیا گیا۔ آندھرا دیش کو ایک جداگانہ صوبہ بنانے کا مطالبہ کیا گیا۔ قومی جھنڈے کی کمیٹی کا تقرر ہوا ہندوستانیوں کے زیر اثر بوائے اسکاوٹ تنظیم پر زور دیا گیا۔

۱۹۱۸ء

(۲۵۰۰) نمائندوں کی موجودگی میں بمبئی میں کانگریس کا (۳۳) واں اجلاس منعقد ہوا جس کی صدارت سید حسن امام نے کی کانگریس لیگ کی مشترکہ اسکیم پر مہر تصدیق ثبت کی۔ مانٹیگیو اصلاحات پر تفصیلی بحث کی گئی۔ ہندوستان کی آئین ساز مجلسوں میں مالیات پر بھی بحث کرنے کے اختیارات کا مطالبہ کیا گیا۔ مانٹیگیو اصلاحات کو غیر تشفی بخش قرار دیا گیا۔ انہی دنوں میں لیگ کا اجلاس بھی اسی شہر میں منعقد ہوا تھا اور اس میں بھی ایسی ہی قراردادیں منظور کی گئی تھیں۔ لیگ کے اجلاس کی صدارت راجہ صاحب محمود آباد نے کی تھی۔ ۱۸۱۸ء میں جنگ عظیم ختم ہو چکی تھی۔ ۶؍ فروری کو رولٹ کا مسودہ قانون سامراجی مجلس میں پیش ہوا۔ گاندھی جی نے ستیہ گرہ کا آغاز کرنے کی دھمکی دی۔ ۶؍ اپریل کو کل ہند بنیادوں پر ہڑتال کی گئی جو نہایت ہی کامیاب رہی۔ ہندو مسلم اتحاد کا جو مظاہرہ ہوا وہ عدیم النظیر تھا۔ ڈاکٹر کچلو اور ستیہ پال کو گرفتار کر لیا گیا۔ گجرانوالا اور قصور میں شدید مظاہرے کئے گئے ۸؍ اپریل کو گاندھی جی دلی روانہ ہوئے لیکن ۱۰؍ اپریل کو انہیں راستہ ہی میں گرفتار کر لیا گیا۔ ان کی گرفتاری پر ہندوستان

کے چپہ چپہ میں ہنگامے شروع ہو گئے۔ ۱۳/اپریل کا دن ہندوستان کے لئے نوید نوحہ لے کر آیا۔ جلیانوالہ باغ میں آزادی کے متوالے عوام پر سولہ سو گولیاں چلائی گئیں۔ پنجاب میں مارشل لا کا نفاذ ہوا۔ کانگریس نے تحقیقات کرنے کا مطالبہ کیا۔ وی۔جے۔ پٹیل اور کیلکر انگلستان روانہ ہوئے۔ بی۔ جی ہارنی مین کو ہندوستان بدر کیا گیا۔ سر سنکرن نائر وائسرائے کی انتظامی کونسل سے بطور احتجاج مستعفی ہوئے جو وفود ہندوستان سے انگلستان روانہ ہوئے تھے ان کا مسز اینی بیسنٹ سے تصادم ہوا۔ پنجاب میں کانگریس کی جانب سے تحقیقاتی کمیٹی کا انتخاب ہوا اور سرکاری طور پر ہنٹر کمیشن کا تقرر ہوا۔ علی برادران اور مولانا ابوالکلام آزاد رہا ہوئے۔ اس سال کانگریس کا اجلاس پنڈت مدن موہن مالوی کی صدارت میں دہلی میں منعقد ہوا۔ معتمدین وی جے پٹیل، فضل الحق اور پنڈت گوکرن ناتھ تھے۔ (۴۸۶۰) نمائندوں نے اس اجلاس میں شرکت کی حسب معمول قرار دادیں منظور کی گئیں۔ سیاسی نظر بندوں کی رہائی کا مطالبہ کیا گیا۔

۱۹۱۹ء

۱۹۱۹ء میں تحریک خلافت کا شروع ہونا ہی تھا کہ سارے ہندوستان میں فرقہ واریت عود کر آئی۔ دو تین سال بعد سے یہ زہر شدت سے پھیلنے لگا۔ ۱۹/جنوری کو ایک وفد نے زیر قیادت ڈاکٹر انصاری وائسرائے سے ملاقات کی۔ لیکن وائسرائے کا جواب مایوس کن تھا۔ فروری میں تیسری خلافت کانفرنس بمبئی میں منعقد کی گئی۔ مسلمانوں کا ایک وفد مولانا محمد علی کی قیادت میں ۱۹/مارچ کو جس دن یوم خلافت منایا گیا۔ روانہ ہوا۔ گاندھی جی نے آل انڈیا ہوم رول

کانفرنس کی صدارت منظور کر لی۔ ہنٹر کمیٹی کی رپورٹ ہندوستان و برطانیہ میں
بہ یک وقت شائع کی گئیں ۲۰/ مئی کو خلافت کمیٹی نے گاندھی جی کی عدم تعاون
کی تحریک سے تعاون کرنے کا فیصلہ کیا۔ یکم اگست کو عدم تعاون کا آغاز ہوا۔ اسکے
بعد وائسرائے نے کانگریس اور عدم تعاون کے خلاف ایک شرربار تقریر کی۔ اسی
سال ۳۰/ مئی کو کانگریس کا ۳۵ واں اجلاس امرتسر میں ہوا۔ جس کی صدارت پنڈت
موتی لال نہرو نے کی۔ معتمدین وی۔ جے۔ پٹیل۔ یم۔ اے۔ انصاری اور پنڈت
گوکرن ناتھ تھے۔ اس اجلاس میں سب سے اہم قرارداد جو منظور کی گئی اسکی تحریک
دیش بندھو چترنجن داس نے کی۔ کہ مانٹیگو چمسفورڈ اصلاحات کا بائیکاٹ کیا جائے
لیکن گاندھی جی نے اس میں ترمیم پیش کی۔ طویل بحث کے بعد طے کیا گیا کہ مسٹر مانٹیگیو
کا شکریہ ادا کیا جائے اور اصلاحات پر عملدرآمد اس شرط پر شروع کیا جائے کہ مستقبل
قریب میں کامل ذمہ دارانہ حکومت دی جائے گی۔ لارڈ چمسفورڈ جو ہندوستان کے
وائسرائے تھے انہیں انگلستان واپس بلا لینے کی درخواست کی گئی۔ پنجاب و
گجرات کے ہجوموں کی بدزبانی کی مذمت کی قرارداد پیش کی گئی جسے موضوعات کی
کمیٹی نے نامنظور کر دیا لیکن گاندھی جی کے اصرار پر یہ قرارداد کھلے اجلاس میں پیش
کر دی گئی اور منظور بھی کر لی گئی۔ تحریک خلافت سے متعلق برطانی وزراء کی بدسلوکی
کے خلاف ایک قرارداد میں احتجاج کیا گیا۔ سنکرن نائر کو بطور احتجاج استعفیٰ دینے
پر مبارکباد دی گئی۔ ہارنی مین کی جلاوطنی کے خلاف احتجاج کیا گیا۔

۱۹۲۰ء

سنہ ۱۹۲۰ء کا اجلاس کلکتہ میں منعقد ہوا صدارت لالہ لاجپت رائے نے کی پنجاب

کے تحقیقات سے متعلق کانگریسی ذیلی کمیٹی کی رپورٹ کو تسلیم کیا گیا۔ ہنٹر کمیٹی کی رپورٹ پر کڑی تنقید کی گئی۔ عدم تعاون کے سلسلہ میں ایک قرارداد سے مطالبہ کیا گیا کہ ہندوستانی خطاب یافتہ اصحاب اپنے خطابات واپس کر دیں غیر ملکی مال کا بائیکاٹ کریں سرکاری جلسوں میں شرکت نہ کریں۔ بپن چندر پال نے ایک قرارداد منظور کی کہ وزیر اعظم برطانیہ کے پاس ایک وفد روانہ کیا جائے۔ اجلاس نے گاندھی جی کو قوم کا مسلمہ قائد بنا دیا۔

دوسرا اجلاس عام سنہ ۱۹۲۰ء

سنہ ۱۹۲۰ء ہی میں کانگریس کا ایک اور اجلاس بصدارت سی۔ وجئے راگھو اچاری منعقد ہوا جس میں (۱۴۵۸۳) نمائندوں نے شرکت کی معتمدین موتی لال نہرو، سی راجگوپال آچاریہ اور یم اے انصاری تھے کلکتہ کے اجلاس میں عدم تعاون کی جو قرارداد منظور کی گئی تھی اس کو از سر نو منظور کیا گیا تحریک کی گئی کہ انڈین نیشنل سرویس کا آغاز کیا جائے اور آل انڈیا تلک سوراج فنڈ کھولا جائے۔ ملازمین سرکار سے درخواست کی گئی کہ وہ اس قومی کام میں مدد دیں۔ عدم تعاون کے ساتھ ساتھ عدم تشدد کا پرچار کیا گیا۔ ڈیوک آف کناٹ کا بائیکاٹ کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ اجناس خوردنی کی برآمد پر احتجاج کیا گیا۔ کانگریس کا عقیدہ تبدیل کر دیا گیا اور فیصلہ کیا گیا کہ کانگریس سوراج حاصل کرنے کے لئے پرامن طریقہ ہائے کار اختیار کرے۔ ہندوستان کی تقسیم لسانی صوبوں میں کرنے کا مطالبہ کیا گیا۔ کانگریس کمیٹی کے اراکین کی تعداد (۳۵۰) کر دی گئی۔ مجلس عاملہ (۱۵) اراکین پر مشتمل تشکیل دی گئی۔

۱۹۲۱ء

۱۹۲۱ء عدم تعاون کا یادگار سال تھا۔ ملک کے ہر حصہ میں قومی کالج اور یونیورسٹیاں قائم ہوگئیں سیٹھ جمنا لال بجاج نے تلک سوراج فنڈ میں ایک لاکھ روپیہ کا عطیہ دیا۔ مارچ میں ننکانہ صاحب کا واقعہ پیش آیا جس میں تقریباً دو سو آدمی مارے گئے۔ آل انڈیا کانگریس کمیٹی نے فیصلہ کیا کہ ایک کروڑ روپیہ جمع کرنے کے لئے ایک کروڑ اراکین کی بھرتی کی جائے۔ بیس لاکھ چرخے رائج کئے جائیں۔ جولائی میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی نے شہزادہ ویلز کی آمد کا بائیکاٹ کیا۔ مالابار میں موپلوں نے بھی جنگ آزادی شروع کردی۔ مولانا محمد علی نے فوجی خدمات انجام دینے والے مسلمانوں کے خلاف فتوٰی صادر کیا۔ علی برادران پھر سے گرفتار کر دیئے گئے۔ کراچی میں مقدمہ عدالت کے سامنے پیش کیا گیا۔ مالابار میں مارشل لا نافذ کر دیا گیا۔ ۱۷/ نومبر کو شہزادہ ویلز بمبئی پہنچے۔ ملک کے طول و عرض میں فسادات شروع ہو گئے۔ دھڑا دھڑ گرفتاریاں شروع ہوگئیں۔ چالیس ہزار ہندوستانی جیل میں ٹھونس دئے گئے۔ رضا کاروں کی انجمن ناجائز قرار دیدی گئی۔ کانگریس کے منتخبہ صدر دیش بندھو داس کو بھی اجلاس کے پندرہ دن قبل گرفتار کر لیا گیا۔ اس وجہ سے جو اجلاس احمد آباد میں ہوا اسکی صدارت حکیم اجمل خاں نے کی۔ اس مرتبہ معتمدین موتی لال نہرو، بکر ورتی راجگوپال آچاری، وی جے، پٹیل اور راے رنگا سوامی آئنگر تھے ۴۷۲۶ نمائندوں نے اس اجلاس میں شرکت کی۔ یہ اجلاس خاص اہمیت کا حامل تھا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ کانگریس کا اجلاس کھدر کے شامیانوں میں منعقد کیا گیا۔ عدم تعاون کے فلسفہ اور پروگرام پر ایک طویل قرارداد منظور کر لی گئی۔ کانگریس کا انتظام مکمل طور پر مہاتما گاندھی کے ہاتھ میں دیدیا گیا۔

انہیں اس کا بھی اختیار کیا گیا کہ اپنا جانشین مقرر کریں۔ مولانا حسرت موہانی نے ایک تحریک پیش کی کہ سوراج کا مطلب مکمل آزادی قرار دیا جائے لیکن اسکی شدت سے مخالفت کی گئی اور وہ تحریک نامنظور کر دی گئی۔ کانگریس نے اس اجلاس میں اس کا بھی اعلان کیا کہ تحریک عدم تعاون یا تحریک خلافت کا موپلوں کی جنگ آزادی سے کوئی تعلق نہیں۔ مصطفےٰ کمال پاشا کو یونان میں جو کامیابیاں ہوئی تھیں ان پر مبارک باد دی گئی۔

سنہ ۱۹۲۲ء

اس سال بمبئی میں تمام پارٹیوں کی ایک کانفرنس ہوئی جس میں حکومت کی ظالمانہ پالیسی کی مذمت کی گئی۔ ایک قرارداد میں مطالبہ کیا گیا کہ سیاسی قیدی رہا کر دیے جائیں آمرانہ قوانین واپس لے لئے جائیں اور ایک گول میز کانفرنس منعقد کی جائے۔ لیکن وائسرائے نے ان مطالبات کو ماننے سے انکار کر دیا۔ گاندھی جی نے باردولائی میں سیول نافرمانی شروع کرنے کا ارادہ وائسرائے پر ظاہر کیا۔ گنٹور اور آندھرا کے عوام نے نمک کے ٹیکس ادا نہ کرنے کا اعلان کیا۔ یہاں فوجیں متعین کر دی گئیں اور بعض مقامات پر انسانیت سوز مظالم ڈہائے گئے۔ ۱۲/ فروری کو چوراچوری کے مقام پر ایک تھانے کو جلا دیا جس کے ساتھ (۲۱) سپاہی زندہ جل گئے۔ باردولی کے مقام پر سول نافرمانی کو ختم کرنے اور تعمیری پروگرام کے آغاز کا فیصلہ کیا گیا۔ ۱۳/ مارچ کو گاندھی جی گرفتار کر لئے گئے۔ چھ سال قید کی سزا ہوئی۔ جون میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی نے سول نافرمانی کی کمیٹی تشکیل دی۔ اس سال معتمدین کانگریس منظم علی، ولبھ بھائی پٹیل اور راجندر پرشاد نے

کانگریس کا اجلاس گیّا میں منعقد کیا جس کی صدارت دیش بندھو چترنجن داس نے کی (۳۲۴۰) نمائندوں نے اس اجلاس میں شرکت کی۔

۱۹۲۳ء

فرقہ وارانہ ذہنیت کی وجہ سے فضا مکدر ہو گئی۔ مولانا آزاد کی وجہ سے مختلف الرائے اراکین میں سمجھوتہ ہو گیا۔ جو لوگ صورت حال میں کوئی تبدیلی نہیں چاہتے تھے کانگریس کمیٹی سے علٰحدہ ہو گئے۔ داس کے استعفیٰ کو آل انڈیا کانگریس کمیٹی نے اپنے اجلاس منعقدہ بمبئی میں منظور کر لیا۔ اور ڈاکٹر انصاری قائم مقام صدر بنائے گئے۔ لیکن اس سال عام اجلاس دہلی کی مولانا ابوالکلام آزاد نے صدارت کی۔ مجلس استقبالیہ کے صدر ڈاکٹر ایم۔ اے انصاری مقرر ہوئے اور معتمدین عظیم علی ولبھ بھائی پٹیل اور راجندر پرشاد تھے۔ اسی سال ایک اور اجلاس کوکناڈا میں بصدارت مولانا محمد علی منعقد ہوا۔ جواہر لال نہرو، ڈاکٹر سیف الدین کچلو، گنگا دھر راؤ دیشپانڈے اور بی گوپال کرشن اننگار معتمدین منتخب ہوئے۔ اور اس اجلاس میں (۶۱۸۰) اراکین نے شرکت کی۔

۱۹۲۴ء

کلکتہ میں سر بازار ارنسٹ ڈے کو قتل کر دیا گیا۔ جوہو کے مقام پر گاندھی، داس اور نہرو گفت و شنید ہوئی۔ جون میں کانگریس کمیٹی کا اجلاس احمد آباد میں منعقد کیا گیا۔ کانگریس میں رائے دہی کی بنیاد تاگا کاتنے کی اساس پر رکھی گئی۔ سبھاش چندر بوس اور دوسرے کانگریسی نیتاؤں کو گرفتار کر لیا گیا۔ گاندھی جی کا (۲۱) دن کا برت ماہ ستمبر میں شروع ہوا۔ بمبئی میں ایک آل پارٹیز کانفرنس منعقد کی گئی لیکن

اس کا نتیجہ کچھ نہ نکلا۔ اس سال کانگریس کا اجلاس عام مہاتما گاندھی کی صدارت میں بلگام میں منعقد کیا گیا۔ معتمدین شعیب قریشی، ڈی۔ اف۔ جھروچا اور جواہر لال نہرو تھے۔ اس اجلاس عام میں (۱۸۴۴) اراکین نے شرکت کی۔ نومبر میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی نے گاندھی جی، داس اور نہرو گفت وشنید اور مفاہمت کو منظور کیا تھا اس کو اجلاس عام میں پیش کیا گیا اور اس کو تسلیم بھی کر لیا گیا۔ لارڈ ریڈنگ اس سال انگلستان واپس ہوئے۔ دیش بندھو داس اور سر بیندرنا تھ بنرجی کا انتقال ہوا۔ مرکزی کونسل میں موتی لال نہرو نے جو گول میز کانفرنس کی تحریک پیش کی وہ منظور کر لی گئی۔ ڈاکٹر سہروردی سوراج پارٹی سے مستعفی ہو گئے۔ وٹھل بھائی پٹیل اسمبلی کے صدر منتخب ہوئے۔ بنگال میں سوراج پارٹی کے اراکین میں اختلافات پیدا ہو گئے۔ ۱۲ ستمبر کو کانگریس کمیٹی کا اجلاس بمقام پٹنہ منعقد ہوا۔ کانگریس کے حلقوں میں اختلافات پیدا ہو گئے اور سال بھر ہندوستان میں جا بجا فرقہ وارانہ فسادات ہوتے رہے۔ اکالی تحریک کا خاتمہ ہو گیا۔

۱۹۲۵ء

شریمتی سروجنی نائیڈو کی صدارت میں کانگریس کا اجلاس اس سال کانپور میں منعقد ہوا۔ استقبالیہ کمیٹی کے صدر ڈاکٹر مرلی لال اور معتمدین یم اے انصاری، اے رنگ سوامی آئنگار اور پنڈت سنتانم تھے۔ اسی اجلاس میں اکثر انہیں مسائل پر بحث وتمحیص اور فیصلے کئے گئے جو جنوبی افریقہ سے متعلق تھے۔ ایک یہ بھی فیصلہ کیا گیا کہ جنوبی افریقہ کے مسائل کو سلجھانے کے لئے ایک گول میز کانفرنس منعقد کی جائے۔

۱۹۲۶ء

اے سرنیواس آئنگار کی صدارت میں گوہاٹی کے مقام پر کانگریس کا ۴۲ واں اجلاس منعقد ہوا۔ اس اجلاس میں شریک ہونے والے اراکین کی تعداد تین ہزار تھی۔ نظر بنداں بنگال کے متعلق اختیارات خاص سے جو قوانین بنائے جارہے تھے ان کی مذمت کی گئی۔ ہندو مسلم اتحاد پر پھر سے زور دیا گیا۔ اس سال رائٹ آنریبل وی ایس سرنیواس ساشتری کو ہندوستانی ایجنٹ بنا کر جنوبی افریقہ بھیجا گیا۔ چار سال کی حراست کے بعد سبھاش چندر بوس رہا کردیے گئے۔

۱۹۲۷ء

اس سال انڈین نیشنل کانگریس کا ۴۵ واں اجلاس مدراس میں منعقد ہوا جس کی صدارت ڈاکٹر ایم اے انصاری نے کی۔ استقبالیہ کمیٹی کے صدر مسٹر سی ایم متھورنگ مدلیار اور معتمدین شعیب قریشی، جواہر لال نہرو، اور سبھاش چندر بوس تھے۔ (۲۶۹۴) نمائندوں نے اس اجلاس میں شرکت کی۔ اہم قرارداد میں یہ کہا گیا تھا کہ بہرصورت و بہرمنزل سائمن کمیشن کا بائیکاٹ کیا جائے۔ بائیکاٹ کے سلسلہ میں تفصیلی ہدایات دی گئیں۔ اس سنیہ گرہ کا کامیابی سے اختتام ہوا۔ اسمبلی میں تحفظ امن عامہ کے مسودہ قانون کو پیش کیا گیا۔ بھگت سنگھ نے ایوان میں بم پھینکا۔ سرنیواس آئنگار نے آزادی ہند کی لیگ قائم کی۔ لاہور میں لالہ لاجپت رائے پر شدید لاٹھی چارج کی گئی۔ اور اس قدر مجروح ہوئے کہ جانبر نہ ہوسکے۔ لاہور میں مہتمم پولیس مسٹر سانڈرس کو گولی مار کر ہلاک کردیا گیا۔ نوجوانوں کی تحریکات زور پکڑتی رہیں ملک کے ہر حصہ میں گرفتاریاں شروع ہوگئیں۔

۱۹۲۸ء

پنڈت موتی لال نہرو کی صدارت میں اس سال کانگریس کا اجلاس کلکتہ میں منعقد ہوا۔ مجلس استقبالیہ کے صدر جے۔ یم۔ سین گپتا اور معتمدین مسٹر یم اے انصاری اور پنڈت جواہر لال نہرو تھے اور (۵۲۲۱) نمائندوں نے شرکت کی۔ اس اجلاس میں کل ایشیائی وفاق قائم کرنے کی تجویز پر غور کیا گیا۔ گذشتہ سال باردولی کے تمام پر ولبھ بھائی پٹیل کی کامیاب ستیہ گرہ پر انہیں مبارک باد دی گئی۔ ہندوستانی ریاستوں میں ذمہ دارانہ حکومت کا مطالبہ کیا گیا۔ اس اجلاس کی خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس میں پچاس ہزار مزدوروں نے جمع ہو کر قومی جھنڈے کو سلامی دی۔ اور مکمل آزادی کا مطالبہ کیا۔ اسال مارچ میں گاندھی جی کلکتہ میں گرفتار ہو گئے اور ان کو بدیشی کپڑا جلانے کے جرم میں ایک روپیہ جرمانہ کیا گیا۔ کانگریس کمیٹی کا اجلاس بمبئی میں منعقد ہوا ملک کے ہر حصہ میں تشدد کا دور دورہ تھا۔ "غلامی" نامی رسالہ مسدود کر دیا گیا۔ بھگت سنگھ کو پھانسی اور دت کو حبس دوام بعبور دریائے شور کی سزا سنائی گئی۔

۱۹۲۹ء

اسال کانگریس کا جلسہ عام لاہور میں منعقد ہوا۔ جس کی صدارت پنڈت جواہر لال نہرو نے کی۔ صدر استقبالیہ ڈاکٹر سیف الدین کچلو اور معتمدین عمومی سید محمود سری پرکاش اور جے رام داس دولت رام تھے۔ اس اجلاس میں اہم قراردادیں آزادی کے متعلق منظور کی گئیں۔ آل انڈیا کانگریس کمیٹی کو اختیار دیا گیا کہ وہ پھر سے سیول نافرمانی کا آغاز کرے۔ اقلیتوں کو تیقن دیا گیا کہ ان کے

حقوق کا تحفظ کیا جائے گا۔

کانگریس کی اور آزادی ہند کی جد و جہد میں اس سال کو بڑی اہمیت حاصل ہے کیونکہ ملک کے ہر حصہ میں ایک جوش دیکھا گیا۔ ۲/جنوری کو ورکنگ کمیٹی نے "یوم آزادی" کا اعلان کیا جو ملک کے ہر حصہ میں منایا گیا۔ گاندھی جی نے گیارہ نکات کا بیان جاری کیا۔ سبھاش چندر بوس کو ایک سال کی سزا ہوئی تمام کانگریسی اراکین مجالس قانون ساز سے مستعفی ہو گئے۔ ورکنگ کمیٹی نے فروری میں گاندھی جی کو سیول نافرمانی شروع کرنے کا اختیار دیدیا۔ آل انڈیا کانگریس کمیٹی نے اپنے اجلاس احمد آباد میں اس کی منظوری دیدی۔ ۱۲/مارچ کو ڈانڈی کا کوچ شروع ہوا۔ ۶/اپریل کو قانون نمک توڑا گیا۔ کانگریس پر امتناع عائد کر دیا گیا۔ ایک لاکھ سے زیادہ ہندوستانی جیلوں میں ٹھونس دئے گئے۔ گول میز کانفرنس کے اراکین واپس آ گئے تھے۔ سپرو اور جیکر کے مابین گفت و شنید ہوئی۔ گاندھی اور ارون کے مابین مفاہمت ہو گئی۔ سیاسی قیدیوں کی عام رہائی کا اعلان ہوا اور بھگت سنگھ اور اس کے ساتھیوں کو پھانسی پر لٹکا دیا گیا۔

سنہ ۱۹۳۰ء

اس سال نیشنل کانگریس کا اجلاس نہیں ہوا۔

سنہ ۱۹۳۱ء

کراچی میں بصدارت سردار ولبھ بھائی پٹیل کانگریس کا ۴۸واں اجلاس منعقد ہوا۔ اجلاس میں بھگت سنگھ اور ان کے رفقائے کار کے تشدد کو ناپسند کرتے

ہوئے ان کے جذبہ ایثار کی ستائش کی گئی اور ان کو پھانسی دینا ایک مجرمانہ اور ظالمانہ فعل قرار دیا گیا۔ گاندھی جی کو اختیار دیا گیا کہ دوسری گول میز کانفرنس میں کانگریس کی جانب سے نمائندگی کریں۔ اس سال لارڈ ارون کی جگہ لارڈ ولنگڈن ہندوستان کے وائسرائے مقرر ہوئے۔ جولائی میں گاندھی جی شملہ گئے۔ گاندھی ارون مراسلت شروع ہوئی، ۱۳/اگست کو گاندھی جی نے فیصلہ کیا کہ وہ لندن نہیں جائیں گے۔ بمبئی میں کانگریس کمیٹی نے قائم مقام گورنر کے اقدام قتل کی مذمت کی اور اسی اجلاس میں یہ بھی فیصلہ کیا گیا کہ قومی جھنڈے پر زعفرانی سفید اور سبز رنگ ہوں اور درمیان میں چرخہ کا خاکہ ہو، دہلی میں وائسرائے اور گاندھی جی، ولبھ بھائی پٹیل، جواہرلال نہرو کے مابین گفت وشنید ہوئی گاندھی ایرون سمجھوتہ ہوا۔ پھر گاندھی جی انگلستان روانہ ہوئے۔ ڈسمبر کو ان کی واپسی کے بعد جواہرلال، شیروانی، ٹنڈن، خان عبدالغفار خاں گرفتار کرلئے گئے۔ گاندھی جی نے وائسرائے سے ملنے کی خواہش ظاہر کی۔ ولنگڈن نے انکار کردیا گاندھی جی اور صدر کانگریس گرفتار کرلئے گئے۔ اس کے علاوہ مختلف گرفتاریاں عمل میں آئیں۔

سنہ ۱۹۳۲ء و سنہ ۱۹۳۳ء

گذشتہ سال کانگریس پر امتناع عائد کردیا گیا تھا اور کانگریسی نیتاؤں کو گرفتار کرلیا گیا۔ اس کے باوجود اپریل سنہ ۱۹۳۲ء میں ایک اجلاس بمقام دہلی ہوا جس میں پولیس کی شدید نگرانی کے باوجود (۵۰۰) نمائندے شریک ہوئے۔ اس اجلاس کی صدارت کے لئے پنڈت مدن موہن مالویہ کو منتخب کیا گیا تھا۔ اور جب وہ اجلاس میں شرکت کے لئے جارہے تھے انہیں گرفتار کرلیا گیا۔ اس اجلاس میں مکمل آزادی، کانگریس کا

نصب العین قرار پائی۔ سیول نا فرمانی کانگریس کا حربہ قرار پایا۔ گاندھی جی کو کانگریس کا مسلمہ نیتا بنایا گیا اور عدم تشدد پر کامل ایقان کا اظہار کیا گیا۔ دوسرے سال اپریل میں کانگریس کا اجلاس کلکتہ میں منعقد ہوا پنڈت مالویہ دوبارہ صدر منتخب ہوئے اور انہیں دوبارہ گرفتار کر لیا گیا۔ ان دو سالوں میں سخت تشدد کے باوجود سیول نافرمانی زوروں پر تھی۔ غیر آئینی ادب کثرت سے تیار کیا گیا محصولات کی عدم ادائیگی کی مہم مختلف مقامات پر شروع ہوئی۔ ۱۷/ اگسٹ کو فرقہ وارانہ، وارڈ کا اعلان کیا گیا۔ گاندھی جی نے فیصلہ کیا کہ وہ برت رکھیں گے۔ گاندھی اور میکڈونلڈ کے مابین مراسلت ہوتی رہی۔ ملک میں عام بے چینی اور ناراضگی کا اظہار کیا جاتا رہا۔ گاندھی جی نے ۲۰/ ستمبر سے برت کا آغاز کر دیا۔ اور تمام طبقات کے قائدین گاندھی جی سے ملتے رہے۔ ۲۴/ ستمبر کو ہریجنوں، ہندوؤں اور کانگریسی نیتاؤں کے دستخط ہوئے۔ چند تیقنات ملنے کے بعد ہریجنوں نے جداگانہ انتخابات سے دستبرداری کا اعلان کیا۔ ۲۶/ ستمبر کو گاندھی جی کا برت ختم ہو گیا۔ تیسری گول میز کانفرنس میں سیٹھنا، شاستری اور مسٹر جناح کو شامل نہ کیا گیا۔ گاندھی جی کو جیل میں ہریجنوں کی خدمت کرنے کا موقع نہ دیا جانے پر گاندھی جی کے احکام کے مطابق زوردار جد و جہد شروع ہو گئی۔ گوروویو مندر کے داخلہ سے متعلق استصواب کیا گیا اکثریت نے داخلہ کی تائید کی۔ پھر ہریجن سیوک سنگھ کا قیام عمل میں آیا۔ "ہریجن" ہفتہ وار جاری کیا گیا۔ گاندھی جی نے اپنے آپ کو پاک کرنے کے لئے ۲۱ دن کا برت رکھا۔ قائم مقام صدر مسٹر اینے نے پہلے ڈیڑھ ماہ کے لئے اور پھر دو ماہ کے لئے سول نافرمانی کو ملتوی کر دیا۔ ۱۲/ جولائی کو کانگریسی

کارکنوں کی ایک بے ضابطہ کانفرنس ہوئی جس میں گاندھی جی کو اس بات کا اختیار دیا گیا کہ وائسرائے سے ملیں لیکن وائسرائے نے ملاقات کرنے سے انکار کر دیا۔ اجتماعی سیول نافرمانی کو ملتوی کر کے انفرادی سیول نافرمانی کا آغاز کیا گیا یکم اگسٹ کو گاندھی جی گرفتار کر لئے گئے اور ایک سال کے لئے قید کیا گیا۔ پھر جیل میں ہریجنوں کی خدمت کرنے کا موقع نہ دیا جانے کی بنا پر گاندھی جی نے برت رکھنا شروع کر دیا۔ ۲۲/اگسٹ ۱۹۳۳ء کو گاندھی جی رہا کر دئے گئے اور فیصلہ کیا کہ یکم اگسٹ ۱۹۳۴ء تک سیول نافرمانی سے باز رہیں۔ پھر گاندھی جی نے ہریجنوں کی سدھار کے لئے ہندوستان بھر کا دورہ کیا۔ بہار میں پندرہ ہزار مربع میل کے اندر ایک شدید زلزلہ آیا۔

۱۹۳۴ء

بہار کے زلزلہ کی وجہ ہندوستان کا جو نقصان عظیم ہوا اس کی وجہ سے ہراسانی پھیل گئی۔ ۷/اپریل کو سیول نافرمانی کی تحریک عام طور پر ملتوی کر دی گئی پھر ڈاکٹر انصاری، بدھن چندر رائے اور ستیہ مورتی نے سوراج پارٹی تشکیل دی۔ پٹنہ میں کانگریس کمیٹی کا اجلاس ہوا پارلیمانی پروگرام بہت پسند کیا گیا۔ سوراج پارٹی کانگریس کا جزو لازم بن گئی۔ ۱۷/مئی کو پٹنہ ہی میں کانگریس سوشلسٹ پارٹی کا پہلا اجلاس ہوا۔ پونا میں گاندھی جی پر بم پھینکا گیا۔ عوام کی بے صبری کو دور کرنے کے لئے گاندھی جی نے سات دن کا برت رکھا۔ بمبئی ہی میں اس سال کانگریس کا ۴۹ واں اجلاس بصدارت بابو راجندر پرشاد منعقد ہوا۔ کانگریس کے معتمدین جے۔بی کرپلانی، سید محمود اور جیرام داس دولت رام تھے۔ پارلیمانی بورڈ

اور اس کی حکمت عملی اور اس کے پروگرام سے متعلق کانگریس کمیٹی کے قراردادوں کی تائید کی گئی قوم کو اس کی پامردی اور سامراجی مظالم کو برداشت کرنے پر مبارکباد دی گئی۔ کل ہند دیہی صنعتوں کی ایک انجمن قائم کرنے کی تجویز کی گئی جو گاندھی جی کی قیادت میں قائم ہونے والی تھی۔ آئین کانگریس میں کئی ایک تبدیلیاں کی گئیں۔ مزدوروں کو حق انتخاب دیا گیا۔ کھدر سے متعلق ضروری قراردادیں منظور کی گئیں۔ دوسری قرارداد میں ہندوستان کو مرتبہ مملکت دینے سے متعلق تھیں۔ گاندھی جی نے کانگریس کی ابتدائی رکنیت سے استعفیٰ دیکر کانگریس سے کنارہ کشی اختیار کر لی۔

۱۹۳۵ء

مرکزی قانونی اسمبلی کے انتخابات ہوئے جن میں کانگریس نے تشفی بخش کامیابی حاصل کی۔ قانون حکومت ہند کو منظور کیا گیا اور کانگریس کی مجلس عاملہ نے اسے نامنظور کر دیا۔ دستور کی تدوین ہندوستانی دستور ساز مجلس کے ہاتھوں کرنے کا مطالبہ کیا تھا۔ راجندر پرشاد اور جناح کے مابین فرقہ وارانہ اتحاد کے سلسلہ میں گفت و شنید کی گئی جو بے سود ثابت ہوئی۔ اسی سال کانگریس کا جشن طلائی منایا گیا اور ڈاکٹر پٹابھی کی تاریخ کانگریس کی پہلی جلد شائع ہوئی۔ جنتیوں کا وفد ہندوستان آیا اور ملک کا دورہ کرتا رہا۔ اس سال لکھنؤ میں کانگریس کا اجلاس بصدارت پنڈت جواہرلال نہرو ہوا۔ جس میں سبھاش بوس کی گرفتاری کی مذمت کی گئی۔ مکمل آزادی کا مطالبہ کیا گیا۔ ایک قرارداد میں سامراجی رجحانات کی مذمت کی گئی۔ کل ہند کاشتکاری پروگرام سے متعلق صوبجاتی کمیٹیوں سے مشورہ کرنے

کا فیصلہ کیا گیا۔

۱۹۳۶ء

اس سال لکھنؤ میں دیہی صنعتوں کی نمائش کا انتظام کیا گیا۔ شیوگاؤں میں مستقل قیام کا فیصلہ گاندھی جی نے کیا۔ ناگپور میں کل ہند ادبی کانفرنس ہوئی ۳۰/ اپریل کو گاندھی امبیڈکر ملاقات ہوئی۔ کانگریس نے انتخابی اعلان شائع کر دیا سینہ مورتی کی انتخابی مہم کا بھی آغاز ہوا۔ پنڈت جواہرلال نہرو نے کل ہند دورہ کیا کانگریس کی مخالف جماعتیں انتخابات میں مقابلہ کرنا چاہتی تھیں۔ کانگریسی کارکنوں کے انتخاب کے سلسلہ میں عوام نے آمادگی ظاہر کی۔

۱۹۳۷ء

فیض پور میں ۱۹۳۷ء کا اجلاس پنڈت جواہرلال نہرو کی صدارت میں منعقد ہوا جس میں عالمگیر امن کانفرنس سے متعلق سری وی کے کرشن مینن کی رپورٹ پر غور کیا گیا۔ دنیا میں امن قائم کرنے کے لئے سامراجیت کو ختم کرنے کی تجویز پیش کی گئی برما کی ہندوستان سے علٰحدگی سے متعلق اظہار کیا گیا کہ یہ برمیوں کی رائے کے خلاف ہے حکومت خود اختیاری رکھنے والی انسٹی ٹیوشنوں کو یکساں کرنیکا مطالبہ کیا گیا۔ کانگریس کے قانون سازوں اور کانگریس کمیٹی کا ایک کنونشن منعقد کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ اور قانون حکومت ہند کے تحت عہدوں کو قبول کرنیکا فیصلہ اس کنونشن کے تفویض کر دیا گیا۔

۱۹۳۸ء

عام انتخابات میں کانگریس کو خاطرخواہ کامیابی ہوئی۔ ہندوستان کے

(۱۱) صوبوں سے (۸) صوبوں میں کانگریسی اراکین کی اکثریت تھی۔ آل انڈیا کانگریس کمیٹی نے اعلان کیا کہ عہدے قبول کر لئے جائیں لیکن وزارتوں کو قبول اس وقت تک نہ کیا جائے جب تک گورنر اپنے خصوصی اختیارات کو استعمال نہ کرنے کا تیقن دیں۔ یکم مارچ کو اصلاحات کے خلاف دن منایا گیا۔ گورنروں نے اطمینان دلایا تو وزارتیں قبول کر لی گئیں۔ وزارتوں نے کانگریسی پروگرام کو روبہ عمل لانا شروع کیا۔ سلیم میں ترک مسکرات کا تجربہ کیا تھا۔ کانگریس کمیٹی نے اکتوبر میں جبر و تشدد سے متعلق ایک قرارداد منظور کی جس کی گاندھی جی نے سختی سے مخالفت کی اور نہرو جی نے استعفیٰ دیدینے کا خیال ظاہر کیا۔ مزدوروں کو قوت سے دبانے کی کوشش پر گاندھی جی نے وزارتوں کی مذمت کی۔ ہندو مہاسبھا اور مسلم لیگ نے کامل آزادی کو اپنا نصب العین قرار دیا۔ جزائر انڈمان کے قیدیوں کا سوال بھی زیر بحث آیا۔ بمبئی کی قانون ساز اسمبلی نے مندروں میں عام داخلے کا قانون پاس کیا تو دوسرے صوبوں نے تقلید کی۔ صوبجات متحدہ و بہار میں وزارتوں کی صورت حال نازک ہوگئی۔ سیاسی قیدیوں کے مسئلہ پر گورنر کی مداخلت کی وجہ حالات سدھر گئے۔

کانگریس کا (۵۲) واں اجلاس ہری پورہ میں ہوا جس کی صدارت نیتا جی سبھاش چندر بوس نے کی۔ اس اجلاس میں خصوصی قرارداد ہندوستانی وفاق کی اسکیم سے متعلق تھی جس میں مجوزہ وفاق کی مذمت کی گئی۔ اکھل بھارت تعلیمی فنڈ قائم کیا گیا۔ اقلیتوں کو اس بات کا یقین دلایا گیا کہ ان کی ترقی کا وسیع میدان موجود ہے ریاستوں میں پارلیمانی تحریک کانگریس کے نام پر نہ کرنے کی تلقین کرتے ہوئے ریاستی عوام کو یقین دلایا گیا کہ کانگریس کی ہمدردیاں ان کے ساتھ ہیں صوبجات

بہار و متحدہ میں وزارتوں کے استعفٰے پیش کر دینے کا اعلان کیا گیا۔ کسان سبھاؤ
کو پسندیدگی سے دیکھتے ہوئے اعلان کیا کہ کانگریس ایسی سبھاؤں سے واسطہ نہ
رکھ سکتی۔ سمندر پار ہندوستانیوں کے متعلق قراردادیں منظور کی گئیں۔

۱۹۳۹ء

مارچ میں گاندھی سیوا سنگھ کانفرنس ہوئی۔ اس کے بعد گاندھی جی نے صو
سرحد کا دورہ کیا۔ ڈاکٹر کھرے صوبجات متوسط و برار کی وزارت سے مستعفی ہو گئے
مجلس عاملہ نے ان کے اس اقدام کی مذمت کی اور کانگریس کمیٹی نے تادیبی کارروا
کی۔ اکتوبر میں صوبجاتی وزیروں کی ایک کانفرنس میں قومی ارتقا کی منصوبہ بندی
غور کیا گیا اور اس کام کو پورا کرنے کے لئے ایک کمیٹی تشکیل دی گئی۔ جس کے صدر پنڈ
جواہرلال نہرو منتخب کئے گئے۔ کانگریس کی صدارت کے لئے پٹابھی سیتا رامیا او
سبھاش بوس میں مقابلہ ہوا۔ سبھاش بوس کثرت آراء سے کامیاب ہوئے" ہریجن
میں گاندھی جی نے لکھا کہ پٹابھی کی ناکامی میری ناکامی ہے۔ راجکوٹ میں سیو ل
نافرمانی کا آغاز ہوا۔ گاندھی جی امن قائم کرنے کے لئے راجکوٹ گئے۔ ۳ مارچ کو
مرن برت کا آغاز کیا۔ وائسرائے کی مداخلت کے لئے اپیل کی گئی۔ مارس گوائر ثالث
مقرر ہوئے۔ اس سال کا اجلاس سبھاش بوس کی صدارت میں تری پوری میں شروع
ہوا۔ یہ کانگریس کا ۵۲ واں اجلاس تھا۔ سبھاش بوس سخت بیمار تھے اور گاندھی جی
راجکوٹ میں مرن برت رکھے ہوئے تھے۔ اس لئے یہ اجلاس نہایت ہی غیر معمولی
حالات میں ہوا۔ اپنی علالت کے باوجود سبھاش بوس نے اپنے فرائض انجام دینے
کی کوشش کی لیکن اکثر دفعہ مولانا ابوالکلام آزاد کو ان کی قائم مقامی کرنا پڑا

گووند ولبھ پنت نے ایک قرارداد پیش کی جس میں انھوں نے یہ تجویز پیش کی تھی کہ چونکہ گاندھی جی پر کانگریس کا پورا اعتماد ہے اور سابقہ مجلس عاملہ پر بھی، اس لئے نئی عاملہ گاندھی جی کے حسب منشا تشکیل دی جائے۔ اس پر نہایت پرجوش بحث ہوئی۔ راجہ جی نے ایک ایسی کشتی کی داستان سنائی جس میں سوراخ کی راہ سے پانی آنے لگا تھا۔ اس قرارداد کو مغلوب کن اکثریت سے منظور کر لیا گیا کانگریس کے دستور میں ضروری تبدیلی کرنے کا اختیار کانگریس کمیٹی کو دیا گیا۔ برطانیہ کی خارجہ حکمت عملی کی مذمت کی گئی۔

سنہ ۱۹۴۰ء

تنازعہ راجکوٹ میں گورنر نے اپنا فیصلہ سنایا گاندھی جی نے اسے نامنظور کر دیا۔ کلکتہ میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا اجلاس ہوا۔ سبھاش بوس صدارت سے مستعفی ہو گئے۔ اور ان کی جگہ راجندر پرشاد صدر بنے اور سابقہ مجلس عاملہ پھر سے قائم ہو گئی۔ ۲۱/ مئی کو سبھاش بوس نے فارورڈ بلاک قائم کیا۔ اور ہندوستان بھر کا دورہ کیا۔ بمبئی میں ترک مسکرات کی مہم رائج کر دی گئی۔ واردھا میں کانگریس کمیٹی نے سبھاش بوس کے خلاف تادیبی کارروائی کی۔ اور انہیں تین سال کے لئے کانگریس سے نکال دیا۔ یورپ میں جنگ کا آغاز ہو چکا تھا۔ گاندھی جی نے وائسرائے سے ملاقات کی۔ پھر نہرو اور راجندر پرشاد سے وائسرائے کی بات چیت جاری رہی۔ ۱۹/ اکتوبر کو کانگریس کمیٹی کا اجلاس واردھا میں ہوا۔ ۲۲/ اکتوبر کو کانگریس نے آٹھوں وزارتوں کو مستعفی ہونے کے لئے کہا۔ اور ۸/ نومبر کو آٹھوں وزارتیں مستعفی ہو گئیں۔ اور آئین معطل ہو گیا۔ ۲۲/ نومبر کو کانگریس

کی مجلس عاملہ کا اجلاس ہوا جس میں تعمیری کام پر زیادہ زور دیا گیا۔ رام گڑھ میں مولانا ابوالکلام آزاد کی صدارت میں جو اجلاس ہوا وہ جنگ کی وجہ سے پیدا کردہ ابتر حالت سے متعلق تھا۔ اس اجلاس میں زیادہ تر جنگ ہی سے متعلق بحث و تمحیص ہوئی

۴۰۶

جو قراردادیں منظور کی گئیں ان میں کہا گیا کہ برطانیہ اپنے سامراجی مفادات کے تحفظ کے لئے یہ جنگ لڑ رہا ہے اور ہندوستان کی رائے عامہ کو معلوم کئے بغیر ہندوستان کو جنگ میں شریک کر لینے پر احتجاج بھی کیا گیا۔ جو مطالبات پیش کئے گئے وہ یہ تھے :۔ مکمل آزادی۔ مجلس دستور ساز کا بالغ رائے دہی کی اساس پر انتخاب، آزادی، جمہوریت اور قومی اتحاد کی بنیادوں پر دستور ہند کی تدوین۔ گاندھی جی اور وائسرائے میں پھر بات چیت شروع ہوئی۔ مجلس عاملہ نے دہلی میں اس بات پر زور دیا کہ عدم تشدد بدیشی سامراجیت کو ختم کرنے کے لئے مفید ثابت نہیں ہو سکتا۔ قومی حکومت کا مطالبہ۔ اور گاندھی جی کو کانگریس کی قیادت سے سبکدوش کیا گیا۔ اس کے بعد سبھاش چندر بوس گرفتار کر لئے گئے۔ ۲۵/ جولائی کو مجلس عاملہ کے اجلاس میں راجہ جی کی مشہور پیش کش کو کانگریس نے نامنظور کر دیا وائسرائے نے انتظامی کونسل میں توسیع کی۔ گاندھی جی نے انفرادی سول نافرمانی کا آغاز کیا۔ ونوبا بھاوے نے سب سے پہلے گاندھی جی کی آواز پر لبیک کہا۔ ۳۱/ اکتوبر کو جواہر لال نہرو گرفتار کر لئے گئے۔ چار سال قید کی سزا سنائی گئی۔ صحافت پر پابندیاں لگا دی گئیں۔ مولانا ابوالکلام کو گرفتار کر لیا گیا۔ پھر راجگوپال آچاری اور ستیہ مورتی کو بھی گرفتار کر لیا گیا۔ ۲۵/ ڈسمبر ۱۹۴۰ء سے ۴/ جنوری ۱۹۴۱ء تک سنیہ گرہ ملتوی رہی۔

۱۹۴۱ء

اس سال انفرادی سیول نافرمانی کی تحریک بڑے شد و مد کے ساتھ سارے ملک میں جاری رہی۔ اور (۲۵) ہزار افراد گرفتار ہوئے اور ان کو چھ لاکھ روپیہ جرمانہ کیا گیا۔ ۳/ڈسمبر کو گرفتار شدگان کی رہائی کا فیصلہ ہوا۔ ۲۳/ڈسمبر کو ورکنگ کمیٹی کا اجلاس باردولی میں ہوا۔ گاندھی جی کی خواہش کے مطابق انہیں کانگریس کی قیادت سے سبکدوش کر دیا گیا۔ برما کے عوام کی ہمدردی میں ایک قرارداد منظور کی گئی جس پر حکومت نے امتناع عائد کر دیا اور یہ شائع نہ ہو سکی۔

۴۰۷

۱۹۴۲ء

جنوری میں کانگریس کمیٹی اور مجلس عاملہ کے اجلاس ہوئے۔ گاندھی جی نے مشروط طور پر قیادت پھر قبول کی۔ گاندھی جی اور چیانگ کائی شیک کے مابین ملاقات ہوئی۔ ۱۱/مارچ کو کرپس مشن کا اعلان کیا گیا۔ ۲۷/مارچ کو گاندھی کرپس ملاقات ہوئی۔ اس مشن کی تجاویز کو مختلف سیاسی جماعتوں نے مختلف وجوہات کی بنا پر رد کر دیا۔ ۸/اگسٹ کو بمبئی میں "ہندوستان چھوڑ دو" کی قرارداد کانگریسی کمیٹی کے اجلاس میں منظور ہوئی ۹/اگسٹ کی صبح ہونے سے پہلے گاندھی جی، مجلس عاملہ کے اراکین اور دوسرے ہزارہا کانگریسی گرفتار کر لئے گئے۔ کانگریسی کمیٹیوں کو خلاف قانون قرار دیا گیا۔ ۱۴/اگسٹ کو گاندھی جی نے وائسرائے کے نام ایک مراسلہ روانہ کیا۔ صوبہ بہار میں بم برسائے گئے مختلف مقامات میں فوجیں متعین کر دی گئیں۔ اللہ بخش وزیر اعظم سندھ کو ترک خطابات کی بنا پر معطل کر دیا گیا۔ جمہور کی سفاکیوں کے خلاف احتجاجاً پروفیسر بنسالی نے برت شروع کیا۔ ڈاکٹر یس۔ پی۔ مکرجی

وزارت سے مستعفی ہو گئے۔

سنہ ۱۹۴۳ء

۲/جنوری کو کل ہند صحافتی ہڑتال کی گئی۔ ۱۰/فروری کو گاندھی جی نے اکیس دن کا برت رکھا۔ حکومت کی جانب سے ایک پریس نوٹ شائع کیا گیا جس میں فسادات کی ساری ذمہ داری کانگریس کے سر تھوپی گئی۔ ایس۔پی۔موڈی، این آر سرکار اور یم۔یس۔ اینے گاندھی جی کے برت کے سوال پر وائسرائے کی انتظامی کونسل سے مستعفی ہو گئے۔ ۲۱/فروری کو گاندھی جی کی حالت نازک ہو گئی۔ ۳/مارچ کو برت پورا ہوا۔ سر تیج بہادر سپرو نے مفاہمت کی کوشش کی۔ غیر جماعتی قائدین نے مطالبہ کیا کہ ایک غیر جانبدار عدالت بٹھائی جائے۔ اور کانگریسی قائدین کو رہا کر دیا جائے۔ ۸/جون کو لارڈ ویول وائسرائے ہند مقرر ہوئے۔ کستور با گاندھی کو اختلاج قلب کے دورے پڑنے لگے۔ دارالامراء میں سوال اٹھائے جانے پر کستور بائی کو اپنے بیٹوں اور پوتوں سے ملنے کی اجازت دی گئی لیکن ان کو رہا کرنے سے حکومت نے انکار کر دیا۔

سنہ ۱۹۴۴ء

۲۲/فروری یوم شیوراتری کو کستور بائی گاندھی کا انتقال ہوا۔ ۶/اپریل کو سرکار نے اعلان کیا کہ گاندھی جی علیل ہیں۔ گاندھی جی کی رہائی کا عام طور پر مطالبہ کیا گیا ۶/مئی کو گاندھی جی رہا ہوئے۔ ۱۱/مئی کو گاندھی جی بمبئی پہنچے۔ گاندھی اور لنلتھگو کے مابین مراسلت شروع ہوئی۔ راجہ جی کی کانگریس لیگ مفاہمت کی تجویز پیش کی گئی۔ ۲۸/جولائی کو دارالعوام میں معاملات ہند پر پر زور بحث ہوئی۔ گاندھی

جناح مراسلت شائع کر دی گئی۔ کانگریس کے روپوش کارکنوں سے گاندھی جی نے اپیل کی کہ وہ اپنے آپ کو پولیس کے حوالے کر دیں۔ کستوربائی کی یادگار قائم کرنے کے لئے ڈیڑھ کروڑ روپیہ چندہ جمع کیا گیا۔

۱۹۴۵ء

مسٹر ایمری نے کانگریسی نیتاؤں کو رہا کرنے کے سوال پر غور کرنے سے انکار کر دیا۔ پی سی گھوش کو اطبا کے مشورہ سے رہا کر دیا گیا۔ اس درمیانی زمانے میں سیاسی سرگرمیاں تیز ہو گئی تھیں۔ ۲۱/مارچ کو ویول انگلستان گئے۔ چندماہ کے بعد واپس آئے اور آتے ہی جون میں شملہ کانفرنس ہوئی۔ اس کے بعد کانگریس پر سے امتناع اٹھا لیا گیا۔ شملہ کانفرنس کی ناکامی سے سبق حاصل کرتے ہوئے مولانا ابوالکلام آزاد نے ایک تجویز پیش کی کہ مسلمانوں کو ان کے حقوق کے تحفظ کا تیقن دیا جائے۔ جس پر کانگریس کی حکمت عملی تبدیل کرنیکا فیصلہ کیا گیا۔

۱۹۴۶ء

مارچ میں اٹیلی نے اعلان کیا کہ وزارتی وفد ہندوستان کی دستوری کشمکش کے فیصلہ کن اختتام کے لئے روانہ کیا جائے گا۔ یہ وفد ۲۳/مارچ کو ہندوستان آیا۔ مختلف مکاتیب سے تبادلہ خیال کرنے کے بعد تجاویز مرتب کیں۔ ۷/اگسٹ کو وائسرائے نے صدر کانگریس کو وزارت قائم کرنے کی دعوت دی۔ جسکی قبولیت کا اعلان ۱۲/اگسٹ کو کیا گیا۔ ۱۶/اگسٹ کو لیگ نے "راست اقدام" کیا۔ ۲/ستمبر کو کانگریسی حکومت قائم ہوئی۔ میرٹھ میں ۲۳/نومبر کو کانگریس کا اجلاس عام ہوا۔ جس کی صدارت آچاریہ جے بی کرپلانی نے کی۔

۱۹۴۷ء

۵/جنوری کو کانگریس کمیٹی کا اجلاس ہوا جس میں ۶/ڈسمبر کے حکومت برطانیہ کے بیان کو مان لیا گیا۔ ۲۰/فروری کو وزیر اعظم برطانیہ نے اعلان کیا کہ حکومت برطانیہ کا مقصد جون ۱۹۴۸ء کے اختتام تک ہندوستان کو ہندوستانی ہاتھوں میں دیدینا ہے۔ اس دوران میں اگر ملک کی مختلف سیاسی جماعتیں آپس میں کسی تصفیہ پر پہنچ نہ جائیں تو اقتدار صوبوں کو دے دیا جائے گا۔ ۲۲/فروری کو لاہور اور جالندھر میں فسادات کا آغاز ہوا۔ ۵/مارچ کو پنجاب کی حکومت کو گورنر نے اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ ۱۸/مئی کو لارڈ مونٹ بیٹن لندن کے لئے روانہ ہوئے تاکہ برطانیہ کی کابینہ سے ضروری بات چیت کریں۔ وہاں سے نئی تجاویز لے آئے ان تجاویز کو کانگریس اور لیگ نے منظور کرلیا۔ ۳/جون کو وائسرائے اور سیاسی قائدین نے آل انڈیا ریڈیو سے تقریریں کیں۔ ۱۴/جون کو آل انڈیا کانگریس کمیٹی نے برطانوی منصوبہ کو منظور کرلیا۔ ۱۴/اگسٹ کی رات بارہ بجے انتقال اقتدار کی رسم منائی گئی اور ۱۵/اگسٹ ۱۹۴۷ء کو ہندوستان کے طول وعرض میں یوم آزادی منایا گیا۔

۴۱۰
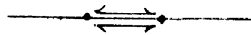
آزادی کے بعد حکومتِ ہند کے نمایاں کارنامے

(از)

مسٹر شاہد صدیقی (جائنٹ ایڈیٹر صبحِ دکن)

۱۵ - اگست سنہ ۱۹۴۹ء

ہندوستان کے سخت گیر اور انتہا پسند نقاد اکثر و بیشتر یہ کہتے ہوئے دیکھے جاتے ہیں کہ آزادی حاصل کرنے کے بعد ہماری حکومت نے، ملک کے اہم مسائل کو حل کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی، اس سلسلے میں زیادہ افسوس اس وقت ہوتا ہے جب ہم دیکھتے ہیں کہ شکایت کرنے والوں اور اعتراض کرنے والوں کی اسی فہرست میں بیرونی مکاتب خیال اور دوسری حکومتوں کے ایجنٹ ہی شامل نہیں ہیں، بلکہ وہ لوگ بھی ہیں جو اپنے آپ کو خالص ہندوستانی کہتے ہیں، اور محب وطن ہونیکا دعویٰ کرتے ہیں، بلا شبہ تنقید بہت اچھی چیز ہے، اور ایک جمہوری حکومت کے سائے میں ہر شخص کو یہ آزادی حاصل ہے کہ اپنی رائے کا اظہار کرے، لیکن اس آزادی کے ساتھ کچھ پابندیاں بھی لازمی ہیں، یہ پابندیاں حکومت کی جانب سے بہت کم اور خود انسانی ضمیر اور صداقت پسندی کے جذبہ کی طرف سے زیادہ عائد ہوتی ہیں، ہمیں تنقید کرنے سے پہلے اپنے نفس سے یہ سوال لازماً پوچھنا چاہیئے کہ جو کچھ ہم کہہ رہے ہیں وہ کہاں تک صحیح ہے، اور حقائق و واقعات کس حد تک اس کا ساتھ دیتے ہیں یہ کہنا کہ آزاد ہندوستان کی حکومت نے اتنک کچھ نہیں کیا اور اس کے ارکان پر غفلت و جمود کی کیفیت طاری رہتی، فطری طور پر غلط ہے، ذرا اس حکومت کی طرف نگاہ اٹھایئے، جو آج پورے ہندوستان کا نظم و نسق سنبھالے ہوئے ہے،

اس میں شری راجگوپال اچاری ہیں، پنڈت جواہر لال نہرو ہیں، سردار پٹیل ہیں، اور مولانا ابوالکلام آزاد وغیرہ ہیں، یہ لوگ آج عہدہ دار بنے ہیں، انہیں آج حکومت کی کرسیاں ملی ہیں لیکن کل تک یہ سب جنگ آزادی کے سپاہی تھے، برطانوی سامراج کے کٹر مخالف تھے، ان کی زندگیوں کا ایک قابل لحاظ حصہ جیل خانوں میں گزر گیا انھوں نے سامراجی پولیس کے مظالم برداشت کئے، اور زندگی کی ساری مسرتوں کو حصول آزادی کی جدوجہد پر قربان کردیا۔ کون کہہ سکتا ہے کہ ایسے لوگ منزل مقصود پر پہونچ جانے کے بعد "گمراہ" ہو سکتے ہیں، ایسا کہنے کے معنی یہ ہونگے کہ معترضین کے نزدیک سورج اپنی روشنی کھو سکتا ہے، دریا اپنی روانی ترک کر سکتی ہے، اور ہوا اپنی رفتار سے دست بردار ہو سکتی ہے۔ انھوں نے تو آزادی کی لڑائی اسی لئے لڑی تھی کہ انگریزوں کو اپنے وطن سے نکال کر خود اس کی خدمت کریں۔ ان کا بنیادی نقطہ نظر یہی تھا کہ اجنبی حکومت ہندوستان کی تعمیر کے لئے اور ترقی کے لئے کچھ نہیں کر رہی ہے، اس لئے ہندوستان پر ایک اپنی حکومت کو کارفرمائی کا موقعہ ملنا چاہئے ایسے لوگوں کی نسبت یہ کہنا کہ وہ حصول آزادی کے ساتھ ہی غافل وبے پروا ہو گئے انسانی فطرت سے ناواقفیت کا ثبوت ہے!

واقعہ یہ ہے کہ اگر ضد اور ہٹ دھرمی سے کام نہ لیا جائے، اور سچے کو ظاہر کرنے کا سچا جذبہ کام کرنے لگے تو کوئی ایماندار آدمی یہ نہیں کہہ سکتا کہ ۱۵ اگسٹ کے بعد سے ہماری حکومت نے ہندوستان کے لئے کوئی نمایاں کام نہیں کیا، اس مختصر سے مضمون میں ان تمام خدمات کا مکمل جائزہ لینا تقریباً ناممکن ہے جو

ہندوستان کی حکومت اس وقت تک انجام دے چکی ہے، پھر بھی کوشش کیجائے گی کہ کچھ ایسے اشارے کر دئے جائیں جن کی وجہ سے حکومت کے نمایاں اور اہم کارنامے اجاگر ہو سکیں اور ایک سچائی چاہنے والے کے سامنے ایسا نقشہ آجائے جسکے ذریعہ سے وہ حکومت کی سرگرمیوں سے واقف ہو سکے!

۴۱۴

یوم آزادی (۱۵/اگست ۱۹۴۸ء) کو ہمارے وزیراعظم پنڈت جواہرلال نہرو نے فرمایا تھا کہ

"ہم اس دن کو اس طرح منا رہے ہیں جس طرح اسے منانا چاہئے، مگر ہماری یہ تقریب شیخی اور فرسودہ نمائش کا رنگ لے نہیں سکتی، اس دن ہمیں اپنے ضمیروں کو ٹٹولنا چاہئے، اور از سر نو اپنے مقاصد کے حصول کے لئے اپنے آپ کو وقف کر دینا چاہئے، ہمیں یہ خیال نہیں کرنا چاہئے کہ ہم نے کیا کیا ہے بلکہ یہ سوچنا چاہئے کہ ہم نے کیا کچھ نہیں کیا، ہمیں ہندوستان کے ان وسیع ذرائع کا بھی خیال کرنا چاہئے جن سے اگر صحیح طریقہ پر کام لیا جائے تو ہندوستان کا نقشہ ہی بدل جائے گا اگر ہم نے مہاتما گاندھی کے سکھائے ہوئے سبق کو فراموش کر دیا تو ہم اپنے نصب العین اور اپنے ملک سے غداری کریں گے!"

اب ہمیں دیکھنا یہ ہے کہ ہماری حکومت نے اپنے وزیراعظم کے الفاظ کا کہاں تک پاس رکھا، اور گاندھی جی کے سکھائے ہوئے سبق پر کس طرح عمل کیا، حقیقت یہ ہے کہ اس معاملہ میں حکومت کو اور اس کے ارکان کو شرمندہ ہونے کی

کوئی ضرورت نہیں، ایک دیانتدار اور غیر جانبدار نقاد یہ کہنے پر مجبور ہے کہ حکومت سے جو کچھ ہوسکتا تھا وہ کرتی رہی، اس کے ارکان نے (انسانی غلطیوں کو نظر انداز کرتے ہوئے) کامل خلوص کے ساتھ کام کیا، اور خدمت وطن کا یہ سلسلہ اب تک جاری ہے!

بین الاقوامی معاملات میں ہندوستان نے ایک ایسا نقطہ نظر، اور ایک ایسا طریقہ کار اختیار کیا، جو اس کی اعلیٰ تہذیبی روایات کے شایان شان تھا، بدقسمتی سے جس وقت ہندوستان کو آزادی ملی اس وقت بین الاقوامی مسائل بڑے پیچیدہ تھے، مختلف قوموں اور ملکوں کے دلوں پر دوسری جنگ عظیم کا غبار چھایا ہوا تھا، وہ ایک دوسرے سے مشتبہ تھے، اور ان کے تعلقات ایک سیال حیثیت میں تھے ایسے عالم میں ہندوستان کے لئے تمام ممالک سے دوستانہ تعلقات قائم کرنا کافی احتیاط اور ہوشیاری کا طالب تھا لیکن اس نے آزادی کے پہلے ہی سال میں بہت سے ممالک سے سفارتی تعلقات قائم کرلئے، اور انڈین فارن سروس کی بھی از سر نو تنظیم کرلی گئی جہاں تک ہند اور پاکستان کے مسائل کا تعلق ہندوستان نے ہر ہر قدم پر دور اندیشی اور دانائی کا ثبوت دیا، کشمیر کے مسئلہ نے بڑی نزاکت اختیار کرلی تھی، لیکن آج اس کا اعتراف سب ہی کررہے ہیں کہ ہندوستان نے کشمیر کے معاملے میں بڑی فراست سے کام لیا۔ توقع ہے کہ اسکے مدبرین آئندہ بھی اس اہم اور نازک مسئلہ کو پیچیدہ ہونے سے بچائیں گے!

جنوبی افریقہ کے ہندوستانیوں کے مسئلہ میں بھی ہند سرکار نے ضروری اور مناسب دلچسپی لی جس کی وجہ سے عام طور پر یقین کیا جاتا ہے کہ حالات خوشگوار

انداز میں بدل جائیں گے اسی طرح سیلون، برما، اور ملایا کے ہندوستانیوں کی مشکلات کو رفع کرنے کے سلسلے میں حکومت ہند نے اپنا پورا زور صرف کیا، سیلون میں ہندوستانیوں کے درجہ کی نسبت دونوں حکومتوں کا نقطہ نظر دوستانہ رہا برما میں رہنے والے ہندوستانیوں کے تعلق سے شہریت کا مسئلہ زمین کے متعلق قانون بنانے کی پالیسی کا مسئلہ اور ترک وطن کا مسئلہ بہت اہم تھا چنانچہ ہماری حکومت نے اس معاملے میں بہ طور خاص دلچسپی لی، اسی طرح ملایا میں ہندوستانی زمینداروں اور بنکوں کو بغیر اثرات سے بچانے کی کوشش کی گئی یہ حکومت ہند ہی کا فیض تھا کہ مشرقی افریقہ کے ایک علاقے کینیا میں ہندوستانی مسلمانوں کیلئے نشستوں کی تخصیص کے ساتھ مشترکہ انتخابات رائج کرنے کا فیصلہ کیا گیا، فرانسیسی ہند کا ایک علاقہ چندرنگر آج ہندوستانی پرچم کے تحت آچکا ہے، اور توقع ہے کہ ہند سرکار کے لگاؤ کی بدولت دوسرے علاقے بھی اسی پوزیشن میں آجائیں گے!

ہندوستان متحدہ اقوام کا ایک ممبر ہے، اور اس ادارے کے کاموں میں پوری سرگرمی سے حصہ لیتا رہا ہے، اس نے انڈونیشیا کے بارے میں ایک موثر قدم اٹھایا اس طرح دکھن پوربی ایشیا میں امن و آزادی کی بحالی کیلئے اپنا فرض ادا کیا ہندوستان ہی تھا جس نے متحدہ اقوام کے باہمی تعاون پر زور دیا، اسلئے کہ ہندوستان کے خیال میں اسی طرح تمام دنیا میں اور خاص کر ایشیا اور افریقہ کی پسماندہ قوتوں میں ایک نئی زندگی پیدا ہوسکتی ہے!

جو لوگ ادارہ اقوام متحدہ کی کارروائیوں سے واقف ہیں وہ اس حقیقت کو تسلیم کرنے پر مجبور ہیں کہ ہند نے ہر بڑے اور اہم مسئلہ پر آزادانہ اور منصفانہ

رویہ اختیار کیا، مثال کے طور پر فلسطین اور یونان کے مسائل کو پیش کیا جاسکتا ہے ان مسائل میں ہندوستان نے دوسرے ممالک کی مخالفت مول لیکر حق و صداقت کیلئے راہ دی غرضکہ ہندوستان ہر معاملے میں سچائی کا ساتھ دیتا رہا اور کسی وقت بھی اپنے ضمیر کے خلاف کسی قوت کا آلہ کار نہیں بنا' یہ ہندوستان کی ایک ایسی عظمت ہے' جسے کوئی آسانی سے فراموش نہیں کرسکتا!

ہندوستانی حکومت جس طرح شرنارتھیوں کے معاملات کو طے کرتی رہی اور آج تک رہی ہے' اس کی مثال پیش نہیں کی جاسکتی، ایک اندازے کے مطابق صرف پچھمی پاکستان سے (۵۵) لاکھ شرنارتھی ہندوستان آئے' اتنی بڑی تعداد کو نکال لانا، ان کی سکونت کا انتظام کرنا' اور انہیں تمام ضروری امداد دینا کوئی آسان کام نہ تھا، حقیقت یہ ہے کہ اتنا بڑا بوجھ دنیا کی مضبوط ترین حکومت بھی نہیں اٹھاسکتی تھی' لیکن یہ ہندوستانی حکومت کا خلوص اور جذبہ خدمت تھا جس نے' حالات کو سنبھال لیا اس دنیا پہ فتح پانے کیلئے' حکومت نے ریل سڑک' اور ہوائی راستوں کے ذریعہ مصیبت زدوں کو نکالا' اس نے اپنی فوجوں کو متحرک کردیا' اور وہ شرنارتھیوں کو بچانے میں مصروف ہوگئیں پوربی پنجاب میں اور دوسرے مقامات پر کیمپ کھولے گئے' ہر کیمپ میں پانچ ہزار سے لیکر پچاس ہزار تک شرنارتھی تھے، کوروکشیتر کے تاریخی مقام پر دنیا بھر میں سب سے بڑا شرنارتھی کیمپ کھولا گیا جس میں ایک وقت تیس لاکھ سے زیادہ شرنارتھی مقیم تھے' ان کیمپوں میں شرنارتھیوں کو رہنے کی جگہ کے علاوہ' خوراک کپڑا' دوائیں' صابن دیاسلائی' مفت تقسیم کی گئی' پھر شرنارتھیوں کی علٰحدہ علٰحدہ مقامات پر تقسیم کا انتظام کیا گیا'

ان کے لئے فائدہ بخش روزگار فراہم کئے گئے، مکانات بنائے گئے، صوبوں اور ریاستوں میں انہیں آباد کیا گیا۔ لاوارث بچوں کو تعلیمی وظائف دئے گئے تربیتی مراکز قائم کئے گئے، قرض کے طور پر ان کی مدد کی گئی، انہیں ملازمتیں دی گئیں، الغرض وہ سب کیا گیا جو حکومت کر سکتی تھی اور کوئی ایماندار آدمی اس معاملے میں حکومت کی خدمتوں کو اور سرگرمیوں کو جھٹلا نہیں سکتا۔ کوئی آزاد ملک اس وقت تک خوشحال نہیں ہو سکتا جب تک کہ اس کی صنعتی بنیادیں مستحکم نہ ہوں حکومت ہند ابتدا ہی میں اس نکتہ کو سمجھ گئی تھی کہ سیاسی آزادی کو اقتصادی بہتری کا ذریعہ بنائے بغیر کوئی چارہ نہیں، بدقسمتی سے ہندوستان نے ایسے وقت آزادی حاصل کی جب کہ ساری دنیا صنعتی بحران کا شکار تھی، صنعتی پیداوار میں ایک قسم کی جبری کمی ہو چکی تھی، آدمی اور مشینیں بیکار ہو گئی تھیں، ہندوستان بھی اس صورت سے مستثنیٰ نہ تھا۔ اس کے یہاں بھی قومی پیداوار کے تمام شعبے کمی سے متاثر تھے، حکومت ہند نے پہلے تو اس صورت حال کے حقیقی اسباب معلوم کئے، اس کے بعد ان کے تدارک کی جانب ہاتھ بڑھایا۔ اس نے فوری ایک صنعتی کانفرنس بلائی اور بحران کا مقابلہ کرنے کی خاطر یہ ضروری سمجھا کہ افراط زر کی فوری روک تھام کی جائے، اس کانفرنس نے فیصلہ کیا کہ حکومت کو بلا تاخیر پیداوار بڑھانے کے وسائل اختیار کرنے چاہئیں، بعد از جنگ صنعتی اسکیموں کو پورا کرنے کے لئے یہ بھی ضروری تھا کہ کارخانوں سے پورا پورا کام لیا جائے اور مزدوروں کی بےچینی دور کی جائے، بہرحال کانفرنس نے جو فیصلے کئے ان کے مطابق (۳۲) صنعتوں میں اضافہ کرنے کی تدبیریں وضع کی گئیں اور فولاد، پارچہ بافی، سیمنٹ، کاغذ، ادویات، اوزار،

موٹروں کی بیٹریاں، اور دوسری صنعتوں کو ترقی دینے کے منصوبے سوچے گئے،
اس طرح یہ توقع کی جاسکتی ہے کہ ہندوستان، آئندہ جہاز سازی، موٹر سازی،
سائیکل سازی کے علاوہ لنس بنانے، بجلی کا سامان تیار کرنے، ٹیلیفون کے
اجزا وغیرہ بنانے میں بہت زیادہ ترقی کرسکے گا اس لئے کہ اس غرض کے لئے جن
بنیادی منصوبوں کی ضرورت تھی وہ طے کئے جاچکے ہیں اور روبہ عمل لائے جاچکے ہیں!
اس سلسلے میں سب سے زیادہ حوصلہ افزا بات یہ ہے کہ صنعتی پالیسی کے متعلق
ہماری پارلیمنٹ نے جو قرارداد منظور کی ہے، اس کی رو سے عوام کی اقتصادی
خوشحالی کو حکومت کی ذمہ داری کے تحت لے آیا گیا ہے، اس طرح یہ بات طے
ہوگئی ہے کہ حکومت ملک کی معاشی زندگی کو بہتر بنانے کے لئے لازمی طور پر صنعتوں
کو ترقی دے گی، اور اپنے اس فرض سے کبھی غفلت نہ برتے گی!

ہماری حکومت اقتدار حاصل کرنے کے بعد تعلیم جیسے اہم اور بنیادی مسئلہ سے
بھی غافل نہیں رہی، اور گو ابتداءً حالات حد درجہ اندوہناک تھے، لیکن اس نے
اپنی سرگرمیاں برابر جاری رکھیں، ظاہر ہے کہ آزادی کے بعد ہم پرانے نظام
تعلیم کو جسے بیرونی حکومت نے اپنی مصلحتوں کے تحت جاری رکھا تھا، باقی نہیں
رکھ سکتے، اس میں مناسب تبدیلیاں ضروری ہیں، چنانچہ اس مقصد کیلئے آل انڈیا
ایجوکیشنل کانفرنس، اور مشاورتی بورڈ دونوں نے بڑی جدوجہد سے کام لیا، تعلیمی
پروگرام طے کیا گیا، عام پالیسی مرتب کی گئی، اور تجاویز طے ہوئیں، اس مسئلہ پر غور
کرتے ہوئے ہم حکومت ہند کی اس دور اندیشی کا اعتراف کئے بغیر نہیں رہ سکتے،
کہ اس نے ہندوستان کے مشہور فلاسفر ڈاکٹر رادھا کرشنن کی صدارت میں ایک ایسا

بورڈ تشکیل دیا جو فلسفہ کی تاریخ تیار کرے گا، انڈین ہسٹری کانگریس اور بہارتیہ

اتہاس پرشد، کی سرگرمیوں میں ربط قائم کرنے کی جو تدبیریں کی گئی وہ بھی نتیجہ

کے لحاظ سے قابل ستائش کہی جاسکتی ہیں، حکومت اساتذہ کی تربیت پر کافی زور

دے رہی ہے، اور ایک مرکزی ادارے کے ذریعہ بہترین اساتذہ تیار کرنے کی

کوشش میں مصروف ہے، اندھوں کی تعلیم کے لئے وزارت تعلیم نے ایک علاحدہ شعبہ

قائم کیا ہے، غیر ممالک کے تعلیمی اور تمدنی تعلقات قائم کئے جارہے ہیں ناخواندگی

کی مہم کو دور کرنے کی خاطر کوشش کی جارہی ہے کہ سارجنٹ پلان کی مدت کو

(۴۰) سال کی بجائے (۸) سال کردیا جائے اور اس طرح فوری فوائد حاصل کئے

جائیں تعلیم بالغان کی مہم کے ذریعہ ارادہ کیا گیا ہے کہ بہت جلد کم از کم ہندوستان

کی نصف آبادی لکھنے پڑھنے کے قابل ہو جائے گی بنیادی تعلیم کی جانب بھی حکومت

پوری توجہ صرف کررہی ہے، سماجی تعلیم کی ضرورت بھی اس نے اچھی طرح محسوس کرلی

ہے اور اس ضرورت کو پورا کرنے کے لئے دوسرے ذرائع کے علاوہ ریڈیو سے بھی

کام لیا جارہا ہے، ثانوی تعلیم اور یونیورسٹی کی تعلیم کی اہمیت کو بھی حکومت نے نظر انداز

نہیں کیا علاوہ بریں رسم الخط کا مسئلہ زبان کا مسئلہ، سائنسی اصلاحات کا مسئلہ،

اثنی بات کا مسئلہ، امتحانات کا مسئلہ، ٹکنیکل تعلیم کا مسئلہ، اور ایسے ہی دوسرے اہم

مسائل حکومت کے زیر غور ہیں ان میں سے اکثر کی نسبت کام شروع کردیا گیا ہے

اور اچھے نتائج حاصل ہونے لگے ہیں!

جس وقت انگریزوں نے ہندوستان چھوڑا جہاں خوراک کا مسئلہ نہایت

ہی نزاکت اختیار کرلیا تھا، اور پھر شرنارتھیوں کی وجہ سے جو دقتیں پیدا ہوئیں انہیں

دیکھتے ہوئے تو یہ خیال پیدا ہونے لگا تھا کہ شائد خوراک کا سسٹم ٹوٹ جائے، اس دوران میں ۱۰/ دسمبر ۱۹۴۷ء کو دہلی میں جسے ہندوستان کا دل کہنا چاہیے صرف دو روز کی خوراک باقی رہ گئی تھی، لیکن حکومت کے خلوص نے اس انتہائی پریشان کن صورت حال کا اچھی طرح مقابلہ کیا اور عوام کو یہ بعد میں معلوم ہوا کہ وہ فاقہ کشی کی کس مصیبت سے بچ نکلے ہیں حکومت نے سب سے پہلے غذائی اجناس پر مختلف کنٹرولوں کو بتدریج ختم کرنے کی پالیسی پر غور کیا، یہ کنٹرول جنگ کی یادگار تھے اور ملک میں اس "چیز" کے خلاف ایک ذہنیت پیدا ہوچکی تھی، مرکزی وزارت خوراک نے نہایت دانشمندی سے کام لیکر اور محتاط منصوبہ بندی کے ذریعہ سے ملک کو غذائی محاذ پر تباہ ہونے سے بچالیا، اس کے ساتھ ہی اس نے کوشش کی کہ غیر ممالک سے درآمد اور صوبائی حکومتوں کے پاس اناج کے ذخیروں کے بارے میں اناج کی سپلائی کی پوزیشن کو بہتر بنائے، تیسری بات جس کی طرف مرکزی وزارت خوراک نے توجہ کی یہ تھی کہ ہندوستان نے اناج کا ایک ذخیرہ پہلی بار قائم کیا حکومت کی ان سرگرمیوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ آج بھی ملک میں غذائی قلت کے آثار موجود ہیں، لیکن یہ اندیشہ نہیں کیا جاسکتا کہ کسی وقت حالات ناقابل برداشت ہوسکتے ہیں، حکومت کے پاس ایسے انتظامات ہیں اور ایسی تدبیریں ہیں جن سے کام لیکر وہ ہندوستانیوں کو "بھوک" کی شدت سے بچاسکتی ہے!

اس سائنسی زمانے میں کوئی ملک سائنسی تحقیقات سے بے نیاز نہیں رہ سکتا، حکومت ہند نے سب سے پہلے یہ ضروری سمجھا کہ سائنس اور صنعت کے درمیان رابطہ قائم کیا جائے، اس غرض سے اس نے لبارٹریاں قائم کیں، جوہری

قوت کی تحقیق کے سلسلے میں ایک بورڈ مقرر کیا، مصنوعی ریشم کی تیاری کے متعلق کئی معلومات فراہم کیں، اور اسی قسم کے دوسرے اقدام کئے جن کے تحت ہندوستان سائنسی نقطۂ نظر سے کافی ترقی کر سکتا ہے، اور یہ ترقی اس کی صنعتوں کو مدد دے سکتی ہے!

ہندوستانی کسان کے لئے زیادہ سے زیادہ آسانیاں پیدا کرنے کی خاطر ہند سرکار کا محکمہ موسمیات پوری طرح متوجہ ہے، اسے موسم کی تبدیلیوں سے واقف کرانے کے نئے نئے طریقے اختیار کئے گئے ہیں، اور کاشتکار کو توہمات کے پھندوں سے بچا کر "عقلی" میدان میں لایا جا رہا ہے، حکومت نے مصنوعی بارش کے امکانات پر بھی نظر ڈالی ہے، سورج کی حرکت، اور زمین کی سطح کے نیچے ارضی حرکت کا جائزہ لینے کیلئے مختلف قسم کی (۳۱۵) تجربہ گاہیں قائم کی گئی ہیں، کئی مقناطیسی رصدگاہوں کا قیام عمل میں لایا گیا ہے۔ محکمہ موسمیات کی جانب سے ہمالیہ کی بلندیوں پر فلکی شعاعوں، برف کی نقل و حرکت، حیاتیات جرثومی اور طبعیات النجوم کے مطالعہ کیلئے ایک رصدگاہ قائم کی ہے، جو اپنی افادی اہمیت کے لحاظ سے نہایت بلند درجہ رکھتی ہے!

حکومت نے تقسیم کے بعد رسل و رسائل کی از سر نو تنظیم کی، ریلوں کو زیادہ کارکرد بنایا، نقل و حمل کے انتظامات میں متعدد مفید اصلاحیں کیں اپنے تجارتی بحری بیڑے کی توسیع و ترقی پر زور دیا، اسی طرح وزارت قانون نے بھی انتھک محنت کے ذریعہ اپنا فرض پورا کیا، اور وزارت صحت نے تو ایسے کارنامے انجام دئے، جنکی تفصیلات ہر محب وطن کیلئے حوصلہ افزا ہیں، دراصل ہندوستان صحت کے اعتبار سے

ایک پسماندہ ملک ہے، یہاں بیماریوں کی کثرت ہے، اور لوگوں کے چہرے مرجھائے ہوئے ہیں، اور خوشی کی بات ہے کہ ہند سرکار کا محکمۂ متعلقہ اس خصوص میں اپنا فرض پوری دیانت داری کے ساتھ ادا کر رہا ہے حکومت ہندوستان کی کسی ترقی کی جانب سے غافل نہیں ہے، وہ اسے ایک شاندار اور قابل فخر ملک بنا دینے کا سچا جذبہ رکھتی ہے، اس نے ترقی کی اسکیموں کی داغ بیل ڈال دی ہے، آبی قوت کے استعمال اور دریائی وادیوں کی ترقی کے منصوبے طے کر لئے ہیں، اس کے ساتھ ہی وہ ہندوستانی تجارت کو ایک بلند معیار پر پہونچا دینا چاہتی ہے اس مقصد کی خاطر بین الاقوامی تعلقات قائم کئے جا چکے ہیں اور مشرق و مغرب کے تقریباً ہر قابل ذکر ملک سے ہندوستان اپنے تجارتی روابط رکھنا چاہتا ہے، ہماری حکومت زرعی ترقی پر بھی ضروری توجہ دے رہی ہے، جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ آزادی کے پہلے ہی سال اس نے پیداوار کو دس لاکھ ٹن تک بڑھا دیا، زرعی ترقی کے لئے سوچی سمجھی تدبیروں پر عمل کیا جا رہا ہے، کسانوں کو خوشحال بنانے کی جد و جہد جاری ہے، اس کے ساتھ ہی مزدوروں کی فلاح بھی اسکے پیش نظر ہے، وہ ان کا معیار زندگی بڑھانا چاہتی ہے، اور اپنے اس نیک مقصد میں روز بروز کامیاب ہو رہی ہے، اس نے بیروزگاری کو دور کرنے کیلئے ایک ادارہ قائم کر رکھا ہے، جو اپنی شاندار خدمات کے ذریعہ بے وسیلہ لوگوں کو روزگار دلاتا ہے، اپنی تمدنی، سماجی، اور دوسری ضرورتیں پوری کرنے کے لئے حکومت ہند نے براڈ کاسٹنگ میں بہت توسیع کر دی ہے، متعدد اسٹیشن قائم کئے گئے ہیں، جو ملک کی زندگی کو بہتر اور ترقی یافتہ بنانے

بنانے کے لئے مسلسل کام کر رہے ہیں، براڈ کاسٹنگ کے ذکر کے ساتھ ہوابازی کی ترقی کا تذکرہ بھی بے موقع نہیں سمجھا جانا چاہیئے' آج ہندوستان اس نقطۂ نظر سے بہت ترقی یافتہ ہے اور اس نے تمام ملکوں سے ہوائی ربط قائم کر لیا ہے' !

آزادی کے بعد حکومت ہند کے نمایاں کاموں کا یہ جائزہ ہرگز مکمل نہیں کہا جا سکتا' اس لئے کہ اس میں صرف اشاروں سے کام لیا جا رہا ہے اور نہ کسی حکومت کے کارنامے گنانا تفصیل چاہتا ہے' پھر بھی ہمیں یقین ہے کہ اس تصویر کے ذریعہ حکومت کے منصوبوں' ارادوں' اور حوصلوں کے پورے خدوخال سامنے آ سکتے ہیں' اور یہ خیال پختہ ہو سکتا ہے کہ ہندوستانی فلاح و بہبود کے کسی میدان میں بھی ہند سرکار کی طرف سے سست گامی کا اظہار نہیں ہوا' اس نے مختصر سی مدت میں بے شمار مشکلات کے باوجود بہت کچھ کیا ہے۔ اور اس کی امنگوں پر نظر رکھتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ وہ آئندہ بھی بہت کچھ کر سکتی ہے !

مہا ہند

آزادیٔ ہند کی دوسری سالگرہ کا علمی پیشکش

ہندوستان کے چند قدیم آثار کے قلمی خاکے

ان تصاویر کے اولاً قلمی خاکے تیار کرائے گئے

پھر فوٹو لئے گئے اور لائین بلاکس بنوائے گئے

۱۵- اگست سنہ ۱۹۴۹ء

* فضائی سفر سے دنوں کی مسافت گھنٹوں میں طے ہوتی ہے۔
* فضائی سفر دل کو راحت اور دماغ کو حقیقی سکون پہنچاتا ہے۔
* سفر کے مواقع پر ہمیشہ فضائی پرواز کو ترجیح دیجئے ایک تو وقت بچتا ہے۔ دوسرے تفریح ہوتی ہے۔ تیسرے زندگی کے قیمتی لمحات ضائع نہیں ہوتے۔
* فضائی سفر کے جو لوگ عادی ہوتے ہیں وہ اپنا بہت سا وقت بچا لیتے ہیں۔ اس طرح اُن کی عمر بڑھ جاتی ہے۔
* ہوائی جہاز کی سواری انتہائی آرام دہ۔ سبک۔ بے خطر اور محفوظ ہوتی ہے۔ اس میں سفر کرنے والا کبھی تھکاوٹ محسوس نہیں کرتا، ہمیشہ تازہ دم رہتا ہے۔

جاری کردہ:

دی دکن ایرویز محدود
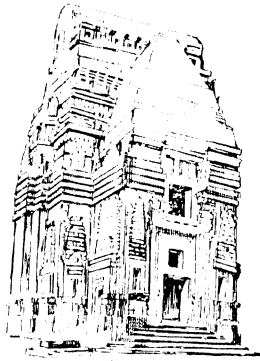
تیلی کا مندر (قلعہ گوالیار)
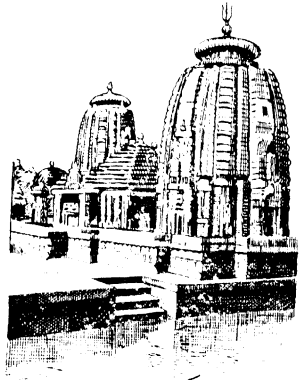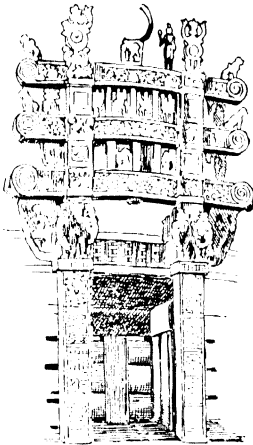
مندر مکتیشور (بھبنیشور)

سانچی کے استوپا کا داخل ہونیکا دروازہ

مندر ہزار ستون مدورا کے سبرامانیہ کا مجسمہ

مینار فتح چتوڑ
تعمیر کردہ رانا کنبھ در سنہ ۱۴۴۲ء
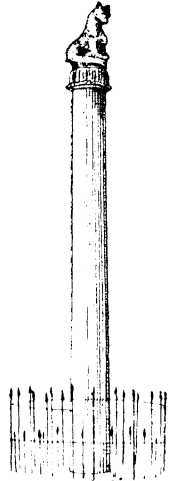
اشوک کی لاٹ

مندر وشنو (سری رنگم)
کا ایک ستون

آبو کے مندر کا ایک ستون

سفید سنگ مرمر کا کٹہرا اور شاہ جہان اور نور جہان کی قبریں

لال قلعہ دہلی

دیوانِ خاص میں شاہی نشست

قلعہ تغلق آباد

قطب مینار

سینٹ جارج گرجا (مدراس)

مثمن برج قلعہ آگرہ

تاج محل

لکھنو کے امام باڑہ بزرگ کی جامع مسجد

مکہ مسجد (حیدر آباد دکن)
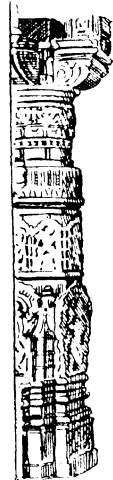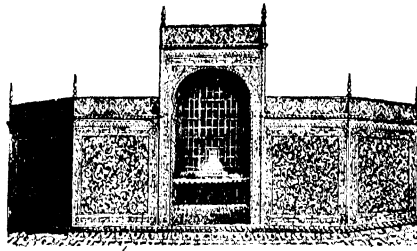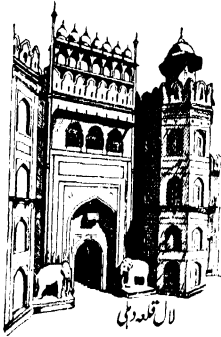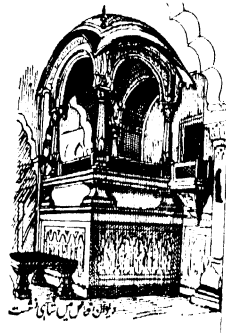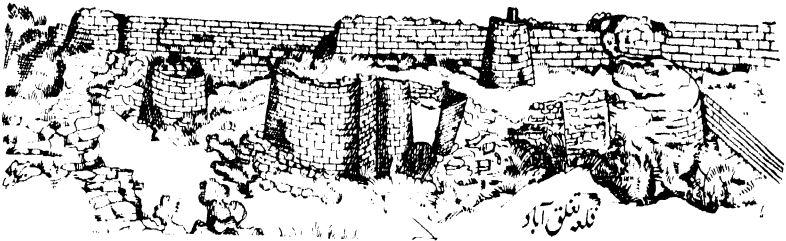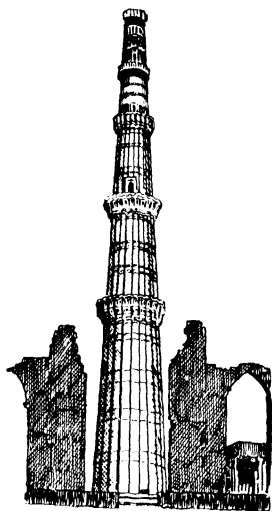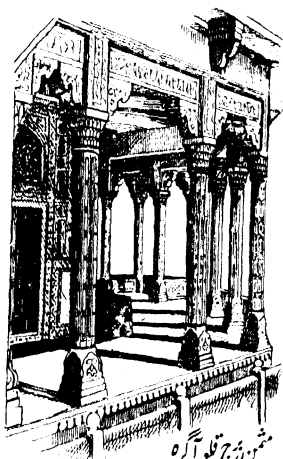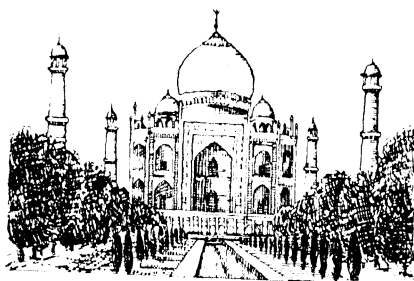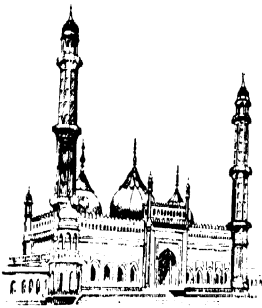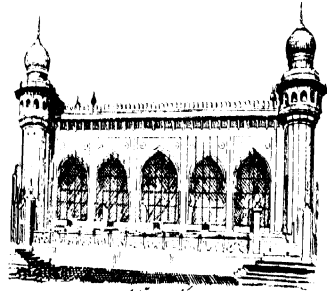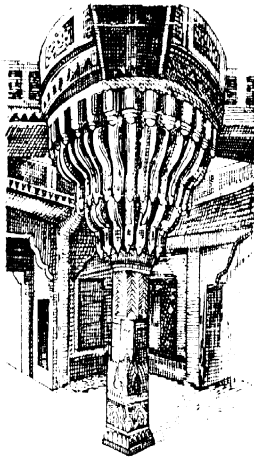
فتح پور سیکری کے دیوان خاص کا ایک ستون
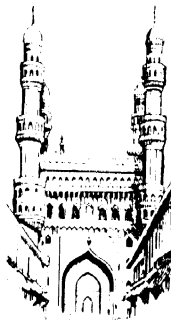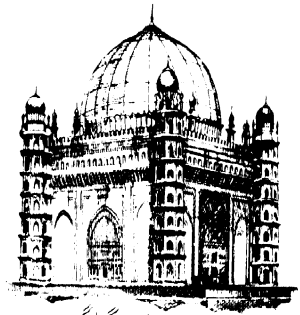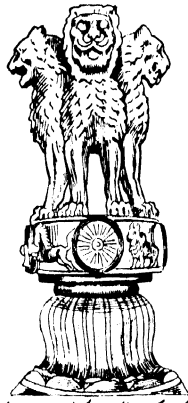
حیدر آباد کا چار مینار

بیجاپور کا شہرۂ آفاق گول گنبد

اشوک کی لاٹھ کا اوپر کا حصہ (سارناتھ)

سانچی کے مندر کا دروازہ

مینار فیروز شاہ ۱۳۸۸ء

غار ایلورا نمبر ۱۱

راجہ جے سنگھ والی جے پور کی تعمیر کردہ رصدگاہ واقع دہلی (۱۷۲۵ء)

گولڈن ٹمپل امرتسر

بھیم کا رتھ

مندر سندریشور اور میناکشی واقع مدورا

راجہ رانی مندر (بھبنیشور)
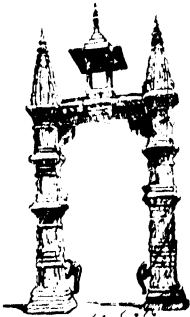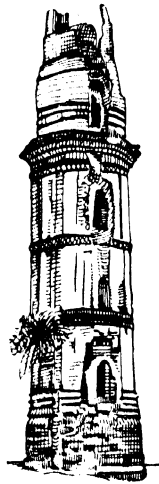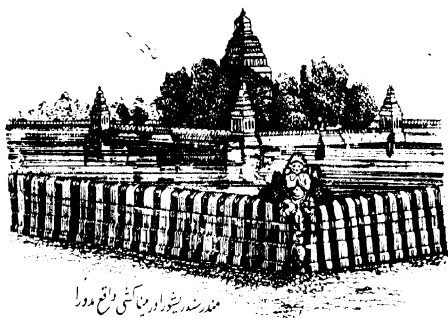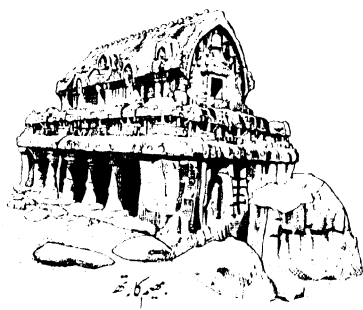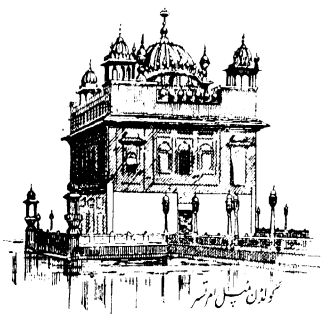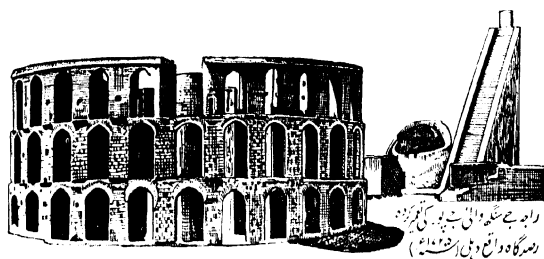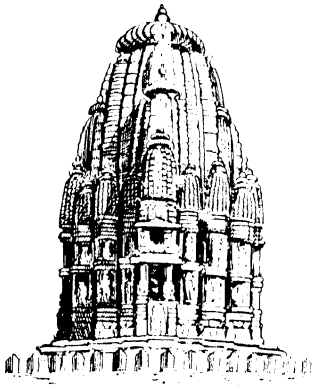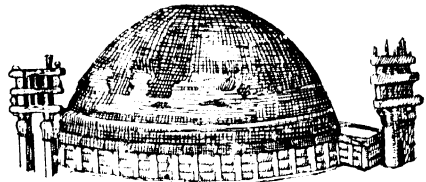
سانچی کا بڑا استوپا

مندر ہزار ستون
مدورا کا ایک ستون

سانچی کے استوپا کے
در داخلہ کا ایک ستون

مندر سری دیوراجہ کی ایک برجی (کانجی ورم)

مہا ہند

آزادیٔ ہند کی دوسری سالگرہ کا علمی پیشکش

ہندوستان کے چند قدیم آثار کے قلمی خاکے

ان تصاویر کے اولاً قلمی خاکے تیار کرائے گئے

پھر فوٹو لئے گئے اور لائین بلاکس بنوائے گئے

۱۵- اگست سنہ ۱۹۴۹ء
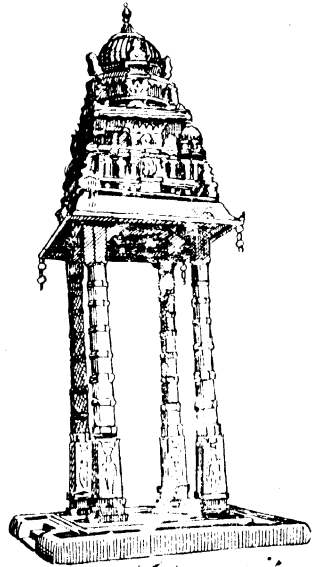
محل وقوع کے اعتبار سے ناندیڑ کا ریلوے اسٹیشن حیدرآباد سے ۳۰۲ میل، اورنگ آباد لائن پر واقع ہے۔ سکھوں کا گردوارہ ہونے کی وجہ سے اس مقام کو شہرت حاصل ہے۔ گردوارے کی زیارت کے لئے ہندوستان کے اکثر مقامات سے یہاں لوگوں کی آمد و رفت رہا کرتی ہے۔

لاہور سے ۳۰ میل کے فاصلے پر ایک مقام تال ونڈی واقع ہے، جہاں ۱۴۶۹ء میں سکھ مذہب کے بانی گرونانک پیدا ہوئے تھے۔ وہ ذات کے کھتری تھے۔ راجہ ٹوڈرمل جو اکبر اعظم کے وزیر مال تھے، اسی فرقہ سے تعلق رکھتے تھے۔ حیدرآباد کے مقبول عام ہندو وزیر مہاراجہ سرکشن پرشاد بہادر کا شجرۂ نسب بھی اسی خاندان تک پہنچتا ہے۔

گرونانک کے والد بزرگوار کا پیشہ کاشتکاری اور دوکانداری تھا۔ گرونانک ابھی چھوٹے ہی تھے کہ مذہبی کام انجام دینے کے لئے قدرت کی طرف سے انہیں بلاوا آیا۔ اس بلاوے کو ان کے باپ نے جنون یا دیوانگی سے تعبیر کیا۔ مردانہ نامی ایک مسلم گویے کو ساتھ لے کر گرونانک جہاں گرد راہب بن بیٹھے۔ گرونانک نے عوام کو یہ پیغام دیا کہ "نہ تو کوئی ہندو ہے اور نہ کوئی مسلمان"۔ جہاں جہاں وہ جاتے ذات پات کے بندھنوں کو توڑ دیتے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ ابراہیم لودھی کے ایک

مرے ہوئے ہاتھی کو انھوں نے زندہ کیا تھا۔ روایتوں سے پتہ چلتا ہے کہ ان کی تبلیغ کا سلسلہ لنکا تک پھیلا ہوا تھا، بلکہ وہ عربستان تک بھی گئے تھے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ ۱۵۲۶ء میں گرونانک کو بابر کے سامنے اس وقت پیش کیا گیا تھا، جب کہ وہ ابھی ہندوستان کا شہنشاہ نہ بنا تھا۔ گرونانک نے بابر کو نصیحت کی تھی کہ وہ "ٹھیک ٹھیک انصاف کرے۔ مفتوح قوم پر مہربان رہے۔ دل و جان سے صداقت کی روشنی میں خدا کی عبادت کرے"۔ گرونانک کے زہد و تقویٰ اور عجز و انکسار کی وجہ سے ان کے اطراف مریدین کا ایک گروہ پیدا ہو گیا، اور یہی گروہ سکھ کے نام سے موسوم کیا جانے لگا۔

غالباً ۱۵۳۳ء میں ان کا انتقال ہوا۔ ان کی میت پر ہندو مسلمانوں میں جھگڑا پیدا ہوا۔ اہل ہنود کہتے تھے کہ وہ انہیں جلائیں گے اور مسلمان انہیں دفن کرنے پر اصرار کرتے تھے۔ لیکن میت پر سے جب چادر اٹھائی گئی تو وہاں نعش کے بجائے پھولوں کا ایک ڈھیر پایا گیا۔

کثرت پرستی (کئی دیوتاؤں کا پوجنا) مورتی پوجا اور تیرتھوں کو جانا، ہندو مذہب کا عقیدہ تھا، اور اسلام میں یہ چیزیں جائز نہیں تھیں۔ سکھ مذہب نے ان دونوں عقیدوں میں ہم آہنگی پیدا کرنے کی کوشش کی۔ سکھ مذہب یا گرونانک کی تحریک ہندومت کی ایک اصلاحی تحریک تھی جس کا عقیدہ یہ تھا کہ خداوند تعالیٰ کی معرفت میں نجات مضمر ہے۔ جو "ہم سب کا پیدا کرنے والا ہے" اور خدا کی معرفت حاصل کرنے کے لئے مرشد یا گرو کا توسط ایک ضروری چیز ہے۔

یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ گرونانک کے بعد ان کا جانشین ان کا بیٹا نہیں ہوا

بلکہ انگد نامی ان کا چیلا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ شیر شاہ نے جب ہمایوں کو ہندوستان سے نکال باہر کیا تھا، تو ہمایوں نے انگد کی دعائیں لی تھیں۔ اکبر اعظم تیسرے گرو امرداس کی خدمت میں حاضر ہوا تھا۔ اکبر ننگے پاؤں ان کی خدمت میں حاضر ہوا تھا اور انہیں ایک جاگیر بھی نذر دی تھی، لیکن انھوں نے جاگیر کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔

چوتھے گرو رام داس (سنہ ۱۵۸۱ء تا سنہ ۱۵۷۴ء) نے اکبر سے کچھ اراضی حاصل کر لی تھیں، جس میں ایک کنڈ بھی شامل تھا۔ کنڈ کے وسط میں جو جزیرہ تھا، وہاں انھوں نے سنہرا گردوارہ بنانا شروع کیا۔ یہی مقام آج امرتسر، یا امرچشمہ کے نام سے مشہور ہے۔ اس گردوارے کی تکمیل ان کے بعد کے گرو ارجن جی (۱۵۸۱ء - ۱۶۰۶ء) کے ہاتھوں ہوئی۔

گرو نانک کے بھجنوں کا مجموعہ، آدی گرنتھ جو سکھ فرقے کی کتاب مقدس ہے، ۱۶۰۴ء میں پایۂ تکمیل کو پہنچی۔ اس مجموعہ میں ہندو اور مسلم، دونوں کے خدارسیدہ لوگوں کی مدحیہ نظمیں شامل ہیں۔ شاہ حسین اور بلّے شاہ، گرو ارجن جی کی خدمت میں رہا کرتے تھے۔ اکبر بذات خود بھی گرنتھ کی ان نظموں کو سننے کے لئے گرو ارجن جی کی خدمت میں حاضر ہوا کرتا تھا۔

نور جہاں چھٹے گرو، ہرگوبند (۱۶۰۶ء - ۱۶۴۵ء) کی بہت معتقد تھی۔ کئی مرتبہ ان کی خدمت میں حاضر ہوئی ہے۔ جہانگیر کا وزیر آصف خاں، ہرگوبند کا بے حد معتقد تھا۔ ساتویں گرو ہر رائے (۱۶۴۵ء - ۱۶۶۱ء) دارا شکوہ سے جا ملے تھے۔ ہری کشن (۱۶۶۱ء - ۱۶۶۵ء) اور تیغ بہادر (۱۶۶۵ء - ۱۶۷۵ء) آٹھویں اور نویں

گرو گزرے ہیں۔ تیغ بہادر کا ایک مقولہ یہ تھا کہ "ہمیں چاہئے کہ ہم اس (خدا) کا دھیان رکھیں۔ ہم اسی کی مرضی کے مطابق زندگی بسر کریں۔ اور اس کے کارناموں کو دیکھ کر مسرت حاصل کریں۔ یہ دیکھ کر کہ ہمارے محبوب کا دل ہماری تکلیفوں سے متاثر ہوتا ہے، اپنے بچاؤ کے لئے قبل از قبل کوئی منصوبہ تیار کرنا ہمارا کام نہیں۔ یہ کام خدا ہی کا ہے۔"

گرو گوبند سنگھ (۱۶۶۵ء-۱۷۰۸ء) دسویں اور آخری گرو ہیں شہنشاہ بہادر شاہ سے ان کے بڑے بے تکلفانہ مراسم تھے، اور اس کے ساتھ دکن بھی آئے تھے۔ دونوں گوداوری کے کنارے ناندیڑ کی بستی میں وارد ہوئے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ ناندیڑ کا قدیم نام ناؤنند ڈیرا یعنی "نو رشیوں کا گھر" تھا۔ جولائی، اگسٹ، سراون ۱۷۰۸ء کو گرو گوبند سنگھ ناندیڑ پہنچے تھے۔ ناندیڑ کی گوشہ نشینی انہیں بہت بھائی اور انھوں نے اس مقام کو اپنی مستقل رہائش گاہ بنالی۔ ندی کنارے ایک چھوٹی چٹان پر بیٹھے دعائیں کرتے یا مراقبہ میں منہمک رہتے۔ اس مقام کے قریب ایک بڑی عمارت ہے جہاں "گرنتھ صاحب" پڑھے جاتے ہیں۔ ناندیڑ میں ۱۴ ماہ دس روز رہنے کے بعد ۱۷۰۸ء میں گرو گوبند سنگھ کا انتقال ہوا۔

ناندیڑ کے گرودوارے کا نام ابچال نگر ہے، یہ ایک دو مینار والی بڑی گنبد ہے۔ جس کے اندرونی حصے میں چاروں طرف دیوار بنادی گئی ہے۔ اسکو ایسے فوجی ہتھیاروں سے سجایا گیا ہے، جس سے گرو جی کی عسکریت کا پہلو نمایاں ہوتا ہے۔

میکالف نے گرو گوبند سنگھ کے ایک بھجن کا حوالہ دیا ہے، جو یہ ہے:-

"مسجد، مندر، سب ایک ہیں۔ ہندوؤں کی پوجا پاٹ اور مسلمانوں کی عبادت، ایک ہی چیز ہے۔ تمام آدمی ایک ہی ہیں۔ لیکن غلطی کی وجہ سے وہ مختلف نظر آتے ہیں"

پورن سنگھ نے "دس بزرگان دین" کی کتاب میں گرونانک کے تحفوں کو جمع کر دیا ہے۔ یہ دس بزرگان دین کشف والہام کی جان ہیں۔ ان کی آواز، بدھا کے مانند اصلاح کی آواز ہے۔

ان کا مشن، روحانی بیماریوں کا علاج ہے۔ نانک کی نظم اس غیر محدود ہستی کی بے نظیر دعا ہے، جس کی طرف سے سب لوگ آتے ہیں اور جس کی طرف سب لوگ جاتے ہیں۔ جس طرح مچھلی سمندر کی حقیقت اور اس کی بے پایاں وسعت سے واقف نہیں ہوتی، میں بھی اے خدا تجھ کو نہیں جانتا، مگر میں تیری ہستی کو محسوس کرتا ہوں۔ میں تجھ ہی میں زندہ رہتا ہوں۔ جب میں تجھ سے جدا کر دیا جاتا ہوں تو مرجاتا ہوں۔"

مترجمہ:۔ مسٹر امجد علی

۱۵-اگست سنہ ۱۹۴۹ء

راج ترنگنی راجگان کشمیر کی نہایت قدیم تاریخ ہے۔ راجہ جے سنگھ والیٔ کشمیر کے عہد حکومت میں تصنیف ہوئی تھی۔ تاریخ ہند کے مستند ماخذات میں جن کتابوں کا شمار ہوتا ہے ان میں اس کو ایک نمایاں مقام حاصل ہے۔ مستشرقین مغرب کی رائے ہے کہ سنسکرت زبان کے تاریخی سرمایہ میں راج ترنگنی خاص اہمیت کی حامل ہے۔

راج ترنگنی کے مصنف کے حالات عام طور پر تاریخوں میں دستیاب نہیں ہوتے۔ سنسکرت کی قدیم تصنیفات سے اتنا پتہ ضرور چلتا ہے کہ اس کا مصنف کلھن نامی ایک شاعر تھا۔

راج ترنگنی اور اس کے تکملہ کے مطالعہ سے کلھن کے حالات پہ کچھ روشنی پڑتی ہے جن سے پایا جاتا ہے کہ کلھن اور اس کے آبا و اجداد کشمیر کے رہنے والے تھے جن کو دربار شاہی میں غیر معمولی رسوخ حاصل تھا۔

کلھن کے باپ کا نام چینپک تھا۔ جو راجہ ہرش (۱۰۸۹ء تا ۱۱۰۱ء) والیٔ کشمیر کا وزیر تھا۔ کلھن کے چند عزیز ملک کے ممتاز افراد میں شمار کئے جاتے تھے۔ چنانچہ خود کلھن کا چچا کنک بھی دربار شاہی میں تقرب رکھتا تھا اور راجہ کی اس پر نظر شفقت تھی۔ کنک علم موسیقی کا بڑا ماہر تھا۔ اور راجہ نے ایک موقع پر اسے طلائی

سکّے عطا کئے تھے۔

راج ترنگنی میں کلھن نے اپنے باپ کے متعلق لکھا ہے کہ جب ہرش کا قتل ہوا تو اس وقت میرا باپ راجہ کے اُن چند وفا داروں میں تھا جو جاں نثاری کے لئے ہمیشہ تیار رہتے تھے۔ راجہ کو بچانے میں میرے باپ کے آدمیوں نے بھی تیغ زنی کے خوب جوہر دکھائے تھے۔

راجہ ہرش کے قتل کے بعد کشمیر میں طوائف الملوکی کا بازار گرم ہو گیا۔ باجگزار انطاع خود مختار ہو گئے چونکہ کلھن اور اس کا خاندان ہرش کے ہوا خواہوں میں تھا۔ اسلئے فاتحین نے ان کے ساتھ مراعات نہیں کیں جس کے بعد کلہن کا خاندان گمنام ہو گیا۔

راج ترنگنی سنسکرت زبان کی نظم ہے اس میں ہند، و، دکن اور جنوب کے تقریباً اُن تمام راجہ اور مہاراجاؤں کا ذکر ہے۔ جو راجگان کشمیر کے باجگزار یا ہمعصر یا حملہ آور رہے تھے۔

کشمیر کی ابتدائی تاریخ دراصل موریا عہد سے شروع ہوتی ہے یہ خاندان صدیوں راجگان کشان کے زیر اثر رہا ہے اس کی مستند تاریخ کی ابتدا کرکوٹ خاندان کے وقت سے ہوئی ہے جس کی نشوو نما کا زمانہ ساتویں صدی عیسوی خیال کیا جاتا ہے۔ کلہن نے تاریخ کشمیر کی ابتدا راجہ گونند سے کی ہے۔ جس کی تخت نشینی کا زمانہ تین ہزار سال قبل مسیح قیاس کیا جاتا ہے۔ اس لحاظ سے راج ترنگنی چار ہزار دو سو پچاس برس کے واقعات کی منظوم تاریخ ہے۔ عہد قدیم اور ازمنۂ وسطیٰ کے حالات مصنف نے وضاحت کے ساتھ بیان کئے ہیں۔

جن کی صحت و عدم صحت سے متعلق اس موقع پر تبصرہ یا تنقید بے موقع ہے۔ تاہم
راج ترنگنی کا وہ حصہ جو مصنف کے زمانہ کا ہے معاصرانہ حیثیت سے بڑی اہمیت
رکھتا ہے۔

راج ترنگنی میں اکثر جگہ مسلمانوں کی فتوحات اور اُن کے داخلہ کا بھی ذکر
آیا ہے۔ جس کو کلہن نے نہایت راست بازی و دیانت داری کے ساتھ لکھا
ہے۔ سلطان محمود (۳۸۷ھ۔ ۴۲۱ھ) کا حملہ کشمیر جو ۴۰۶ھ مطابق ۱۰۱۵ء
میں ہوا تھا۔ راج ترنگنی میں اس کا بھی حال ہے۔ کلہن نے محمود کو ہیرا کے نام
سے یاد کیا ہے: "ہیرا" دراصل عربی لفظ امیر کی سنسکرت میں مسخ شدہ صورت ہے۔

ولسن (Wilson) اور اسٹین (M.A. Stien) نے راج ترنگنی
کے بارے میں لکھا ہے کہ یہ سنسکرت کی تمام کتابوں پر فوقیت رکھتی ہے۔ اور یہی
ایک ایسی کتاب ہے جو فن تاریخ کے لئے ایک حد تک مخصوص ہے۔ اسمتھ نے
اپنی تاریخ میں راج ترنگنی کا ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ اس میں کے بعض سوانحات
اور واقعات ایسے ہیں جن میں اکثر باتیں بے سروپا ہیں اور وہ احتیاط کے ساتھ
استعمال میں لائے جانے کے قابل ہیں۔

اس میں شبہ نہیں کہ کلہن بڑے مرتبہ کا شاعر تھا۔ شاعری اسکے لئے کچھ
باعث امتیاز نہیں تھی بلکہ وہ ایک اعلیٰ پایہ کا مورخ بھی تھا۔ اور اس کو اسلاف
کی تحریرات سے استفادہ کا خاص ملکہ تھا چنانچہ اس نے راج ترنگنی میں اس
کے ماخذات کی ایک طول و طویل فہرست درج کی ہے۔ وہ یہ ہے کہ سورت
نامی ایک شاعر کی نظم کو جو متقدمین کے کلام پر مشتمل تھی استفادہ کیا گیا۔

نیل مت پران سے جو عہد سابق کے گیارہ علما کی گیارہ مختلف تصانیف پر مبنی تھی
حالات اخذ کئے گئے۔ راج ترنگنی میں حسب ذیل تین مصنفین کا حوالہ پایا جاتا ہے
مثلاً کشمیندر مصنف نرپاولی کا جو راجگان قدیم کی تاریخ ہے کشمیندر کلھن سے
سو سال قبل گزرا ہے۔ یہ بھی کشمیر کا رہنے والا تھا راجہ کے دربار میں اس کو بھی
خاص تقرب حاصل تھا۔ برہت کتھا اس نے از سر نو تالیف کی تھی۔ اسکے علاوہ
بہت سی کتابیں اس نے لکھی تھیں، قدیم زمانے کے محققین و مصنفین میں اس کا
شمار کیا جاتا ہے۔

کلہن نے پدم چہرہ کی تاریخ کشمیر کا بھی راج ترنگنی میں حوالہ دیا ہے جن سے
آٹھ نام راج ترنگنی کے لئے انتخاب کئے گئے تھے۔ یہ ایک غیر معروف شخص تھا
اس کا حال کسی قدیم ہندو تصنیف میں نہیں ملتا۔ چھولاکر کا نام بھی کسی کتاب
میں پایا نہیں جاتا۔ چھولاکر نے اپنی کتاب کی بنیاد ہیلاراج کی پارتھوالی پر
رکھی تھی۔ کلہن نے چھولاکر کی کتاب سے راج ترنگنی میں چند نام اضافہ کئے تھے
ان ماخذات کے علاوہ راج ترنگنی میں سنگی کتبوں، اسناد اور قدیم سکوں سے
بھی مدد لی گئی تھی چنانچہ راج ترنگنی کے اکثر مقامات پر ماخذات کے ایسے حوالے
ملتے ہیں۔

کلہن نے راج ترنگنی کو آٹھ ابواب پر منقسم کرکے ہر باب کو "ترنگ" کے
نام سے موسوم کیا ہے۔ ترنگ اول میں مصنف کا دیباچہ اور قدیم راجاؤں کا
تذکرہ ہے جو حضرت عیسیٰ سے صدیوں پہلے گزرے تھے۔ ترنگ اول کا خاتمہ
یدہشٹر پر ہوا ہے جو بقول الفنسٹن حضرت عیسیٰ سے ایک ہزار چار سو پچاس

سال قبل حکمراں تھا۔ ترنگ دوم دو سو سال کے زمانہ پر حاوی ہے۔ ترنگ سوم پانچ سو نواسی سال کے واقعات پر مشتمل ہے۔ ترنگ چہارم دو سو چون سال کے حالات پر محیط ہے۔ ترنگ پنجم ایک طویل زمانہ پر پھیلی ہوئی ہے۔ اور اس کا آخری حصہ ولادت مسیح کے بعد کی صدیوں میں آگیا ہے۔ ترنگ ششم، ہفتم و ہشتم حضرت عیسیٰ کے بعد کے زمانہ سے تعلق رکھتی ہیں۔ ترنگ ہفتم کے ابتدائی حصہ میں سلطان محمود غزنوی کا تذکرہ ہے اور اس ترنگ کا خاتمہ راجہ ہرش کے قتل پر ہوا ہے۔ جو ۱۱۰۱ء میں واقع ہوا تھا۔ آٹھویں ترنگ کا زمانہ ۱۱۰۱ء سے ۱۱۵۰ء تک کا ہے۔

راج ترنگنی ایک نہایت اعلیٰ قسم کی نظم ہے جس کا شمار سنسکرت کے ادب عالیہ میں ہوتا ہے اس کا اسلوب بیان قدیم اور رامائن و مہابھارت کے طرز کا ہے اس نظم کا شاہکار حصہ وہ ہے جو ہرش کے واقعہ قتل سے متعلق ہے۔ چنانچہ کلہن نے لکھا ہے کہ :۔

جو کبھی راجہ ہانی کے نشہ میں چور تھا تقدیر کے جال میں پھنس گیا اور دو وقت خدا کو یاد کر کے زمین پر گر پڑا۔ یہ وہ تھا جس نے زمین کو کبھی پیر نہیں دکھائے تھے، ایسا محو خواب تھا جیسا ہرا بھرا درخت جڑ سے کاٹ دیا جاتا ہے۔ یہ راجہ بڑا اولوالعزم اور خاص شان والا تھا اور ایسے راجہ بہت کم دیکھنے میں آئے ہیں اس کی جو آرزو تھی کبھی بر نہ آئی۔ اور اس کا دامن ہمیشہ حزن و یاس سے لبریز رہا۔ جب یہ دنیا سے رخصت ہوا تو اس وقت اس کا سن ۴۲ سال ۸ ماہ تھا۔ اس کی پیدائش کا دن منگل تھا۔ اس وقت آسمان پہ برج سرطان تھا۔ زحل پانچویں

مشتری اور عطارد چھٹے زہرہ و شمس ساتویں اور قمر نویں خانے
میں تھے۔ سنگھنا کا مصنف لکھتا ہے کہ کورو اور دوسرے لوگ یا
اُس کے جانشین جو اِن کی علمداری کے زمانہ میں پیدا ہوئے کبھی
پھولے نہ پھلے۔ بلکہ آپ اپنے خاندان کی تباہی کا باعث ہوئے۔
چنانچہ یہ بھی انہی سیاروں کے دور میں پیدا ہوا تھا۔ اس لئے خود
آپ اور اپنے خاندان کی تباہی کا موجب بنا۔ جس وقت اس کا
سرتن سے جدا ہوا تو زمین کانپی اور آسمان چلّا اٹھا۔ گو اُس وقت
مطلع صاف تھا۔ فضا بھلی تھی۔ مگر اسی دم وہ مکدر ہوگئی آسمان
غمگیں ہوا۔ اور بادل جھوم جھوم کر آئے اور اس پر آہ وزاری
کرنے لگے"۔......

راج ترنگی کی مقبولیت کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ دنیا کی اکثر زبانوں میں
اس کے ترجمے ہوئے اور بعد کے مورخین نے بھی تکملے لکھے جن میں جونا راجہ اور سری
دارا پونیا بھاٹا کا تکملہ موجود ہے۔ جو کلہن کے تقریباً تین سو سال بعد ضبط تحریر
میں آیا تھا۔ سنہ ۱۸۳۵ئمیں اس کی اشاعت کلکتہ میں ہوئی ——— اے ٹرائر نے
(A. Troyer) اس کا ترجمہ فرنچ میں کیا تھا۔ جو پیرس میں شائع ہوا
اس کے حصے سنہ ۱۸۴۰ سے سنہ ۱۸۵۲ تک مسلسل چھپتے رہے۔ پہلے چھ باب کا خلاصہ
پروفیسر ولسن (Wilson) نے ایشیاٹک ریسرچ جرنل میں شائع کرایا۔
شہنشاہ اکبر نے جب کشمیر کو مسخر کیا تو اکبر کے حکم سے ملا شاہ محمد
شاہ آبادی نے ۹۹۸ھ میں راج ترنگنی کو فارسی کا جامہ پہنایا۔ ترجمہ بادشاہ کو

پسند نہیں آیا تو ملا عبدالقادر بدایونی کو حکم دیا گیا۔ ملا صاحب نے ۹۹۹ھ میں بادشاہ کے حکم سے اس کی نظر ثانی کی۔ ابوالفضل علامی نے آئین اکبری میں بھی راج ترنگنی کا خلاصہ درج کیا ہے۔ جہانگیر کے حکم سے حیدر ملک بن حسن ملک بن کمال الدین ملک نے ۱۰۳۰ھ میں کشمیر کی ایک تاریخ لکھی تھی اس میں اہل ہنود کی تاریخ راج ترنگنی سے اخذ کی گئی تھی۔ حیدر ملک کی تاریخ کشمیر شہنشاہ اکبر کی فتح کشمیر پر ختم ہوئی ہے۔ اس کا ترجمہ برنیر (Bernier) نے کیا تھا اس کا ذکر اس نے اپنے سفرنامہ میں کیا ہے۔ کشمیر کے ایک پنڈت نارائن کول عاجز نے راج ترنگنی کا ترجمہ سنسکرت زبان سے ۱۱۲۲ھ میں فارسی میں کیا تھا جس کا ایک مخطوطہ بوڈلین لائبریری میں موجود ہے۔ ان ترجموں اور خلاصوں کے علاوہ اسٹین (M.A. Stein) نے بھی راج ترنگنی کا مکمل ترجمہ انگریزی زبان میں کیا تھا یہ ترجمہ بہتر ہے۔ مترجم نے جو تعلیقات اضافہ کئے ہیں وہ خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ یہ ترجمہ ۱۹۰۰ء میں بمقام وسٹ منسٹر دو جلدوں میں شائع ہوا۔ ۱۹۱۲ء میں ٹھاکر چند شاہ کوری نے راج ترنگنی کو اردو میں منتقل کیا۔ اس کی بنیاد اسٹین کا انگریزی ترجمہ تھا۔ یہ اردو ترجمہ ۱۸۹۲ء میں دو جلدوں میں چھپا تھا۔ ہرگوپال خستہ نے گلدستہ کشمیر کے نام سے کشمیر کی جو اردو تاریخ ۱۸۷۷ء میں لکھی تھی وہ راج ترنگنی سے تمامتر ماخوذ ہے۔ ہرگوپال کا گلدستہ کشمیر ۱۸۸۳ء میں آریہ پریس لاہور میں چھپا تھا۔ جو تین حصوں پر منقسم ہے۔ پہلے حصہ میں کشمیر کا قدیم جغرافیہ۔ دوسرے میں تاریخ اور تیسرے میں نقشہ جات وغیرہ ہیں۔ بجے سنگھ کے عہد حکومت تک کے حالات راج ترنگنی سے اخذ کئے گئے ہیں۔ اس کے بعد کے واقعات حیدر ملک کی تصنیف کا خلاصہ ہیں۔

یہ کتاب ۱۸۷۷ء تک کشمیر کی مسلسل تاریخ ہے۔ جو بڑی محنت اور جانفشانی کے ساتھ تالیف کی گئی تھی۔ ان ترجموں کے سوا جگیش چندر دت نے جو رومیش چندر دت کے بھائی ہیں۔ راج ترنگنی کا انگریزی ترجمہ کیا جو کلکتہ میں طبع ہوا۔ اس سے کچھ پہلے کرپارام دیوان ریاست جموں و کشمیر نے ۱۸۷۰ء میں گلزار کشمیر کے نام سے کشمیر کی تاریخ لکھی تھی اس کا ابتدائی حصہ راج ترنگنی سے ماخوذ تھا۔

کلہن نے راج ترنگنی کے علاوہ اور بھی متعدد کتابیں لکھی تھیں منجملہ ان میں ایک کتاب نیل مت گرنتھ ہے جو ابھی تک کشمیر میں انتہائی ذوق و شوق کے ساتھ پڑھی جاتی ہے۔
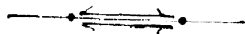
دی حیدرآباد کواپریٹیو ڈومینین بنک لمیٹڈ

قائم کردہ مارچ ۱۹۱۵ء

تار کا پتہ "ڈومن بنک"	صدر دفتر	ٹیلیفون ۲۶۱۰
سب آفس		شاخ
پتھرگٹی	شاہراہ عثمانی۔ حیدرآباد دکن	جڈچرلہ

ریاست حیدرآباد میں تحریک امداد باہمی کی سب سے بڑی بنک

منظورہ سرمایہ	۲۵،۰۰،۰۰۰ روپیہ	جاری کردہ سرمایہ	۱۰،۲۵،۰۰۰ روپیہ
وصول شدہ سرمایہ	۸،۳۹،۸۵۰ روپیہ	محفوظ و دیگر فنڈس	۱۰،۵۹،۴۷۸ روپیہ

جملہ کاروباری سرمایہ ۱ء۴ کروڑ روپیہ ہے

اراکین مجلس انتظامی (۳۰ / جون ۱۹۴۹ء)

صدر نشین: رائے بسکھ رام۔ بی اے۔ ایل ایل بی۔ بی سی اے (لندن) نائب صدر: رائے موہن لال

(دیگر نظماء)

..ین گپتا۔ بی ایس سی۔ ایچ سی ایس — رائے گرد داس۔ بی اے۔ ایل ایل بی

..ے ایچ وینکٹ راؤ۔ بی اے۔ بی ایل — محمد عباس۔ بی اے۔ ایل ایل بی

محمد عبدالسلام۔ بی اے۔ ایل ٹی — ہمایوں یار خاں۔ ایچ سی ایس۔ رجسٹرار انجمن ہائے امداد باہمی

رائے سمبو پرشاد۔ بی اے

یوم آزادی (۱۵/ اگست ۱۹۴۹ء) کو تنگبھدرا میں بھی اس بنک کی ایک شاخ کھولی گئی۔

آپ اپنے زیورات، ہیرے، جواہرات، دستاویزات وغیرہ صدر دفتر میں اطمینان کے ساتھ محفوظ کروا سکتے ہیں کیونکہ یہاں ایسی تجوریاں ہیں جن کو آگ اپنی لپیٹ میں لے سکتی ہے نہ ہی چوروں کے خطرناک ہاتھ اس پر پڑ سکتے ہیں۔

ہندو یونین کے تمام اہم تجارتی مراکز، میسور، ٹراونکور، کوچین اور حیدرآباد وغیرہ سارے مقامات کو ڈرافٹس اور بلیں بھیجے اور وصول کئے جاتے ہیں۔ بنک کاری کے تمام اقسام کا کاروبار کیا جاتا ہے۔

کے سندرا وردا چاری

معتمد جنرل منیجر

Aurangabad for your next HOLIDAY
BIBI-KA-MUQBARA
DAULATABAD FORT
(Only a few hours journey from Bombay)
YOU MUST VISIT
the World famous
frescoes and cave temples of
AJANTA and ELLORA
the BIBI-KA-MUQBARA and PANCHAKKI
at AURANGABAD
and the DAULATABAD FORT and RAOZA
all monuments of a magnificent past
and stay at the
STATE HOTEL - AURANGABAD
which is one of the leading hotels in India,
up-to-date in every respect and famous
amongst travellers for the excellence
of its cuisine and service.
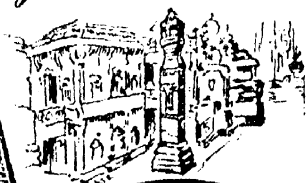
Contents

SIR MAHOMED USMAN, K. C. S. I., K. C. I. E.

I am very glad that HIND NAMA, a Commemoration Volume of the second Indian Independance Anniversary, is being issued. I wish it every success.

M Usman

AMINUL MULK SIR MIRZA M. ISMAIL, Kt., K. C. I. E.

I send my best wishes for the success of HIND NAMA which Mr. S. A. Qadri is bringing out in commemoration of the second anniversary of India's Independence.

Mr. Qadri has taken great pains to make the volume interesting and worthy of the occasion.

Mirza M. Ismail
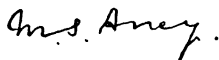
THE HON'BLE MR. HAREKRUSHNA MAHTAB, PREMIER, ORISSA.

The idea of celebrating the second anniversary of India's independence by publishing the proposed commemoration volume is a laudable one. I wish the attempt all success.

Hmahtab

HIS EXCELLENCY MR. M. S. ANEY, GOVERNOR, BIHAR

We will be completing the second year of our independence on coming August 15th. As the second birthday of Independence it is an occasion for rejoicing for all of us. But during the last two years we have been struggling through and against difficulties Although we may claim that we have now got the situation under complete control, our difficulties are not altogether over. The task before our leaders, in whose hands the destiny of the nation lies, is two-fold - to fight the dangers which are already there and to work for the economic and moral uplift of the people as a whole. Both these achievements can be possible only by the co-operation of the people with the Government. The Government can only make progress if peaceful conditions are maintained and complete co-operation is forthcoming from the people. I hope in the third year of our independence our energies will be mainly concentrated in creating this harmony, which is a condition precedent for the all-sided progress of the nation.

M. S. Aney.

Governor of Bihar

HIS EXCELLENCY SIR H. P. MODY, GOVERNOR OF THE UNITED PROVINCES.

I am glad to learn some of the prominent citizens of Hyderabad are bringing out a volume to commemorate the second Anniversary of India's Independence. The Fifteenth of August is a day on which history was made and will always be a day of rejoicing for all who live in this land. Even more, it should be regarded as an occasion on which every-one, whatever his station in life, must earnestly resolve to prove himself worthy of the Freedom that has been won. A heavy responsibility rests on us to build securely on the foundations which have been laid, and I hope we shall not fail.

H. P. Mody

Governor, United Provinces.

HIS EXCELLENCY MR. ASAF ALI, GOVERNOR, ORISSA.

It was hard to win freedom: but it is much harder to safeguard it against internal apathy or disruptive tendencies, and external developments. Centuries have been packed into the last two years. But centuries will be imperilled if early enough awakening to our perils does not unite the squabbling elements in a creative and co-operative effort to build up a lasting economic structure.

The Governor, BIHAR.

Governor's Camp, Bihar, 9th June 1949.

Dear Mr. Qadri,

Many thanks for your letter No. 17 dated Hyderabad 5th June 1949.

I am glad that you are bringing a profusely illustrated commemoration volume on the eve of the second anniversary of India's Independence. Your book will be widely read and appreciated if it comes up to the high standard aimed at by you. I wish you success in your patriotic literary enterprise.

I have forwarded your letter to the Chief Secretary of the Government of Bihar. You may hereafter correspond with him directly on any points you deem necessary.

With my regards,

Yours sincerely,

Governor of Bihar

Mr. Sayid Ahmedullah Qadri,
Compiler, Hind Nama,
Daily Insaf Office,
Hyderabad-(Dn.)
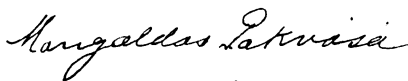
HIS EXCELLENCY MR. SRI PRAKASA,
GOVERNOR OF ASSAM.

I am glad to find that Hyderabad friends are issuing "HIND NAMA" in commemoration of the second anniversary of our INDEPENDENCE. I wish the venture all success. May it help to bring together all elements of our society in one bond of true brotherhood, so that all differences of caste, creed, race or province may be eliminated and we helped to stand as one people in the service of the country and the world.

Sri Prakasa

HIS EXCELLENCY MR. MANGALDAS PAKVASA,
GOVERNOR, CENTRAL PROVINCES AND BERAR

In commemorating the day of freedom for India the one thing which we should do is to offer our thanks to God for enabling us to acquire our freedom in a unique way without any bloodshed or sanguinary revolution. We should also pray to God to grant us sufficient wisdom and character and moral strength to enable us to preserve our freedom and allow us to grow step by step to such a height that we can furnish, as we did in the past, an example to the rest of the world in moral and spiritual grandeur. That can only be achieved by unity amongst the people and peace in the country and co-operation between all classes of the people. May we, therefore in looking forward to a great and united India strive for acquisition of those moral and spiritual qualities which will enable us to fulfil our dreams.

Mangaldas Pakvasa

MESSAGES

RASHTRAPATHI DR. PATTABHI SITARAMAYYA, PRESIDENT, ALL-INDIA CONGRESS COMMITTEE.

Year in and year out anniversaries of Independence are bound to be celeberated with eclat. Each commemoration volume must therefore naturally abound in learned discourses and careful studies relating to problems of Swaraj. I am sure, your publication will be of a piece with the rest, which the occasion will bring into existence and be in every way worthy of the high purpose lying behind and before it.

B. Pattabhi Sitaramayya

HON'BLE MR. B. G. KHER, PRIME MINISTER, BOMBAY.

The idea of celebrating the second anniversary of Indian Independence by preparing a HIND NAMA in Hyderabad is indeed a happy one. One of the first and perhaps the most important result of the attainment of Independence by India is the integration of all Indian territory and the promulgation of a homogeneous, democratic and orderly administration throughout the whole country. There were unfortunately people who believed that the people of Hyderabad did not desire to share in the evolution of this great national ideal. This theory has been falsified and exposed. Efforts like HIND NAMA set a seal of approval over the evolution of the renewed unity of India. I welcome it as a spontaneous expression of Hyderabad's Patriotism.

B. G. Kher

this book printed at the Osmania University Press or the Goverment Central Press, but unfortunately, the work could not be undertaken by either of these.

Finally, I would like to observe—not without a sense of pride—that His Majesty the King has graciously appreciated my efforts and the reply to the letter addressed to the Lord Chamberlain, has now been received from Buckingham Palace, and is couched in encouraging terms.

A good part of the world is now aware of the publication of the Hind Nama. Mr. Truman, M. Stalin, Mr. Attlee, Sir Stafford Cripps, Mr. Churchill, Earl Mountbatten, Mr. Thakin Nu and others have a knowledge of its publication.

In conclusion, I would like to thank again my old friend Mr. B. Ram Kishen Rao, under whose unremitting and sympathetic direction the entire work has been executed. I shall be failing in my duty if I did not mention Pandit G. Ramachari on this occasion as he has been a source of inspiration to me while I was compiling this volume.

S. A. QADRI,
Compiler.

in a satisfactory manner, but still, what has been accomplished, is not, perhaps, negligible. The valuable advice and sincere support of Mr. L. N. Gupta, Finance Secretary, Hyderabad Government, have contributed a great deal to the completion of this task. The paper on which the book is printed, was manufactured at the Sirpur Paper Mills, through Mr. Gupta's personal initiative and interest.

I am deeply grateful to Mr. Naqi Bilgrami, Secretary for Commerce and Industries, for the abundant facilities he provided for the publication of this volume.

My indebtedness to Mr. Binod U. Rao, Director of Public Information, is profound for his unfailing assistance, and the lively interest he took in the matter. Being himself a distinguished and conscientious journalist, he is aware of the extent and value of this publication. As a token of his appreciation of this work and of his discriminating taste, he has very strongly recommended to the Government the purchase of 500 copies of this volume. I also owe a debt of gratitude to Nawab Mehdi Nawaz Jung Bahadur. Mr. Janki Prasad, Deputy Director of Public Information, and Mr. Hamid Ali, Deputy Secretary, Commerce and Industries, for their suggestions, and to Prof. Nasir Ahmed Osmani and Prof. Fazle Haq for their assistance in translation.

My expenses on the publication of this volume run into thousands. The preparation of drawings and their blocks has cost a considerable amount. I am grateful, in this connection, to Dawn & Co., Secunderabad, for the preparation of nice blocks, and to Mr. Syed Abdul Wahab, Proprietor of the Azam Steam Press and its Managing Director, Mr. Veno-Gopal Pillai, for the expeditious printing of this volume within the short space of a week. I would like to express my gratitude also to the Management and Staff of the Pressarts Ltd., for the excellent printing of the title page, the illustrations and the English Section. I originally desired to get

prejudice and communalism but this is not an easy task confined to a village, a district or a city. It extends over the length and breadth of a growing state which consists of millions of villages, thousands of districts and hundreds of cities inhabited by millions of people. To strengthen the administration of such a vast state and to save it from political conflicts, is the touchstone of statesmanship. The protagonists of this great task are, as every one knows, Mr. C. Rajgopalachari, Pandit Jawaharlal Nehru, Sardar Vallabhai Patel, Maulana Abul Kalam Azad and Dr. Rajendra Prasad. And it is mainly for this reason that we are dedicating the 'Hind Nama' to these illustrious personalities.

Every sincere man is judged by the extent of his sincerity and a sincere man, in fact, is one who is a worshipper of liberty. Every true Indian will have a soft corner in his heart for whoever is an upholder of the freedom of India, a supporter of peace and of the concept of a secular state, a lover of humanity and an inveterate enemy of narrow-mindedness. A person possessing these qualities may rightly be regarded a true guardian of the country. Those who are, at present, controlling the destinies of the country are endowed with these virtues.

As long as India had not attained freedom every Indian toiled for its attainment. Now that India is free, it must be the wish of every Indian to preserve this freedom intact; and for the maintenance of peace it is essential to eschew all evil in individual or collective life. We can confidently say that the Indian Union is endeavouring to adhere to the principle which will strengthen its freedom from day to day.

It must be noted at the very outset that the idea of writing the 'Hind Nama' was first conceived by our distinguished leader and my esteemed friend, Mr. B. Ram Kishen Rao, and it was under his direction that I started my work. The shortness of time, coupled with the magnitude of this work made it difficult of accomplishment

INTRODUCTION

The fifteenth of August, 1947, is a memorable date in the history of Asian politics. It will be ever remembered in the annals of India as the date on which India won her liberty after centuries of foreign domination.

Freedom, 'eternal spirit of the chainless mind', has been the final goal of all the peoples of the world. India's freedom is not the freedom of a country but the freedom of a civilized and powerful nation the population of which, measured by millions, constitutes one fifth of the population of the whole globe.

It is an established fact that the reins of government of a democratic country are invariably in the hands of people who are farsighted, have the capacity for right thinking and possess great intellectual ability. India is no exception to this established principle. Its government is in the hands of people who are distinguished by remarkable wisdom and who have the good of their country at heart.

If India had won its liberty at the point of the sword millions of people would have lost their lives in the battle for freedom as a consequence of which she would have always cherished bitterness against her erstwhile rulers. But her leaders have, with remarkable statesmanship, retained the bond of friendship between the east and the west.

There is no doubt that after India became free, narrow-mindedness, prejudice and communalism were rampant in certain parts, waging war against humanity and democracy. Mahatma Gandhi sacrificed his life to exterminate this evil. The lovers of humanity and the upholders of freedom are engaged in fighting

Presented to

His Excellency
C. RAJAGOPALACHARIAR,
Governor General,

The Hon'ble
PANDIT JAWAHARLAL NEHRU,
Prime Minister,

The Hon'ble
SARDAR VALLABHBHAI PATEL,
Deputy Prime Minister,

The Hon'ble
MOULANA ABUL KALAM AZAD,
Education Minister, *and*

The Hon'ble
DR. RAJENDRA PRASAD,
Chairman, Constitutent Assembly.

Presentation Committee

SWAMY RAMANAND THIRTH,

MR. B. RAMKRISHNA RAO,

PANDIT G. RAMACHARI,

NAWAB HOSH YAR JUNG,

MOULVI ABUL HASSAN SYED ALI,

NAWAB MAHMOOD YAR JUNG,

MRS. PREMLATA GUPTA,

MRS. D. BARKAT RAI,

MR. JANARDHAN RAO DESAI,

MR. MIR AKBER ALI KHAN,

MR. M. NARSING RAO,

Dr. G. S. MELKOTE,

MRS. AMIR HASSAN,

MR. KASHINATH RAO VAIDYA

MR. MANZOOR AHMED KHAN

MR. DILDAR HUSSAIN,

MR. SAYYID AHMDULLA QADRI,

FOREWORD

The sacrifice of Ismail in Arabia in fulfilment of the divine decree, the 'Nouroze' celeberations of the Persians, the midnight revels at Christmas in the Christian world, and 'Ram Leela' in our own mother land, are landmarks in the history of these great peoples ineffaceable through the dim vistas of many centuries and are celeberated in various forms and at the specific times: some of these evoke feelings of sadness, while others are symbols of national jubilation.

At 'Ram Leela' all exult over the burning of Rawan, but the hardships endured by Sri Ramachanderjee in exile inculcate a profound religious lesson, and purify our character, while in the 'Janm Ashtmi' of Kishen Kanayya, imagination recaptures the spectacle of the war 'Mahabharatha' so much so that these historic realities are imbued with fresh life and form. Affection for sisters finds its intensified expression in the wreathing of wrists with 'rakhis', and through a resuscitation of the past, our national life asserts itself.

After the lapse of a thousand years, a renaissance has dawned on India. Along with her national memorials of the past, India has, to adorn her national pantheon, personalities like Shri Bal Gangadhar Tilak, Mr. Gokhale, and above all, Bapuji, who sacrificed his very life in the cause of India's freedom.

The 15th of August 1949 is a red-letter day in India's history the day which liberated India from the bondage of a foreign domination and liberated her leaders from the physical bondage of imprisonment. India will celeberate this historic day in various ways, but the people of Hyderabad are, on this auspicious occasion, presenting a literary monument to celeberate it a monument which reflects India in her myriad features, her manifold characteristics, lovers of freedom will look upon it with admiration, and will store it in their libraries.

We feel great pleasure and pride in presenting this literary offering to the great personalities who have built the edifice of India's freedom, and we conclude with the prayer that these five great men, Mr. C. Rajagopalachari, Governor-General of India, Pandit Jawaharlal Nehru, Prime Minister, Sardar Vallabhbhai Patel, Deputy Prime Minister, Moulana Abul Kalam Azad, Education Minister, and Dr. Rajendra Prasad, President of the Constituent Assembly, may continually promote the cause of India's freedom, and lead it from strength to strength, so that it may stand the test of time.

JAI HIND.

Hind Nama

A COMMEMORATION VOLUME
OF THE SECOND ANNIVERSARY
OF INDIAN INDEPENDENCE

15th August 1949

Compiler:

SAYYID AHMADULLAH QADRI

AUTHOR OF

ANTIQUITIES OF AURANGABAD, WARANGAL & BIDAR,
THE CRITIQUE OF QAMUS-UL-MASHAHIR
THE MEMOIRS OF CHAND BI-BI, AND
EDITOR "INSAF" DAILY

THE HIND NAMA

KACHIGUDA ★ HYDERABAD-DN.